دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

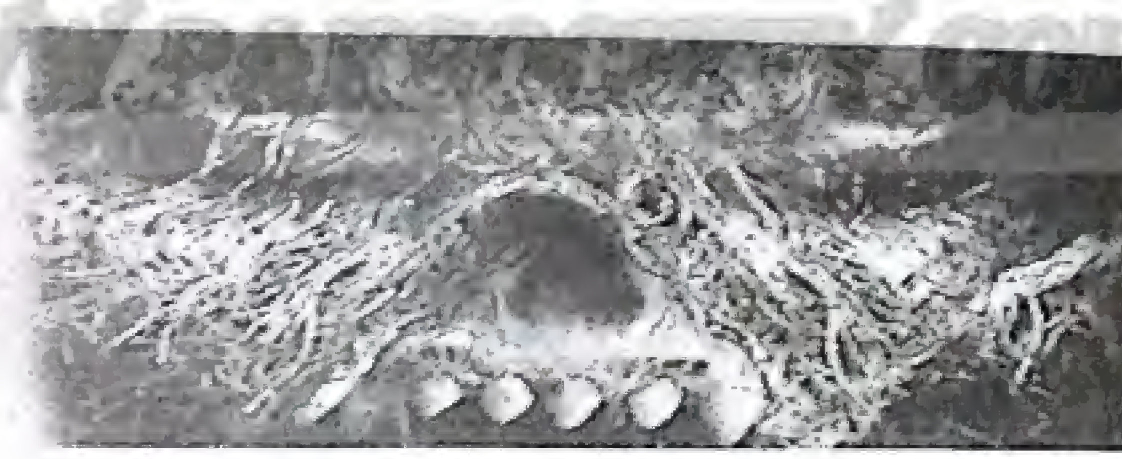
کراچی

سچی کہانیاں

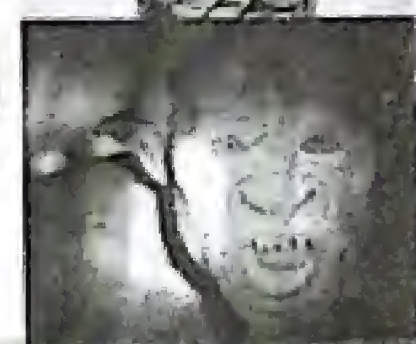
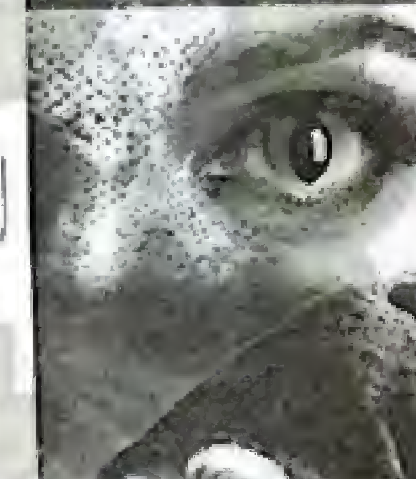
March

2015

پُراسرار قلم





پرنٹر: حسام محی الدین عابد ... کراچی



زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے ... قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



مبارک ہو

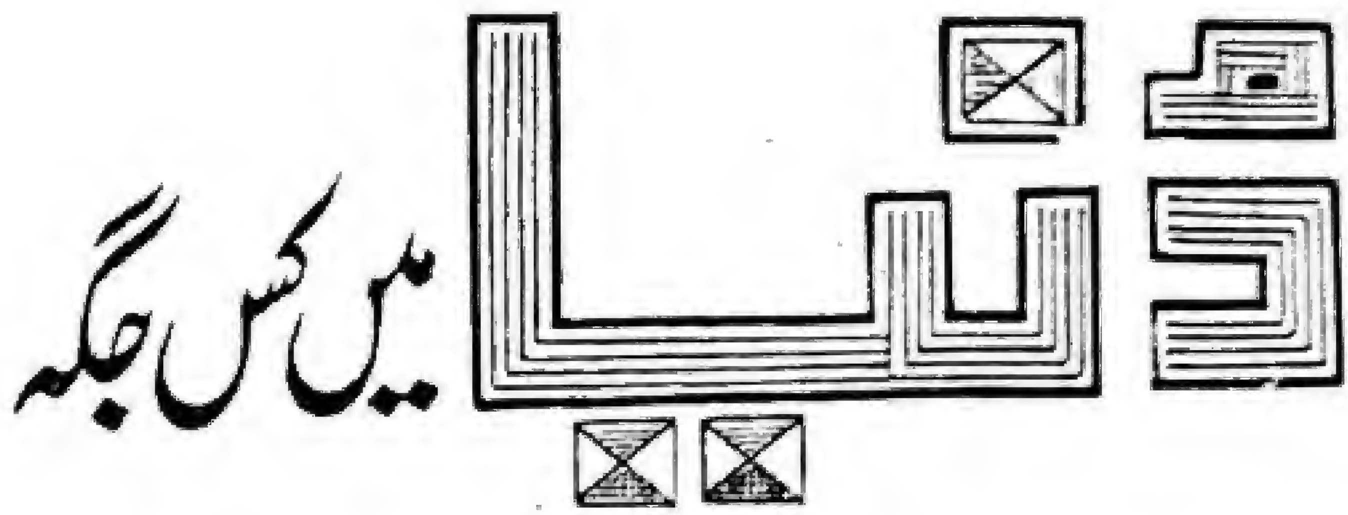
موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ حالانکہ دلوں میں خزاں کے ڈیرے ہیں مگر قدرت انسان سے اب بھی مایوس نہیں۔ دنیا میں آنے والا ہر بچہ اس بات کا گواہ ہے اور خزاں کے بعد آنے والی بہار اِس یقین پر مُہر ثبت کر دیتی ہے کہ ربّ العزت اپنی بنائی ہوئی زمین کو رنگ، خوشبو اور خوشیوں سے مزین ہی رکھنا چاہتا ہے۔ یہ دنیا بنانے والے رب کا فیصلہ ہے کہ خزاں کے بعد بہار آئے گی، مرجھائے ہوئے درخت تر و تازگی کے ساتھ ایک بار پھر تن کر فخر سے سر بلند ہوں گے، پھولوں سے لدی ڈالیاں جھوم جھوم کر زندگی اور خوشبو کا پیغام دیں گی۔ گھروں سے ننھی قلقاریوں کی آوازیں آئیں گی، زندگی اپنی پوری آب و تاب سے ایک بار پھر چمکے گی اور ہر بار چمکے گی۔

ہر دکھ کے بعد خوشی ہے، مایوسی سدا نہیں رہتی، غم فنا ہونے کے لیے ہے اور خوشی دائمی حقیقت ہے اور یہ اس دنیا کے بنانے والے کا فیصلہ ہے......

بم اور گولیاں انسان کو نہیں مارتے، انسان کو انسان مارتا ہے اور ہم انسانوں میں بہت سے ایسے ہیں جو مرنے سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کبھی زندہ تھے۔ قدرت سے لڑنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوا ہمیں بس یہ یاد رکھنا ہے کہ قدرت نام ہے خوشیوں، خوشبوؤں، محبت، احترام اور زندگی کا......

بے شمار دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ آپ سب کو ایک بار پھر موسم بہار مبارک ہو۔

منزہ سہام



سچّی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے قارئین!
آیئے...... مجھ سے ملیے! دسمبر 2013ء سے محبتوں کا جو سفر شروع کیا تھا۔ آج پورے سولہ ماہ ہو گئے۔ آپ کے اعتماد نے مجھے حوصلہ دیا اور آپ کی محبتوں نے میرے راستوں پر چراغ روشن کیے۔ مجھے کہہ لینے دیجیے...... ساتھیو! اِس بھرپور سفر میں آپ کا تعاون درکار ہے۔ ترقی ہمیشہ کچھ نئے کارانجام دلواتی ہے۔ یقین کیجیے میری زندگی کا ہر لمحہ سچی کہانیاں کی نذر ہو گیا ہے۔ مگر یہ سفر جمود کا شکار کیوں۔ ساتھیو! میری محنت میں چُوک ہو سکتی ہے مگر نیت پر شبہ نہ کیجیے گا۔
کچھ ساتھیوں کی شکایتیں، گلے شکوے، حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ جو بانگِ دہل کہہ رہے ہیں کہ ہم تب لکھیں گے، جب آپ نہیں ہوں گے......
پیارو! سجنو! مترو! میٹھوں! اِس بات کا جواب آپ دیں گے کہ اُن کو کیا جواب دیا جائے۔ اُن اشخاص کے نام اگلے ماہ شائع کر دیے جائیں گے۔ ایک کہانی مسترد ہونے پر اتنا ہنگامہ...... آخر کیوں؟؟ کیا ایسا کسی اور جگہ دیکھا یا سنا؟؟ اب فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ ایسے نام نہاد رائٹرز کا کیا کیا جائے......؟ چلیے احوال کا آغاز کراچی سے کنول عمران خان کے خط سے کرتے ہیں۔ کنول کچھ یوں عرض گزار ہیں۔ کیسے ہیں جی سب بہن بھائی بزرگ، سب کو سلام عرض ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بتاؤں کہ ہمارے گارڈن ایسٹ کے علاقے میں ڈائجسٹ بہت زیادہ دیر سے آتا ہے۔ جنوری کا شمارہ 10 تاریخ کو ملا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ بندہ کیا تبصرہ بھیجے۔ اس بار احوال میں کافی گرما گرمی رہی۔ کیونکہ غزالہ کرن کے خط کے جواب میں کافی گرما گرم تبصرے ہوئے۔ کچھ نے ان کی تنقید کی اور کچھ نے تعریف کی۔ کیا پتا غزالہ کرن نے کس کس کے دل کی ترجمانی

کی۔ مگر ایک بات میں کہوں گی، غزالہ کرن سے، کرن جی اس طرح کی باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ رسالہ ہمارا اپنا ہے اور سب اس میں گھر کے فرد کی طرح رہتے ہیں۔ کسی خونی رشتے کے بغیر سب مل کر رہتے ہیں تو اس طرح کے پیار بھرے خطابات اور القاب ایک دوسرے کو دینا یا ان سے نوازنا اچھا لگتا ہے۔ اس طرح کا طرز عمل میرے خیال میں اچھا نہیں۔ سدرہ تو بہت اچھی ہے، سب کو پیار کرتی ہے اور عزت کرتی ہے اور میرا نہیں خیال کہ اس طرح وہ کسی سستی شہرت کی طلبگار ہے یا چاپلوسی وغیرہ کرتی ہیں۔ یہ تو ان کے دل کا پیار ہے جو لفظوں کا رُوپ دھارتا ہے۔ آخر میں یہی کہوں گی۔ 'جیسی جس کی سوچ' مور شاہد بھائی اور اسامہ بھائی شکریہ مجھے یاد کرنے کا۔ اور احوال میں میرا خط پسند کرنے کا۔ چلیں جی اب کہانیوں کی طرف آتی ہوں۔ 'قسمت والے' اچھی تحریر تھی۔ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور 'تیرے انجام پر رونا آیا'، 'اتنا مجھے یقین ہے'، 'کیسا یہ میرا نصیب'، 'ظلم کا انجام'، 'کیا ملا محبت میں'، 'پسند نہیں آئی'، 'نیلے رنگ کا سوٹ' اور 'اکلوتی' بس ٹھیک تھیں عام سا موضوع اور عام سی تحریر۔ 'خطا میری تھی' ٹھیک تھی بس ابھی تک تو اتنی ہی کہانیاں پڑھی ہیں۔

☆ اچھی کنول! کاشی بھائی خود ہی دوبارہ آگئے (مگر گئے کہاں تھے؟؟) اس ماہ پرچہ آپ کو وقت پر ملے گا۔ کیسا لگا۔ تبصرہ جلد کرو نا، ہمیں انتظار ہے۔

✉ لڈن، ضلع وہاڑی سے، بہت محبت والے منشی محمد عزیز مئے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں، فروری کا شمارہ بڑی بے تابی کے بعد دو فروری کو ڈاک خانے سے ملا۔ سرورق پر کیا تبصرہ کریں۔ بس خوبصورت تھا۔ ویسے لب کچھ زیادہ ہی کھل گئے۔ نیم وا لب زیادہ خوبصورت لگتے ہیں اور ان کو...... منزہ باجی کا اداریہ استقبال بہت ہی زبردست رہا۔ مینا تاج صاحبہ کو نہ جانے مجھ سے کوئی پُرخاش تھی جو وہ میری کہانی کے مصنف کے طور پر الف، ب، ج لکھ گئیں۔ چلیے جی، خوش رہیں۔ احوال کا ابتدا پڑھ کر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ملکی حالات کے ساتھ ساتھ 'احوال' کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں لگتے۔ خدانخواستہ۔ آخر میں لکھا لفظ 'مدیر' کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہا ہے۔ صفدر علی حیدری صاحب خاصے گرم نظر آئے لیکن اُن کی شکایات بجا طور پر تھیں۔ ان کی شکایات کا ازالہ ہونا چاہیے۔ اُمّ جلال بخاری مختصر سا خط بھی بہت بھلا اور پیارا سا لگا۔ بہت اچھی بات کہی انہوں نے۔ مجید احمد جائی! خیریت! اتنی مختصر حاضری! بہت خوب عبدالعزیز جی آجی! آپ کا خط بار بار پڑھنے کی چیز ہے لیکن لگتا ہے کانٹ چھانٹ بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ سدرہ انور علی! میرا مشورہ ہے کہ غزالہ کرن کو آپ اپنی 'شاگردی' میں لے لیں۔ جاوید راہی بہت بڑے لکھاری ہیں۔ جبھی تو وہ ہماری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ عشرت بانو جیکب آباد! خصوصی طور پر جی آیاں نوں، آپ نے کیا خوب گزرا وقت یاد دلایا ہے۔ اب مستقل آتے رہنا، اچھا لگے گا۔ آپ کے علاقے سے رابعہ مخدوم، مینا مخدوم، فائزہ مخدوم اور محترمہ پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل اب نظر نہیں آتی ہیں، اُن کا کیا ہوا۔ شازیہ گل! اللہ آپ کے والدین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ یاسمین اقبال! اللہ تعالیٰ آپ کے بیٹے کو شفائے کاملہ اور عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ کے لخت جگر کے لیے خصوصی دعا کروا دی ہے۔ محترمہ دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کے لیے بڑا صدمہ ہے۔ ہم اُن کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ محترم بھائی ممتاز احمد کی قسمت والے، غزالہ عزیز کی 'تیرے انجام پہ رونا آیا' (ویسے میری ایک بیٹی کا نام بھی غزالہ عزیز ہے) اتنا مجھے یقین ہے عمران مظہر، کیسا یہ میرا نصیب، چمن اعوان، ظلم کا انجام عائشہ نور عاشا، کیا ملا محبت میں، ارم ناز اچھی تحریر تھیں۔ ملک عاشق حسین ساجد کی نیلے رنگ کا سوٹ اچھی تحریر تھی۔ ہے۔ مسز نوید ہاشمی کی اکلوتی بھی بہت سبق آموز تحریر تھی۔ شمع حفیظ کی تحریر 'کتیا' اپنے نام کے مطابق تھی۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ کتے کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ رانی بھی فطرتاً کتیا سے بھی بدتر نکلی۔ تحن آباد میں

نفیسہ فضل کی 'ماں کی تڑپ'، فریدہ جاوید فری کی غزل اور مقصود احمد بلوچ کی نظم پسند آئی۔

☆ منشی جی! ٹائٹل والی حسینہ نے سن لیا نا تو...... باقی کہانی پر نام سہواً آنے سے رہ گیا۔ امید ہے بدگمانی نہ رکھیں گے۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے کراچی سے فرح انیس صاحبہ کی۔ لکھتی ہیں، فروری کا شمارہ پہلی تاریخ کو منگوالیا تھا۔ انتظار مشکل تھا۔ شمارے میں اپنا نام دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ اپنی تحریر اور نظم دیکھ کر اچھا لگا۔ دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کی والدہ کی اللہ مغفرت فرمائے۔ مارچ کا شمارہ پُراسرار نمبر ہوگا، پڑھ کر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پُراسرار نمبر میرا ہمیشہ سے فیورٹ رہا ہے اور اس کا انتظار میں ہمیشہ بے صبری سے کرتی ہوں۔ مسز نوید ہاشمی کی تحریر اکلوتی میں واقعی ٹھیک بتایا ہے کہ انسان بعض دفعہ حسد میں اپنے خونی رشتوں کا ہی دشمن ہوجاتا ہے۔ ملک عاشق حسین ساجد کی تحریر 'نیلے رنگ کا سوٹ' بہتر تھی۔ غزالہ عزیز اور ارم ناز کی تحریر بھی اچھی تھی، باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔

☆ فرح جی! اچھی تحریر اپنی جگہ خود بنا لیتی ہے۔ کہانی بھیجنے میں آپ لیٹ ہوگئیں۔ انشاء اللہ آئندہ وقت پر بھیجیں گی تو شاملِ اشاعت ہوگی۔

✉ ممتاز احمد، سرگودھا سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں، شمارہ اس بار بھی لیٹ ملا۔ ٹائٹل اور اشتہارات کی ورق گردانی کے بعد آگے بڑھا تو اداریے میں منزہ سہام نے 'استقبال' میں پورے اٹھارہ کروڑ عوام کے جذبات کی خوبصورت ترجمانی کی۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی چوہان نے حق اور سچ کہا، احساس سے بڑا کوئی جذبہ نہیں، احوال حسبِ معمول اور حسبِ سابق احوالیوں کے خوبصورت الفاظ اور سچے جذبوں سے چمک دمک رہا تھا۔ سب نے بہت شاندار لکھا۔ لاڑکانہ کی نازیہ خانم کا مختصر تبصرہ اچھا تھا۔ یاسمین اقبال دعا ہے کہ اللہ کریم آپ کے بیٹے کو صحت نصیب فرمائے۔ آمین۔ راولپنڈی کی کرن شہزادی کو احوال میں خوش آمدید، ویلکم۔ پیارے بھائی فیصل ندیم بھٹی اور مور شاہد حسین۔ اللہ کا شکر ہے آپ کی دعا سے ٹھیک ہوں۔ بھائی عبدالمجید جائی آپ کا اندازِ گفتگو بہت اچھا لگا۔ بھائی منشی عبدالعزیز مئے آپ بھی اچھی باتیں کرتے ہیں، باقی گفتگو کا سلیقہ محترم القام بھائی عبدالعزیز جی آصاحب کو خوب آتا ہے۔ دل موہ لیتے ہیں۔ شمارہ لیٹ ملنے کی وجہ سے پورا نہیں پڑھ سکا۔ عمران مظہر کی 'اتنا مجھے یقین ہے'، چمن اعوان کی 'کیسا یہ میرا نصیب'، عائشہ نور عاشا کی 'ظلم کا انجام'، ارم ناز کی 'کیا ملا محبت میں' بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ فرخ انیس کی 'روایات کے قیدی' پسند آئی۔ مسز نوید ہاشمی کی 'اکلوتی' بہترین کہانی تھی۔ 'خطا میری ہے' بہت زبردست عمدہ کہانی تھی۔ حنا کنول کی وہ اِک ستارہ مہربان' لاجواب کہانی تھی۔ روبینہ شاہین نے 'ادھورا پن' کے عنوان سے شاندار کہانی لکھی۔ عائشہ سلیم گابا کی 'گدھ' نے دُکھی کردیا۔ جاوید راہی اس بار بھی چھائے رہے۔ کاشی بھائی پلیز اب ناگن کو پٹاری میں بند کردیں، اب شکنتلا کو مزید پڑھنا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ نیلے رنگ کا سوٹ، بھوکا پیٹ اور دھوپ چھاؤں بلاشبہ زبردست کہانیاں تھیں۔ اب اس سے پہلے کہ قینچی چلنی شروع ہوجائے خط کا اختتام کرتا ہوں۔ اگلے ماہ حاضری ہوگی، اگر زندگی نے وفا کی تو......

☆ بھائی جی! انشاء اللہ آپ کی حاضری سو سال تک ہوگی۔ زندگی اچھے اعمال کی وجہ سے وفا کرتی ہے اور آپ تو سچ مچ بہت اچھے ہو۔

✉ شازیہ گل ضلع مانسہرہ گاؤں بھیر کنڈ محلہ سواتیاں سے کچھ اس طرح شریکِ احوال ہیں۔ اس بار اپنا من پسند شمارہ سچی کہانیاں 3 تاریخ کو ملا۔ سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے احوال پڑھنا شروع کیا۔ سب کے

خطوط بہت اچھے لگے۔ میں شکر گزار ہوں اُن سب قارئین کی جنہوں نے میری شاعری اور کہانی کو پسند کیا، فیصل ندیم بھٹی، محمد رضوان قیوم، شاہد رفیق سہو، محمد عمر گولہ لہڑی، ساحرہ ناز خانیوال آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔ کراچی سے اسامہ ندیم بھائی کا تبصرہ بہت اچھا لگا آپ نے میری کہانی کے بارے میں جو کہا کچھ سمجھ نہیں آئی، تعریف کی یا طنز مگر اُس کے لیے اتنا کہوں گی کہ

اچھا ہوا کہ راہ میں ٹھوکر لگی ہمیں ☆ ہم گر گئے تو سارا زمانہ سنبھل گیا

اب آتے ہیں جی تبصرے پر تو منزہ آنٹی نے جو کچھ استقبال میں لکھا بہت خوب لکھا، کچھ اپنی باتیں میں ہمیشہ کی طرح کاشی بھائی نے بہت خوبصورت لکھا۔ احوال میں سب کے خطوط بہت اچھے لگے۔ ممتاز احمد صاحب کی پہلی سچ بیانی قسمت والے، غزالہ عزیز تیرے انجام پہ رونا آیا، عمران مظہر اتنا مجھے یقین ہے، چمن اعوان کیسا یہ میرا نصیب، عائشہ نور عاشا، ظلم کا انجام، ارم ناز کیا ملا محبت میں، ملک عاشق حسین ساجد نیلے رنگ کا سوٹ، فرح انیس روایات کے قیدی، مسز نوید ہاشمی اکلوتی، خطا میری ہے، حنا کنول وہ اک ستارہ مہرباں، روبینہ شاہین ادھورا پن، ارشد علی اسیر محبت، شمع حفیظ کی کتیا، نبیلہ نازش راؤ بھوکا پیٹ، عائشہ سلیم گاباگدھ، جاوید راہی آخری معرکہ، ڈاکٹر ایم صغیر احمد دھوپ چھاؤں، محمد شعیب مجبور تنہائی سی تنہائی ہے، بشریٰ خان اے کاش، بشریٰ رحمن جوگی اور تحسین انجم انصاری کی چیونٹی سب بے مثال اور خوبصورت کہانیاں لگیں۔ ذخیرہ ادب سے احمد ندیم قاسمی کی کہانی بندگی بے چارگی بہت خوب لگی۔ ہم شکل اور نا گن اپنے اپنے انداز سے آگے بڑھ رہے ہیں، سخن آباد میں اس بار بھی سب کی شاعری پسند آئی۔ اچھا تبصرہ بہت لمبا ہو گیا ہے، کوئی غلطی ہو تو معذرت اب اجازت دیجیے۔

☆ شازیہ جی! آپ کے تبصرے میں نکھار آ گیا ہے۔ احوال میں حاضری مستقل بنائیے۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے عادل حسین کی۔ لکھتے ہیں، کچھ مہینوں کی غیر حاضری کے بعد پھر سے احوال میں شرکت کر رہا ہوں۔ وجہ اپنی اور چھوٹی بہن کی شادی کی مصروفیات جو کہ بالترتیب 30 اور 31 دسمبر کو اللہ پاک کے کرم سے خوش اسلوبی سے انجام پائیں۔ فروری کا پرچہ کہانیاں ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھا۔ منزہ سہام جی کا استقبال خوب تھا۔ آپ کی اپنی باتیں ہمیشہ منفرد ہوتی ہیں۔ اس بار بھی خوبصورت! کاشی آپ کے ناول کا ہمیں بھی انتظار ہے۔ احوال میں شامل ہوئے تو مزا آ گیا۔ احوال کی محفل مزید خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ جہاں پرانے لکھنے والے اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں، وہیں نئے لکھنے والے بھی اپنی آمد کا اعلان بھرپور انداز میں کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ اس محفل کو ہمیشہ یونہی آباد رکھے۔ پہلی سچ بیانی ممتاز احمد صاحب کی قسمت والے عاشقِ رسول کی خوبصورت داستان۔ دوسری سچ بیانی ایک ناکام عاشق کی داستان، تیسری سچ بیانی عمران مظہر صاحب کی تھی جو کہ دو دوستوں کی زندگی کا احاطہ کرتی تھی، اچھی لکھی گئی۔ چوتھی سچ بیانی چمن اعوان کی ایک عبرت ناک کہانی تھی۔ بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے سوچنے کا موقع۔ ظلم کا انجام عائشہ نور عاشا کی تحریر۔ جسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ لوگ اپنی جھوٹی خوشیوں کے لیے کس حد تک گر سکتے ہیں۔ مگر انجام وہی مقدر ہوتا ہے جو اس کہانی میں ہوا۔ کچی عمروں کی محبتوں کا انجام ارم ناز کی کہانی جیسا ہی ہوتا ہے۔ نیلے رنگ کا سوٹ ملک عاشق حسین ساجد صاحب کی خوبصورت سچ بیانی، بے شک اللہ ہماری چھوٹی سی نیکی کو بھی ہماری جان بخشی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ فرح انیس صاحبہ کی سچ بیانی بھی اچھی تھی۔ حقیقت کی جیتی جاگتی تصویر۔ میری بہن مسز نوید ہاشمی نے بھی اکلوتی کی صورت ایک اچھا درس دیا ہے۔ دسویں سچ بیانی میں خطا سلیم ہی کی تھی۔ لیکن کچھ قصور بڑوں کے کیے گئے۔ بچپن کے رشتوں کا بھی تھا جو کہ اکثر اوقات اولادوں کے لیے نقصان دہ

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ثابت ہوتے ہیں۔ شعلہ ساماں تحریروں میں 'کُتیا' شمع حفیظ صاحبہ کی بہترین تحریر۔ زبردست۔ دوسری تحریر بھوکا پیٹ، نبیلہ نازش راؤ کی تھی جو کہ واقعی شعلہ تھی۔ لاجواب۔ تیسری تحریر گدھ، عائشہ سلیم گابا کی تھی۔ جو کہ معاشرے میں موجود درندوں کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ جاوید راہی صاحب ہمیشہ ہی جرم کی دنیا سے زبردست کہانیاں لاتے ہیں۔ یہ راہی صاحب کا خاصہ ہے۔ تین مرد تین کہانیاں میں دھوپ چھاؤں ڈاکٹر ایم صغیر احمد صاحب کی تحریر جاگیردارانہ نظام میں پیدا ہونے والی ایک حقیقت۔ نائس۔ تنہائی سی تنہائی ہے، محمد شعیب مجبور صاحب کی تحریر۔ جو کہ محبت کے درد میں ڈوبے انسان کی کھتا۔ بس سرسری۔ بشریٰ خان کی اے کاش! ایک اچھا درس دے رہی تھی اور لوگوں کی بے حسی کا ماتم بھی کر رہی تھی۔ نائس۔ ذخیرۂ ادب سے دونوں تحریریں زبردست تھیں۔ پڑھ کر مزا آ گیا۔ ناول پچھلی قسطیں چھوٹ جانے کے سبب پڑھا نہیں کہ پہلے پچھلی قسطیں پڑھی جائیں۔ اس بار محمود شام صاحب کا سفرنامہ بھی پڑھنے کو ملا۔ مسئلہ یہ ہے سے لوگوں کو بہت فائدے ہیں۔ اللہ سب کے مسائل حل فرمائیں۔ سخن آباد بھی اچھا چل رہا ہے۔ چیونٹی واقعی خاص کہانی ہے تحسین انجم انصاری کی۔ ویلڈن۔ ڈائجسٹ کے بیچ بیچ میں کچھ غزلیں نظمیں بھی پڑھنے کو ملیں جو کہ اچھی لگیں۔ آخر میں بس اتنا ہی کہ سچی کہانیاں پڑھ کر لوگ اچھے بُرے کی تمیز کر سکتے ہیں۔ یہ کسی استاد کی طرح ہے۔ جو ہمیشہ اچھی بات ہی سکھاتا ہے۔

☆ عادل حسنین! تمہاری محبت ہمارا انعام ہے۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار رہا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ ایک بار پھر ہماری طرف سے شادی کی مبارک باد قبول کرو۔

✉ سرگودھا سے یہ آمد ہے عظمیٰ شکور صاحبہ کی۔ لکھتی ہیں، آپ سب کی بے پناہ محبتوں، چاہتوں کی میں ممنون ہوں۔ بہت اچھا لگتا ہے جب احوال کے ساتھی مجھے یاد رکھتے ہیں۔ آپ سب میرے بہت اپنے ہو۔ اللہ آپ سب کو سلامت رکھے اور یہ محبتوں کا گلستان سجا رہے، آمین۔ اب آتے ہیں اپنے رسالے کی طرف۔ ہمیشہ کی طرح اپنے حسین رنگوں میں مسکراتا سچی کہانیاں ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ منزہ سہام کی باتیں اُن کے احساسات پڑھنے کو ملے۔ کاشی چوہان صاحب حد کرتے ہیں ویسے آپ۔ مطلب اتنی پیاری باتیں، اتنے زبردست خیالات اُف ماریں گے کیا۔ آپ کی باتیں دل کی گہرائیوں میں اُتر گئیں۔ سدرہ چندا میں ٹھیک ہوں۔ آپ سناؤ؟ منشی محمد عزیز صاحب جنوری کے شمارے میں جو سچی کہانی شائع ہوئی ہے نا وہ میرے ابو جان کی زندگی کی کہانی ہے۔ آئی سمجھ آپ کو۔ آئندہ احتیاط سے بات کریں۔ سو تھینکس اسامہ ندیم صاحب۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے "تیرے انجام پہ رونا آیا" غزالہ عزیز صاحب کی تحریر میں ہیرو صاحب کو جانے کتنی محبتیں ہوئیں۔ میں نے تو سنا ہے محبت بس ایک بار ہوتی ہے۔ خیر! 'اتنا مجھے یقیں ہے' عمران مظہر صاحب، رُلا ہی ڈالا قسم سے، کس طرح شیطان انسان پہ مسلط ہو جاتا ہے، خوب بیان کیا۔ 'کیسا میرا نصیب' چمن اعوان کے قلم کی نوک سے آزاد ہونے والے لفظ متاثر کن تھے کہ کیسے معصوم لڑکیاں چالاک مردوں کی عیاری کا نشانہ بنتی ہیں۔ 'ظلم کا انجام' عائشہ نور عاشا کی لکھی تحریر، اچھی تھی، 'ادھورا پن' روبینہ شاہین قسم سے بہت دکھ ہوا 'بابر' کے بارے میں پڑھ کر۔ کتنا بے بس ہے انسان مگر کتنا کارآمد۔ ارشد علی کی 'اسیرِ محبت' اُف متاثر کن کیفیات سے آگے نکلتی محسوس ہوئی، دل ہلا دیا۔ اچھا جی تو میں چلتی ہوں۔ میری چائے انتظار کر رہی ہے جو کہ اب ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا۔

☆ عظمیٰ جی! ہم بھی ٹھنڈی ہی چائے پیتے ہیں۔ شیئر نہیں کریں گی کیا۔ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ قسم سے۔

✉ چشتیاں سے علی حسنین تابش لکھتے ہیں۔ کچھ مصروفیات کی وجہ سے احوال میں شریک نہ ہو سکا اس

کے لیے معذرت۔ ماہ جنوری 2015ء میں میری کہانی شائع کر کے آپ نے مجھے شکریہ کا موقع دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ ماہ فروری 2015ء کا 'سچی کہانیاں' 02 فروری کو موصول ہوا۔ سرورق خوبصورت تھا۔ منزہ سہام جی کا 'استقبال'، کاشی بھائی کی 'کچھ اپنی باتیں' اور احوال کا جائزہ بھی لیا۔ باقی پرچہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ سدرہ انور علی، فیصل ندیم بھٹی، زیب ملک، اسامہ ندیم اور مظہر شہزاد آپ سب کا بہت شکریہ کہ آپ نے میری اسٹوری 'ادھوری محبت' کو پسند کیا۔ اس بار پرچے کا انداز بے حد خوبصورت لگا۔ 'سچی کہانیاں' میرا فیورٹ پرچہ ہے۔ اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ 'سچی کہانیاں' دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین) اور احوال کی محفل یونہی سجی رہے۔

☆ پیارے تابش! اچھی کہانی لکھو خود بخود تحریر شائع ہونے کا تحفہ ملتا رہے گا۔ محفل میں غیر حاضری کیوں؟

✉ کبیر والا سے شاہد رفیق سہو مختصر تبصرے کے ساتھ احوال کا حصہ ہیں۔ لکھتے ہیں، ماہ فروری کا شمارہ ملا۔ بہت ہی اچھا ٹائٹل تھا۔ کہانیوں میں 'نیلے رنگ کا سوٹ' ملک عاشق حسین ساجد 'اے کاش' بشریٰ خان 'بھوکا پیٹ' نبیلہ نازش راؤ ان کی اسٹوریز بہت پسند آئیں۔ 'اکلوتی' مسز نوید ہاشمی بہت اچھی اسٹوری تھی۔ سخن آباد میں بابر علی ساہیوال، مقصود احمد بلوچ کی غزل بہت پسند آئی۔ احوال میں مقصود احمد بلوچ، منشی محمد مے، سدرہ انور علی، مجید احمد جائی ان کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ اب اجازت چاہوں گا۔

☆ شاہد رفیق! تبصرہ مختصر کیوں کرتے ہو۔ اسی تبصرے کو ڈبل کر دینا اگلے ماہ۔ اور انشاء اللہ کہانیوں کے بارے میں جلد بتا دیا جائے گا۔

✉ عبدالعزیز جی آ چکوال سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں، جب بدن کی مٹی بُھر بُھری ہونے لگے، آنکھوں میں موتیا اور سر میں چاندی اُترنے لگے، منہ میں دانتوں کی تعداد گھٹنے اور توند بڑھنے لگے، سماعتوں پر بہرے پن کے ڈرون گرنے لگیں، اُٹھتے بیٹھتے ہونٹ اُف، اُوئی، ہائے، کی تسبیح کرنے لگیں، چلتے پھرتے گِٹے گوڈوں (ٹخنے گھٹنے) سے صورِ اسرافیل جیسی آوازیں پھوٹنے لگیں تو اس بڑھاپے اور سیاپے میں پہنچ کر بھی بندہ جھوٹ بولنا ترک نہ کرے۔ کسی کی صحت مند اور جاندار تحریروں کو حسد کی نگاہ سے دیکھے اور اُس کی ذاتِ بے ثبات کو تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنائے اور کردار کشی پہ اُتر آئے تو آپ ہی بتائیں قارئین ایسے ادبی پنڈت کی کیا سزا ہے۔ فروری کا شمارہ 2 کی شام کو ملا۔ احوال میں اپنے خط کا حشر دیکھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ 'خدارا اچھا سوچیں اور ہمیشہ اچھے کے لیے ہی قدم اٹھائیں۔

کاشی بھیا!

قاتل کو ذرا قتل کے آداب سکھاؤ ☆ دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

کہانی ففٹی پرسنٹ مکمل ہو چکی ہے اگر 27 جنوری کی ٹھیرالوومبح فرزندِ ارجمند احد عزیز کا ایکسیڈنٹ نہ ہو جاتا تو حسبِ وعدہ کہانی 31 جنوری ادارے کو رجسٹری کر دینا تھی۔ اللہ سب کے بچوں کی حفاظت فرمائے، نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت نامہ بند کرتا ہوں ہر یاد کرنے والے کو سلام۔

☆ اچھے جی آ جی! اُحد کے ایکسیڈنٹ کا پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ خدا جلد اُسے اچھا کرے۔ باقی ففٹی پرسنٹ لکھی کہانی کو جلد ہنڈرڈ پرسنٹ کر کے روانہ کر دیں۔

✉ ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ سے رقم طراز ہیں۔ فروری 2015ء کا 'سچی کہانیاں' 2 فروری کو ملا، سرورق اچھا تھا۔ منزہ سہام کا استقبال پڑھا دل چھلنی ہو گیا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح نس نس سمانے والی باتیں دل کو مسحور کر رہی تھیں۔ مینا تاج جی یہ کیا، فروری کا شمارہ ہمارے ہاتھ میں پکڑا کر اپنا نام

لکھنا بھول گئیں، وہ کیوں جی، ذرا یہ تو بتائیں۔ (وہ بہت کچھ بھول گئیں اس لیے آرام کر رہی ہیں) احوال کی محفل خوب لگی ہوئی تھی۔ اُمِ جلال بخاری کے احوال میں پڑھا کہ تنقید تو بالکل بھی مجھے نہیں آتی یہ پڑھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ آپ کے نام کے ساتھ اگر کوئی آپ کے شہر یا گاؤں کا نام لکھ دے پھر تو اس بندے کی خیر نہیں۔ آپ تو کپڑے دھونے والا ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہیں۔ مور شاہد حسین قمر، شائستہ جمال، سدرہ انور، ممتاز احمد، فیصل ندیم بھٹی، عبدالغفار عابد، فریدہ فری، شاہد رفیق سہو، شازیہ گل، مقصود احمد بلوچ، اسامہ ندیم، ساحرہ ناز، ان سب کا بہت بہت شکریہ جنہوں نے میری اسٹوری گناہوں کی دلدل کو پسند کیا اور احوال میں میرا ذکر کیا۔ ممتاز احمد کی قسمت والے، غزالہ عزیز کی تیرے انجام پہ رونا آیا، عمران مظہر کی اتنا مجھے یقین ہے، عائشہ نور کی ظلم کا انجام، ارم ناز کی کیا ملامحیت میں، ملک عاشق حسین ساجد کی نیلے رنگ کا سوٹ، فرح انیس کی روایات کے قیدی، مسز نوید ہاشمی کی اکلوتی، خطا میری ہے، حنا اکنول کی وہ اک ستارہ مہربان، روبینہ شاہین کی ادھورا پن، ارشد علی کی تحریر اسیرِ محبت تمام ہی زبردست رہیں۔ شمع حفیظ کی شعلہ تحریر کُتیا، رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر تھی۔ عائشہ سلیم کا تیسرا شعلہ گدھ حامد انکل جیسے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ جاوید راہی کا آخری معرکہ بہت زبردست تھا۔ تین مرد تین کہانیاں میں ڈاکٹر صغیر احمد کی کہانی دھوپ چھاؤں، ظالم حکمرانوں والا لہجہ اختیار کیے ہوئے تھی۔ بشریٰ خان کی تیسری مرد کہانی اے کاش ان ڈرائیوروں کے نام ایک پیغام ہے جو بہت تیز گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن کی ذخیرہ ادب سے دوسری بے مثل کہانی جوگی لاجواب تھی۔ بابا جی خلقِ خدا کی خوب بھلائی کر رہے ہیں۔ (امید ہے بابا جی کے ٹرسٹ میں آپ کا تعاون بھی شامل رہے گا) سخن آباد کی اس دفعہ محفل پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں 16 دسمبر کو شہید ہونے والے بچوں کے نام بہت اچھی لگی، اس ماہ کی خاص کہانی تحسین انجم انصاری کی چیونٹی میں راجی نے بھی خوب بدلہ لیا ان سب سے ساری عمر کے لیے ان کو تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔

☆ اچھے اشفاق بٹ! تبصرے کا مختصر اور جامع ہونا اس کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ امید ہے اگلے ماہ آپ کا تبصرہ بھی خوبصورت ہوگا۔

✉ سیدہ دعا شاہ کی تلمبہ سے احوال میں پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں، میں آپ کی اس محفل میں پہلی بار آئی ہوں۔ امید ہے آپ سب مجھے ویلکم کہیں گے۔ مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت شوق ہے اور لکھنے کا بھی۔ میں ایک اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ پچھلے دنوں ایک نیو ٹیچر اسکول میں آئی۔ سلام دعا ہوئی، دوستی ہوئی تو وہ ٹیچر شاعرہ نکلی، سیدہ نور العین زہرہ، اُس نے مجھے لکھنے کی ہمت دی جو میں آج قلم اُٹھا کر آپ سے مخاطب ہوں۔ سب سے پہلے تو میں نور کو شکریہ کہوں گی جس نے اتنے اچھے ڈائجسٹ سے متعارف کروایا۔ انشاءاللہ میں ہر ماہ حاضر ہوتی رہوں گی۔ اگر آپ نے ویلکم کیا تو؟ سب سے پہلے محترمہ اُمِ جلال نقوی بخاری کو مخاطب کروں گی۔ ہمیں آپ کی تحریر پڑھنی ہے پلیز قلم اُٹھائیں۔ سب بہن بھائیوں کو سلام اور دعائیں۔

☆ دعا صاحبہ! لیجیے ہم نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ اب آپ کو بھی وعدہ نبھانا ہوگا اور ہر ماہ احوال کا حصہ بننا ہوگا۔

✉ تلمبہ سے اُمِ جلال بخاری صاحبہ کی تفصیلی تبصرے کے ساتھ آمد ہے۔ عرض کرتی ہیں، میرا زیادہ حلقۂ احباب سچی کہانیاں میں ہیں۔ کچھ اپنی باتیں۔ ارے واہ یہ کاشی تو بڑے کام کی چیز (چیز خاصے کی جیسے ہے۔ مار ادئے یہ باتیں کہاں سے نکالتا ہے۔ محمود شام کو بین بکن جیسے سفرنامے لکھتے رہے۔ میرے جیسے غریب جنہیں سیاحت کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ مگر دانت ہیں تو چنے نہیں۔ ہمشکل میں شاہ زیب کی تلاش دیکھیں کب مکمل ہوتی ہے اور انجام کیا نکلتا ہے۔ اللہ کرے ڈاکٹر کی بات غلط ہو اور وہ اپنی لمبی عمر پوری

مارچ 2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/ کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ______________________________

مکمل پتا: ______________________________

____

مارچ 2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/ بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: ______________ تعداد صفحات: ______________

نام: ______________________________

مکمل پتا: ______________________________

____

فون/ سیل نمبر: ______________________________

مارچ 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/ کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ______________ مصنف: ______________

دوم، عنوان: ______________ مصنف: ______________

سوم، عنوان: ______________ مصنف: ______________

نام: ______________ شہر: ______________

سانحہ ارتحال

روواں ماہ مینیج مارک ایڈورٹائزنگ کے شمیم چوہدری صاحب کی ہمشیرہ اس دارفانی سے کوچ کرگئیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز اس دُکھ کے موقع پر مرحومہ کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

کرے۔ شش! خاموش نسیم سحر کا عنوان بہت پسند آیا۔ کہانی اُس سے بھی زیادہ۔ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سلیم اختر اجنبی نہیں ہیں ہمیشہ بامقصد کہانیاں لکھتے ہیں۔ کرنی کی سزا عبدالغفار عابد نے اچھا سبق دکھایا۔ ویل ڈن! عبدالغفار اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، رانا محمد شاہد نے اجتماعی دکھ میں بالکل ٹھیک کہا کہ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی انفرادی خوشیاں یاد تو رکھتے ہیں لیکن اجتماعی دکھ کو بھول جاتے ہیں۔ ادھوری محبت میں ماہ نور کی بھابی اُس کی خوشیوں کی رکاوٹ بن گئی۔ عظمیٰ شکور نے سچ کہا کہ مردغم کی تصویر تو بن جاتا ہے مگر آنسو بہانا مردانگی کی تذلیل ہے۔ ایم اشفاق بٹ نے بھی اچھا لکھا۔ یہ ملال عشق ثنا ناز ویل ڈن۔ سیوا کا میوا اِم عادل کو سلام۔ تھرل سے بھرپور ناگن۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔ بس ایک بات میری چپکے سے سن لو۔ کسی کو بتانا نہ مجھے تنقید کرنا نہیں آتی؟؟؟

☆ اُمِ جلال جی! محبت میں چار صفحات ہیں۔ اچھا ہوا آپ کو تنقید کرنا نہیں آتی ورنہ......

✉ ملتان شریف سے احوال میں یہ آمد ہے، مجید احمد جائی کی۔ لکھتے ہیں، ماہ فروری **2015** کا سچی کہانیاں پانچ تاریخ کو ہماری دسترس میں آیا۔ اداریہ، استقبال پڑھا، منزہ سہام، ہمیشہ کی طرح خوبصورت الفاظ کا مجموعہ لائی تھیں۔ کچھ اپنی باتیں، کاشی چوہان، نے اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔ احوال میں پہنچے تو صفدر علی حیدری صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ نازیہ بتول، روبینہ شاہین، اُم جلال بخاری، نازیہ جہانگیر، محمد یوسف لغاری، عبدالعزیز جی آ، بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے، عمران فائق، مورشاہد حسین، آپ کیسے ہیں۔ شائستہ جمال، پیاری بہن سدرہ انور علی، بہترین تبصرے کر رہے تھے۔ ممتاز احمد صاحب، کہاں ہیں آج کل، فیصل ندیم بھٹی، پیارے عبدالغفار عابد، فریدہ جاوید فری، ہردل عزیز جاوید راہی، منشی محمد عزیز مئے، مقصود احمد بلوچ خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ مبارک علی شمسی صاحب اور کچھ پیارے لکھاری احوال سے غیر حاضر تھے، پلیز حاضری یقینی بنایئے، علی حسنین تابش آپ بھی سن رہے ہیں ناں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے قسمت والے ممتاز احمد پڑھی۔ بہترین تحریر لکھی گئی تھی۔ نیلے رنگ کا سوٹ، ملک عاشق حسین اچھی تحریر لے کر آئے تھے۔ اکلوتی، مسز نوید ہاشمی، ادھوراپن، روبینہ شاہین، ظلم کا انجام، عائشہ نور عاشا، آخری معرکہ، جاوید راہی، بھوکا پیٹ، نبیلہ نازش راؤ بہترین تحریریں تھیں۔ جوگی بشریٰ رحمٰن، اے کاش بشریٰ خان، 'کتیا' شمع حفیظ اچھی کہانیاں تھیں۔ محمود شام کا برطانیہ میں خزاں پسند آیا اور ایم اے راحت کی ہم شکل خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ نئے لکھنے والے بھی چھائے رہے۔ بزم سخن آباد ہمیشہ کی طرح شاندار تھی۔ لو جی مختصر سا تبصرہ اختتام کو پہنچا۔

☆ اچھے مجید! واقعی پچھلے ماہ ہم تبصرے میں تبصرہ ڈھونڈتے ہی رہ گئے تھے۔ خیر تم چیمپئن ہو۔ دیکھو نا مختصر سا کمال تبصرہ کیا۔

✉ فریدہ جاوید فری، لاہور سے شامل احوال ہیں۔ لکھتی ہیں، **3** تاریخ کو سچی کہانیاں اپنے دلکش ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ کہانیاں اے ون تھیں۔ پڑھ کر متاثر ہوئی۔ خاص کر اپنی پیاری دوست نبیلہ نازش کی بھوکا پیٹ،

کیا زبردست لکھا نبیلہ جی۔ گِدھ اور کُتیا بھی متاثر کُن رہیں۔ اے کاش، اسیرِ محبت، ادھورا پن اور اکلوتی بھی اچھی تحریریں لگیں۔ ایم اے راحت صاحب کا سلسلہ وار ناول تو بے حد پسند ہے۔ وہ تو لکھتے ہی بہت اچھا ہیں۔ اکلوتی کا اینڈ بُرا ہوا۔ مقصود بھائی آپ ہمیں یاد رکھتے ہیں بہت بہت شکریہ۔ ایم اشفاق بٹ کی کمی محسوس ہوئی، سدرہ جی دل چھوٹا نہ کریں دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو کسی کی دل آزاری کر کے خوشی ملتی ہے۔ خوش رہو بے حد پیار مسز نوید ہاشمی کو بے حد سلام دعا۔ ثمینہ جی اسلام علیکم۔ سب بہن بھائیوں کو بے حد سلام دعا۔ شگفتہ شفیق کو کنزل بیٹی کی نکاح کی بے حد مبارکباد قبول ہو۔ سخن آباد میں سب کی شاعری دل کو بھائی۔ اپنی غزل دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اسامہ ندیم اور جاوید راہی کا تبصرہ پسند آیا۔ اچھا جی اب اجازت اللہ حافظ۔

☆ لیجیے فریدہ جی! آپ کا تبصرہ شامل احوال ہوا۔ آپ کی دعا سلام سب تک پہنچ گئی ہے۔ اب تو خوش ہیں نا۔

☒ ضرغام محمود، کراچی سے یک سطری خط لیے حاضر ہیں، آپ بھی پڑھیے۔ ایک تحریر بعنوان 'ماں جی' روانہ خدمت ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اس تحریر کو وقت دیجیے گا۔

☆ بھائی ضرغام! پرچے پر کچھ بات کر لینا، بہت سارے قارئین کو محظوظ کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ 'ماں جی' کے بارے میں جلد مطلع کر دیا جائے گا۔

☒ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں، انتہائی دلکش سرورق کے ساتھ فروری کا پرچہ **2** تاریخ کو ملا۔ منزہ سہام آنٹی کا اداریہ، استقبال، سانحہ پشاور کے ظلم و بربریت کے واقعے نے پوری پاکستانی قوم اور ساری دنیا کو لرزا کر رکھ دیا، کچھ اپنی باتیں، لفظ لفظ اجلا اور پھولوں کی طرح مہکا ہوا ہے اور ہمیشہ کی طرح ایک سبق بھی پوشیدہ ہے۔ احوال میں سبھی خطوط ماشاء اللہ تھے مگر شائستہ جمال عبدالعزیز انکل اور اسامہ ندیم نے بہت شاندار لکھا ویلڈن۔ ملکہ احوال کی غیر حاضری بہت محسوس ہوئی، زرینہ آپی کو لے کر فوراً آجاؤ ورنہ...... اللہ کرے آپ خیر سے ہوں۔ اُمِ جلال کو احوال میں خوش آمدید۔ مرحبا۔ فیصل ندیم جی جھنگ میں ہیر رانجھا کا میلہ مارچ میں لگتا ہے۔ جب تک مارچ کا پرچہ آئے گا تب تک میلہ لگا ہوا ہوگا۔ (ہم ہر مہینے احوال میں لگاتے ہیں) مقصود احمد بھیا جن شخص کا آپ نے کہا تھا وہ میرے بابا نہیں۔ ممتاز احمد بھیا کی قسمت والے، غزالہ عزیز کی تیرے انجام پہ رونا آیا، عمران مظہر کی اتنا مجھے یقین ہے، چمن اعوان کی کیسا یہ میرا نصیب، عائشہ نور کی ظلم کا انجام، ارم ناز کی کیا ملا محبت میں، ملک عاشق حسین کی نیلے رنگ کا سوٹ، فرح انیس کی روایات کے قیدی، مسز نوید ہاشمی کی اکلوتی، خطا میری ہے بہت دلچسپ تحریر لگی۔ حنا کنول کی وہ اک ستارہ مہرباں، روبینہ شاہین کی تحریر ادھورا پن اُن والدین کے لیے سبق ہے جو اپنے بچوں کے درمیان فرق سمجھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ارشد علی کی اسیرِ محمد، شمع کی حفیظ کی کُتیا، نبیلہ نازش کی بھوکا پیٹ، عائشہ سلیم کی گِدھ، جاوید راہی کی آخری معرکہ بہت دلچسپ اور لاجواب تحریریں لگیں۔ تین مرد تین کہانیاں اچھی لگیں۔ ہم شکل اور ناگن اچھے انداز سے رواں ہیں۔ زہرِ عشق کا انتظار ہے۔ سخن آباد میں سب نے شاندار شاعری کی۔ خاص کہانی تحسین انجم کی چیونٹی پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شائستہ جمال، مسز نوید ہاشمی، ثمینہ ناز، تحسین جونیجو، ملکہ احوال، زرینہ آپی کو سلام۔

☆ لیجیے سدرہ جی! تبصرہ شاملِ احوال ہوا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

☒ منعم اصغر، ڈیرہ غازی خان سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں، فروری کا شمارہ پا کر بہت خوشی ہوئی، تین تاریخ کو ہی مل گیا گھر پہنچ کر سب سے پہلے منزہ سہام اور کاشی بھائی کی دل کو چھو لینے والی باتیں پڑھیں، پھر احوال میں جھانکے تو خط بھی بھرپور تھے۔ ٹائٹل بہت ہی خوبصورت تھا اور کہانیاں اس سے بھی

سانحہ ارتحال

روان ماہ عنزہ کارپوریشن کے جاوید کیانی صاحب کی والدہ اس دارفانی سے کوچ کر گئیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز اس دُکھ کے موقع پر مرحومہ کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

زیادہ خوبصورت۔ واقعی سچی کہانیاں وہ پہلا پرچہ ہے جس میں کوئی کہانی بور نہیں کرتی اور ایسی بھی نہیں ہوتیں جسے پڑھ کر شرمندگی ہو کیونکہ ہم بھی فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ سچی کہانیاں ہمارا اپنا پرچہ ہے۔ سب سے پہلے ممتاز احمد کی قسمت والے پڑھی، بہت اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد تیرے انجام پہ رونا آیا اور اتنا مجھے یقین ہے عمران مظہر کی کاوش بھی دلوں کو ہلا گئیں۔ چمن اعوان کی کیسا یہ میرا نصیب، کیا ملا محبت میں، روایات کے قیدی اور مسز نوید ہاشمی کی اکلوتی بھی بہت غمگین تحریر تھی۔ مسز نوید ہاشمی کے خط پڑھ کر ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ سچی کہانیاں سے کتنی محبت کرتی ہیں، آج تحریر بھی پڑھ لی، جس میں ایک بہن نے دوسری کا گھر تباہ کر دیا۔ آہ پھر خطا میری ہے، وہ اک ستارہ مہرباں، ادھوراپن، اسیرِ محبت، کٹیا، بھوکا پیٹ، گدھ، آخری معرکہ، اے کاش، جوگی بہت دلچسپ کہانیاں تھیں اور تحسین انجم انصار کی چیونٹی اس بار بازی لے گئی۔ بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ ویل ڈن پھر سخن آباد کا رخ کیا۔ یہاں بھی بہار آئی ہوئی تھی۔ سب نے بہت ہی اچھا لکھا۔

☆ اچھے منعم! تمہارا تازہ ترین تبصرہ احوال کا حصہ بن گیا۔ اب خوش ہونا۔ ابھی کہانی کے لیے تمہیں بہت محنت کی ضرورت ہے۔

✉ مبارک علی شمسی، قائم پور سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں، شمارہ میری نظروں کے سامنے ہے، ٹائٹل پر خوبصورت ماڈل کی تصویر قاری کو اپنی طرف کھینچ کر دعوتِ مطالعہ دے رہی ہے۔ مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام کے قلم سے ملالہ یوسف زئی کو نوبل پرائز ملنے کے بارے میں بہت ہی عمدہ اداریہ پڑھنے کو ملا۔ پھر صفحہ نمبر **9** پر جا پہنچا جہاں پر کاشی چوہان کی 'کچھ اپنی باتیں' منتظر تھیں جس میں اُنہوں نے سانحۂ پشاور کے بارے میں خوب محبت سے اور کرب میں مبتلا ہو کر لکھا۔ سانحۂ پشاور میں شہید ہونے والے پھولوں کی نذر:

تمہیں کس پھول کا کفن ہم دیں؟ ☆ تم جدا ایسے موسموں میں ہوئے ☆ جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے

نفیسہ مغل، مجید احمد جائی، ارم خان (ڈی جی خان)، منشی محمد عزیز مے، کنول عمران خان، کاشف عبید بٹ، سدرہ انور علی، چمن اعوان آزاد کشمیر اور عائشہ نور عاشا کے خطوط بہت پیارے تھے۔ محترم سلیم اختر صاحب کی اسٹوری گرداب بہت ہی عمدہ تحریر ہے، شائستہ جمال کی 'فیس بک' ایم اشفاق بٹ کی 'گناہوں کی دلدل' جاوید راہی کی 'قدم قدم پہ ستم' شازیہ گل کی 'لرزش' ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی 'خدا نہ کرے' حنا اصغر، عظمیٰ شکور، رانا محمد شاہد کی کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ سخن آباد میں کیتھرین، عنبرین نعیم، سیدہ نورالعین زہرا، حسن نظامی کا کلام بہترین ہے۔ آخر میں میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں مزید ترقی کرے، اگلی ملاقات تک اجازت۔

☆ پیارے مبارک علی شمسی! تبصرہ بہتر رہا۔ کہانیوں کے بارے میں تھوڑا سا انتظار۔ احوال میں آمد کو مستقل بناؤ۔

✉ احوال میں سعید گلاب کی آمد کراچی سے ہے۔ لکھتے ہیں، میں سچی کہانیاں کا ایک خاموش قاری ہوں۔ احوال میں کبھی کبھی حاضری لگ جاتی ہے اور اُسے آپ لوگ قبول بھی کر لیتے ہیں جس کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ سالِ نو کا پہلا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ سب سے پہلے بات ہو جائے

احوال کی۔ میری نظر میں احوال سچی کہانیاں کا ایک ایسا گلشن ہے جس میں سارے احوالی اس گلشن کے دلکش پھولوں کی طرح ہیں۔ ان کی ہنسی مذاق نوک جھوک سے ہی اس سلسلے کی رونق برقرار ہے۔ اس میں اگر کوئی کسی کو محبت سے اچھے ناموں یا القاب سے مخاطب کرتا ہے تو ایسی کون سی قیامت آگئی جس پر اتنا جیلس ہوا جا رہا ہے۔ غزالہ کرن صاحبہ اگر آپ غور سے سدرہ انور کے تبصروں کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتا چل جائے کہ اُن کا ہر تبصرہ مکمل اور جامع ہوتا ہے، جس میں شمارے پر بھرپور تبصرہ بھی شامل ہے۔ لہٰذا جلنا بند کریں اور مہربانی کر کے احوال کے ماحول کو خراب نہ کریں۔ قسط وار تینوں ناول بہترین جا رہے ہیں۔ باقی کہانیوں میں سلیم اختر کی گرداب، نسیم سحر کی کشش خاموش، حنا اصغر کی خالی دامن خالی ہاتھ، زرغام محمود کی تن کی کالی من کی اُجلی، رانا شاہد کی اجتماعی دکھ بہت پسند آئیں۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ سخن آباد میں محمد علی اور شاہد رفیق سہو کا انتخاب لاجواب ہے۔

☆ بھائی سعید گلاب! ہمیں آپ کی یہ کبھی کبھی کی آمد نہیں چاہیے۔ ہمارا اتنا پیارا لکھنے والا کیا ہمیں ہر ماہ اپنی محبت کے کچھ پھول بھی مستعار نہیں دے سکتا؟

✉ کراچی سے ایک طویل عرصے کے بعد جمال زیدی کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں، ایک عرصے بعد حاضر ہوں کیونکہ غیر حاضری کا تمام عرصہ دیارِ غیر میں گزرا جہاں صبح و شام کرنا محنتِ شاقہ اور پھر کمائی اہل و عیال کو بھیج دینا معمول رہا۔ دریں اثناء کوئی تحریک نہ ملی کہ اردو جاننے والے چنداں ہی تھے تو اردو ادب کا قاری کہاں نصیب ہوتا؟ آج کل میرا قیام وطن عزیز میں ہی ہے اور مسکن کراچی ٹھہرا۔ پرچہ آنے پر تبصرہ بھی کروں گا۔

☆ بھیا آپ کا مختصر نامہ احوال کی زینت اس امید پر بنا دیا ہے تا کہ ہم اگلے ماہ آپ کے بھرپور تبصرے سے مستفید ہو سکیں۔

✉ ہمارے بہت محترم لکھاری دوست بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاول پور سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں، بڑے کٹھن انتظار کے بعد شمارہ ملا۔ فوراً خریدا۔ مطالعے کی ابتداء سے معلوم ہوا کہ ماہنامہ سچی کہانیاں کا ایڈریس تبدیل ہو چکا ہے۔ چند کہانیاں کو پن سمیت ارسال کر چکا ہوں۔ ابھی تک ایک بھی شائع نہیں ہوئی۔ لگتا ہے آپ ترتیب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کہانیاں شاید بہت زیادہ موصول ہو چکی ہیں، خطوط تک آپ ضائع نہیں کرتے، دو ماہ قبل کے خطوط بھی آپ شائع کر دیتے ہیں۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ اس طرح قارئین کی محبت اور اُنس بڑھتا ہے۔ رضوانہ پرنس کی والدہ صاحبہ کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ اب اگلے نئے شمارے کے تبصرے تک اجازت۔ خدا حافظ۔

☆ بھائی بشیر! انشاء اللہ اسی ماہ آپ کے ہاتھ میں آپ کا ایوارڈ سرٹیفکیٹ موجود ہوگا۔ پُراسرار کہانی کیا ہوئی آپ کی...... جلد بھجوائیں تا کہ پُراسرار نمبر 2 کا حصہ بن سکے۔

✉ امام بخش ابڑو، ڈیرہ اللہ یار سے رقم طراز ہیں۔ ماہِ فروری کا تازہ شمارہ سچی کہانیاں 5 فروری کو مل گیا۔ ایم اے راحت صاحب کی قسط وار کہانی اور ناگن نے دھوم مچا رکھی ہے۔ جسے ہم شوق سے پڑھتے ہیں اور تمام کے تمام سلسلے بھی اچھے اور معیاری چل رہے ہیں۔

☆ بہت عزیز امام بخش! آپ کا خط پا کر بہت خوشی ہوئی اور ہمارے بارے میں آپ کے خیالات نے معلومات میں اضافہ کیا۔ خوش رہیے۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے نفیسہ فضل صاحبہ کی۔ لکھتی ہیں، آپ اور تمام اسٹاف کو دلی دعائیں۔ اللہ پاک منزہ بیٹی اور آپ سب کو ہمت، صحت و زندگی عطا فرمائیں۔ آمین۔ 25 دن میں ہمارے یہاں 4 اموات

ہوگئی ہیں۔ ایک میرے بھتیجے یوسف طلعت، ڈپٹی ڈائریکٹر K.M.C تھے۔ جنہیں ان کے ساتھی ڈائریکٹر سہیل بھٹی کے ساتھ اردو یونیورسٹی کے سامنے گاڑی پر فائرنگ کرکے شہید کردیا۔ پھر میری کزن، ممانی اور خالہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ قارئین سے اُن کے لیے دعائے مغفرت کی گزارش ہے۔

☆ اچھی آنٹی۔ خدا آپ اور آپ کی فیملی کو ان سانحات پر صبر عطا فرمائے۔ کہانی موصول ہوگئی ہے۔ اس کے بارے میں جلد ہی آپ کو مطلع کردیا جائے گا۔

✉ ڈی جی خان سے ہماری بہت پیاری بہن ارم خان احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں، فروری کا سچی کہانیاں سامنے ہے۔ خوبصورت سا ٹائٹل اور اندر ایک جہان آباد۔ محفلیں قصے کہانیاں، شاعری، لوگوں کے درد کو کم کرنے والے بابا جی اور خاص طور پر محفلِ احوال۔ جس میں شامل ہر شخص محبت کے پھول بانٹنے میں لگا ہوا ہے۔ میں بھی ہر ماہ اس میں شامل ہونے کی کوشش کرتی ہوں لیکن لیکن افسوس شامل ہونے کا ہر ماہ موقع نہیں ملتا، وجہ رسالے کا لیٹ ملنا ہے۔ (اب انشاء اللہ یہ مسئلہ بھی ختم ہوجائے گا) احوال کی محفل میں بھائی مور شاہد حسین اور اسامہ ندیم کے خط میں اپنا ذکر سن کر احساس ہوا کہ اس محفل میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مجھ ناچیز کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ بہت شکریہ۔ ارے ہاں سدرہ انور علی کو تو میں بھول...... اوسوری آپ کو نہیں آپ کو تھینکس کہنا بھول رہی تھی۔ سدرہ جی۔ پچھلے ماہ سے آپ کا تھینکس میرے پاس امانت تھا۔ اب آپ سوچ رہی ہوں گی تھینکس کس لیے تو سسٹر مجھ ناچیز کی غزل آپ نے لائیک کی یہ تھینکس اس کے لیے تھا۔ اور ہمیں رسالہ کافی لیٹ ملتا ہے اگر ہم سالانہ رکھ لیں تو کیا رسالہ ہمیں ٹائم پر مل جائے گا۔ پلیز ہمیں اس بارے میں بتائیں۔

☆ اللہ اللہ...... ارے ارم جی! یہ زندگی جان لیوا بیماری نہیں بلکہ بہت محبت والی بلا ہے۔ اسے خوبصورت بنائیں۔ شاعری اور کہانی...... ہاں ہاں اگلے ماہ آپ کو ان ہی صفحات پر پتا چل جائے گا۔ سالانہ خریداری کے لیے آپ نے سچی کہانیاں کا نام **890** روپے کا منی آرڈر روانہ کردینا ہے۔ انشاء اللہ سچی کہانیاں ہر ماہ وقت پر آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔

✉ محمد ندیم عباس ہواتی کی چوکی سے احوال میں پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں، میں سچی کہانیاں ڈائجسٹ کا نیو قاری اینڈ لکھاری ہوں۔ سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں نے پہلی بار غالباً اگست **2014**ء کا شمارہ اپنے محترم انکل ریاض حسین شاہد صاحب قبولہ شریف کی کہانی سفید آنکھیں کی وجہ سے خریدا تھا۔ انکل جان کی کہانی واقعی لاجواب تھی۔ اس کے بعد جنوری **2015**ء کا شمارہ خریدا۔ جس میں خطوط کی لمبی قطار دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ خطوط میری کمزوری ہیں۔ کسی بھی ڈائجسٹ میں اسٹوریاں کم اور خطوط کا بہت عاشق ہوں۔ اسی کمزوری کے تحت میں سچی کہانیاں کے نام خط لکھ رہا ہوں، پھر سچی کہانیاں میں خطوط کی محفل بھی مزے کی لگی۔ خطوط کی محفل میں ایم حسن نظامی صاحب کو سلام۔ بھائی کاشف عبید جی سلام...... آپ کے سوا یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا، اس لیے آپ وعلیکم کرنا نہ بھولنا ورنہ دلی افسوس ہوگا۔

☆ پیارے ندیم! خوش آمدید۔ سچی کہانیاں تمہارا اپنا پرچہ ہے۔ اس میں آمد کے لیے اجازت یا کسی بھی حوالے کی ضرورت نہیں۔ خوش رہو۔

✉ احوال میں یہ شرکت ہے، مسز نوید ہاشمی کی، نارتھ ناظم آباد کراچی سے۔ لکھتی ہیں، اللہ سے دعا ہے سچی کہانیاں اور دوشیزہ میں ہمیشہ ہیرے آتے رہیں۔ جو ڈائجسٹ کو اپنی محنت لگن سے چار چاند لگادیں۔ دسمبر میں محمد سلیم اختر، اسماء اعوان کی تحریریں پسند آئیں۔ عذرا فردوس، معاویہ عنبر ڈوٹو، علی رضا عمرانی کی آئیڈیل تحریر یہ ان لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو خوبصورتی کے چکر میں اچھی پڑھی لکھی اچھے گھرانے کی لڑکیاں رد کردیتے

ہم آپ کے منتظر ہیں

بہت عزیز قارئین!

ہمارا آپ کا ساتھ برسہابرس سے ہے

وقت بدلا، حکومتیں بدلیں، موسم بھی وہ نہ رہے

لیکن

جو چیز پاس رہ گئی

وہ ہے آپ کا اور ہمارا ساتھ

ہماری دُعا ہے کہ

محبتوں اور رابطوں کے یہ بندھن ہمیشہ قائم رہیں

ساتھیو!

ہمارے اور آپ کے رابطے کی منزل تبدیل ہوگئی ہے

ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں:

پتا: C-88 II ۔فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121-35893122

اُمید ہے آئندہ آپ کی نگارشات اور محبت سے بھیجے گئے خطوط ہمیں اسی پتے پر موصول ہوں گے

ہیں۔ ممتاز احمد کی تحریر بے حد شاندار تھی، مہر پرویز احمد اور سدرہ انور علی کی تحریر بھی پسند آئی۔ جاوید راہی، کنول عمران خان اور فرخندہ بتول، سید محمود حسن، رئیسہ خالد، احسان عمرانی کی تحریریں پسند آئیں۔ عظمیٰ شکور، غلام رسول گل، ڈاکٹر غضنفر عباس اسدی، فوزیہ نور، کشور وسیم، جہانگیر، مجید احمد جائی کی تحریریں بھی اچھی تھیں۔ دسمبر میں سخن آباد میں شائستہ جمال کی بیٹی چھا گئی، زرینہ جونیجو اور مقصود احمد بلوچ کی شاعری پسند آئی۔ جنوری میں منزہ سہام نے اتنی خوبصورت بات کی کہ (جس سے اللہ راضی اُس سے دنیا راضی) واقعی خدا جس کو چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت۔ کاشی چوہان نے بھی ایسا درد بیان کیا جس کی تکلیف ہمیشہ ہمارے دلوں میں زخم ڈالتی رہے گی، بس خدا سے یہ دعا ہے خدا پاکستان کی حفاظت کرے۔ اب ہم اپنے احوال میں تشریف لا رہے ہیں جو محبت بھرا ہمارا اپنا میکہ ہے۔ جس میں آ کر بڑا مزہ آتا ہے۔ جنوری میں سلیم اختر نے گرداب بہت خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ تشش خاموش نسیم سحر کی اچھی تھی۔ حنا اصغر اور محمد بلال فیاض کی تحریریں بھی خوبصورت تھیں۔ عبدالغفار عابد، زرغام محمود، محمد زبیر ساگر کی اچھی لگی۔ رانا محمد شاہد، علی حسنین تابش اور عظمیٰ شکور، ایم اشفاق بٹ لاجواب تحریر تھی۔ سفرنامہ پسند آیا۔ کرن بشیر، فیصل ندیم بٹ، اُم عادل کی تحریر بھی شاندار تھی۔ عمران مظہر نے بھی حسد کی آگ بہت خوبصورتی سے پیش کی، بابر نایاب، شازیہ گل اور ڈاکٹر طارق محمود، شائستہ جمال، عثمان غنی کی تحریر بھی پسند آئی۔ احمد جاوید کی فیض عشق کا اینڈ مجھے بے حد پسند آیا، او میرے بھائی کاشی چوہان بس بہت ہو گیا۔ میں کچھ نہیں جانتی اب مجھے مارچ میں آپ کی زہر عشق نظر آنی چاہیے، بہت انتظار کروا دیا اب۔ مجھے یقین ہے یہ ناول بے حد شاندار ہوگا۔

☆ لیجیے آپا! مارچ میں زہر عشق آپ کے سامنے ہے۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔

✉ قمر شہداد کوٹ سے، مور شاہد حسین مختصر تبصرے کے ساتھ احوال کا حصہ بن رہے ہیں، لکھتے ہیں، بھیا ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ الفت بھرا اسلام قبول ہو۔ سچی کہانیاں فروری **2015** کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ **3** تاریخ کو موصول ہوا۔ استقبال اور کچھ اپنی باتیں دل کی آنکھ سے پڑھیں۔ زہرِ عشق کا بے چینی سے انتظار ہے، لوجی محفلِ احوال خوبصورتی سے سجی ہوئی ہے۔ بس کمی ہے تو اسماعیل بروہی بھیا، ادی زرینہ، ادی تحسین، غلام رسول گل، امجد علی بھیا کی۔ امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ نئے آنے والوں کو ویلکم۔ نازیہ خانم آپ پڑوسی ہیں، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ یاسمین اقبال خدا آپ کو اچھی صحت دے۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ جن میں خاص طور پر قسمت والے، اکلوتی، روایات کے قیدی، کٹیا، بھوکا پیٹ، آخری معرکہ، تیرے انجام پہ رونا آیا بہت پسند آئیں۔ سخن آباد ہمیشہ کی طرح دل کو بھایا۔ اب اجازت خدا حافظ۔

☆ پیارے مور! یہ کیا...... تمہارا تبصرہ اتنا مختصر!! لگتا ہے بہت زیادہ معروف ہو گئے ہو۔ اگلی بار بھرپور تبصرے کے ساتھ آنا۔ مور کے پر جتنے زیادہ ہوں اتنے ہی اچھے لگتے ہیں۔

لیجیے ساتھیو! یہ تو وہ خطوط تھے جو ہمیں موصول ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اس ماہ ہماری ملاقات کا اختتام ہوا۔ اجازت سے پہلے صرف اتنا کہوں گا محبت کو ضرب کرنا چاہیے تقسیم نہیں۔ یہ فارمولا اپنی زندگیوں میں کا لازمی جزو بنا لیں۔ پھر دیکھیے گا زندگی میں ہر طرف رنگ ہی رنگ اور سکون ہی سکون دکھائی دے گا۔ سوچ کو ہمیشہ بلند رکھیے۔ حسد، کینہ اور بغض دیمک کی طرح انسان کی شخصیت کو برباد کر دیتا ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ہم اور آپ پھر سے روبرو ہوں گے۔ پُر اسرار نمبر بہت محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ ہم اس محنت میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا جواب آپ کے بھیجے گئے خطوط دیں گے۔ اگلے ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ 'رفعت سراج'

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

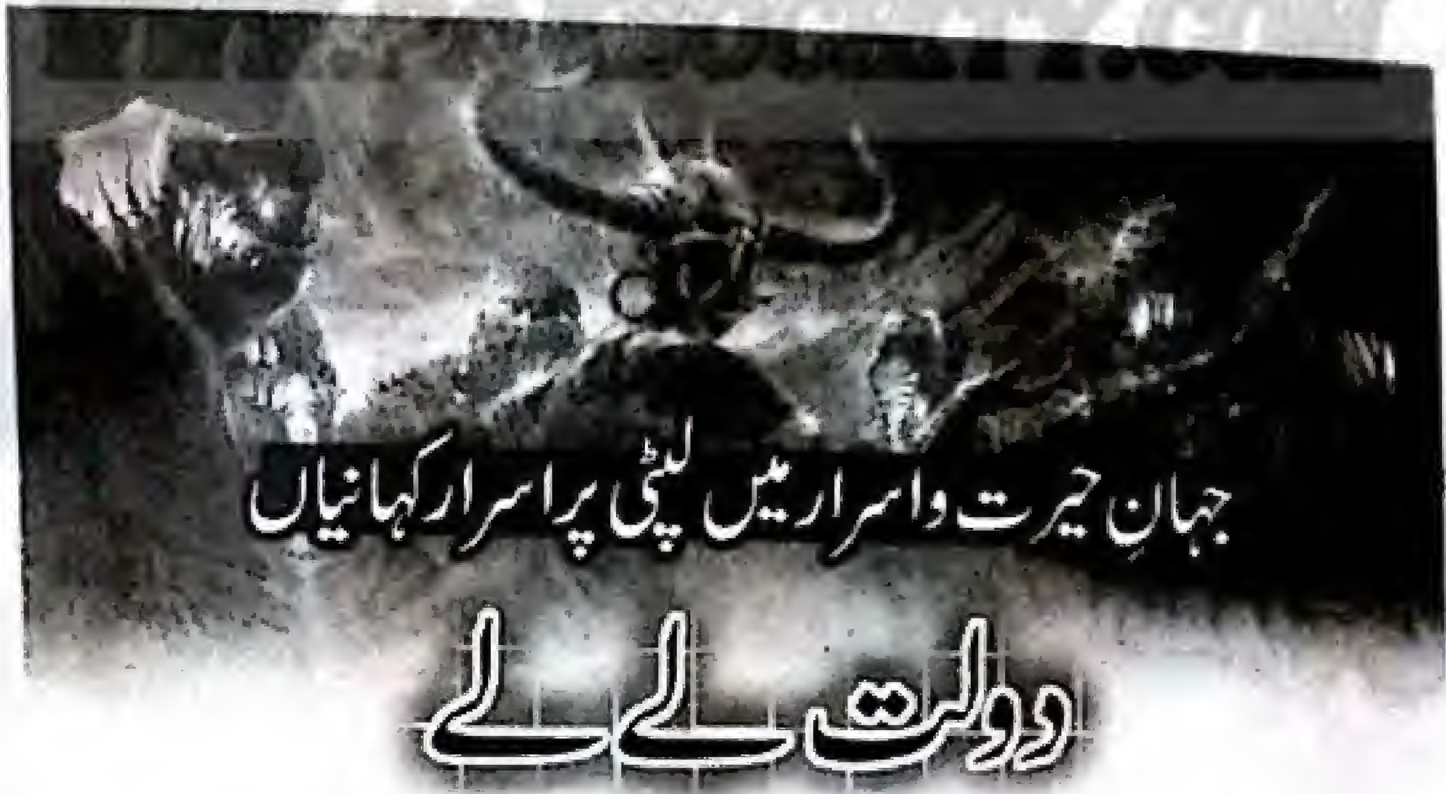
رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

دامِ دل

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

ماہنامہ ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔



دولت لے لے

نیر شفقت

بہاول پور کی گلیوں میں دیوانہ بنے پھرتے، ایک بزنس مین کا چشم کشا پُر اسرار قصہ

احسن علی کی چھٹی سالگرہ جیسے جیسے قریب آ رہی تھی ویسے ویسے امجد علی کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گیارہ اکتوبر کا دن کیلنڈر سے نکال دے یا پھر کوئی ایسی جادو کی چھڑی ہاتھ لگ جائے جس کو گھماتے ہی دس سے بارہ اکتوبر کا دن آ جائے مگر قانونِ فطرت کیسے بدل سکتا ہے۔ 10 کے بعد 11 تاریخ آتی ہی تھی۔

''بابا جانی......'' زندگی بخش آواز اسے سوچوں کے گہرے پاتال سے نکال لائی۔ مگر یہ زندگی بخش آواز اسے کب تک زندگی بخشے گی؟ گیارہ اکتوبر میں اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔

''......جی بابا کی جان......'' اس نے احسن کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''بابا جانی! اپنی برتھ ڈے پر میں نے اتنی بڑی گاڑی لینی ہے۔'' معصوم احسن نے اپنے ہاتھوں کو حتی الامکان پھیلاتے ہوئے کہا۔ امجد علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور بیٹے کو گود میں بٹھاتے ہوئے بولا۔

''ضرور بیٹا! جیسی کار آپ پسند کرو گے وہی لے کر دوں گا۔''

''سچ بابا جانی'' اس کی روشن آنکھیں خوشیوں سے بھر گئیں ہوں۔ اس نے بیٹے کے گال چومے، بڑی عقیدت، محبت اور احترام سے۔

''ایسا کرتے ہیں کہ ابھی چلتے ہیں۔'' وہ بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا بیٹے کی یہ سالگرہ وہ کبھی نہیں منا پائے گا، اس لیے اس کی خوشیوں کے لیے وہ جتنا کر سکتا تھا، کرنا چاہتا تھا۔ احسن کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اس کے لیے زندگی کی بہت بڑی خوشیاں تھیں۔

''ابھی......'' احسن نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں......ابھی۔ چلو جلدی سے اپنی مما کو بلاؤ ہم تینوں اکٹھے چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بابا جانی۔'' اور وہ ہنستا کھیلتا اپنی ماں کو بلانے چلا گیا۔

امجد علی کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگے اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

''مجھے معاف کر دیں بھائیا جی۔ آپ کو اللہ رسول کا واسطہ بھائیا جی۔ میں بہت کمزور انسان ہوں۔ شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ ہمارے گناہوں کو تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے بھائیا جی۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں اس دکھ کو سہارنے کی اب مجھ میں ہمت نہیں ہے

''اس کی آنسوؤں سے بھری نگاہیں کمرے کے ایک مخصوص گوشے کی طرف لپکیں اور یوں لگ رہا تھا جسے وہ سامنے کھڑے کسی وجود سے باتیں کر رہا ہو۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

چھم ...... چھم ...... چھم شاید کوئی پازیب سی بجی تھی۔ امجد علی نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا مگر اپنے دو گدھوں کے سوا وہاں کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ وہ اسی صحرائی علاقے میں مٹی اکٹھی کرنے آیا تھا اور مٹی کو گوندھ کر برتن بنایا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے بنے برتنوں کی دور دور تک دھوم تھی۔ خاص طور پر اس کا بڑا بھائی اکرم علی تو ایسا فنکار آدمی تھا کہ اس کے ہاتھ کے بنے برتن لوگ مہنگے داموں خریدنے کو بھی تیار ہو جاتے تھے۔ مٹی لینے کو وہ اکثر اس علاقے میں آیا کرتے تھے۔ کبھی اکرم علی آتا تو کبھی امجد علی اور کبھی کبھار دونوں بھی آ جایا کرتے تھے۔



چھم چھم کی آواز وہ بہت دنوں سے سن رہا تھا اور خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آج کے بعد وہ اس علاقے میں نہیں آئے گا۔ خدا جانے کوئی آسیب تھا یا بدروح اگر کہیں وہ بدروح یا چڑیل اس کی جان لے لے تو...... "آگے کا وہ سوچ کر ہی کانپ گیا اور جلدی سے مٹی تھیلوں میں بھرنے لگا۔

چھم چھم کی آواز کبھی دائیں طرف سے آتی تو کبھی بائیں طرف سے وہ خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تھیلوں میں مٹی ڈالنے لگا۔

"چھم...... چھم...... چھم کی آواز پھر آئی۔

"کک...... کک...... کک کون ہو تم۔ سس...... سامنے آؤ۔"

ساتھ ہی وہ ادھر ادھر بھی دیکھ رہا تھا کہ کوئی بدروح یا چڑیل اس پر حملہ نہ کر دے۔

چھم چھم چھم۔ ایک انتہائی خوبصورت عورت اس کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ سرخ قیمتی لباس میں ملبوس وہ عورت سونے کے زیورات سے سے لدی پھندی تھی۔

"ڈر رہے ہو مجھ سے۔" کھنکھناتے زیورات کے ساتھ اس کی آواز بھی کھنکھنا رہی تھی۔ "ڈرو مت۔ میں مایا ہوں۔"

"مم...... مایا...... کون مایا......؟"

"مایا...... جسے تم لوگ دولت کہتے ہو۔ دولت چاہیے ہے تمہیں......؟" اس نے کھنکھناتے لہجے میں پوچھا۔

"دولت!!؟" اس کی آنکھیں چمکیں۔ "کسے نہیں چاہیے ہوتی ہے دولت۔"

"وہ چھوٹا سا ٹیلا دیکھ رہے ہو نا۔ اس کے اندر دولت دفن ہے۔ چاہیے ہے تمہیں۔"

"ہاں...... کیوں نہیں؟"

"اور اس کے بدلے تم مجھے کیا دو گے؟" اس نے بڑی ادا سے پوچھا۔

"مم...... میرے پاس تو تمہیں دینے کو کچھ بھی نہیں ہے۔" امجد علی مایوسی سے بولا۔

مجھے دینے کو تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ تم دینے کی ہامی تو بھرو۔" اس نے گویا ترغیب دی۔

"بھینٹ...... مجھے بھینٹ چاہیے۔"

"بھینٹ......" امجد علی نے نا سمجھی کے عالم میں دھرایا "وہ کیا ہوتی ہے۔"

"تم لوگ اسے قربانی بولتے ہو۔ مجھے خون چاہیے قربانی کا خون۔"

"ہاں ٹھیک ہے میں کل ایک بکرا لے آؤں گا اور تمہارے پاس قربان کر دوں گا۔" امجد علی نے بھولے پن سے کہا۔

"ہا...... ہا...... ہا" وہ گویا کسی لطیفے پر ہنسی تھی۔ "ارے بدھو مجھے بکرے کی قربانی نہیں چاہیے انسان کی قربانی چاہیے۔"

"ان...... ان...... انسان کی۔" اس کی ہوائیاں اڑیں۔

"ہاں۔ اور وہ بھی تمہارے بھائی کی۔ وہ پہلوٹی کی اولاد ہے۔ اور اس کی پیدائش پورن ماشی کی رات ہوئی تھی۔ مجھے اس کی بھینٹ چاہیے۔ منظور ہے تو بولو۔"

"بب...... بھائیا جی کی قربانی...... ناممکن...... کبھی نہیں۔" پتا نہیں اس نے اپنے آپ سے کہا تھا یا وہ مایا سے کہہ رہا تھا۔

"سوچ لو! بہر حال تمہارے پاس تین دن ہیں۔ چوتھے دن سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے......"

"چھم...... چھم...... چھم" پازیب بجنے کی آواز آ رہی تھی مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں یہ سب اس کا وہم تھا یا پھر اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

گھر آ کر بھی وہ کھویا کھویا سا تھا۔ دل بھائی کی محبت میں کھنچا جا رہا تھا۔ تو دماغ دولت کی ترغیب دیے جا رہا تھا۔ بھائیا جی سے اسے بہت محبت تھی۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ مگر دولت بھی تو وقت کی ضرورت تھی۔ آخر وہ کب تک برتن بنا بنا کر گزارہ کرے گا۔ کل کلاں کو اس کی شادی ہو گی، بچے ہوں گے تو وہ بھی اس کی طرح تمام عمر برتن بنا بنا کر اور سسک سسک کر زندگی گزاریں گے۔ دل و دماغ کی جنگ نے اسے

نڈھال کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس جگہ جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ سب اس کا وہم تھا یا پھر وہ مایا واقعی ایک حقیقت تھی۔

اور یہ حقیقت ہی تھی۔ گدھوں پر مٹی لادتے ہوئے، گدھوں کو ہنکاتے ہوئے اسے ہر طرف سے چھم چھم کی آوازیں آتی رہیں، گویا یہ اس کا وہم نہیں تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن وہ وہاں نہیں جا سکا۔ تیسرے دن بھائیا جی اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئے۔ امجد علی مٹی صحیح نہیں لا رہا تھا اس لیے بھائیا جی اس کی رہنمائی کے لیے ساتھ چلے آئے تھے۔ امجد علی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دل و دماغ میں جنگ اب بھی جاری تھی۔ بھائیا جی کے ساتھ آنے سے اس جنگ میں شدت آ گئی تھی۔ اگر وہ ساتھ نہ آتے تو شاید جنگ ختم ہو جاتی مگر شاید اللہ پاک کو اس کی آزمائش مقصود تھی۔ بھائیا جی مٹی کی کیا خصوصیات بتا رہے تھے، اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی اسے تو ہر طرف چھم چھم کی آوازیں آ رہی تھیں دو ایک مرتبہ تو زیورات کھنکھناتی مایا بھی نظر آئی مگر وہ صرف نظر کر گیا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا امجد علی کا کندھا بھائیا جی سے ٹکرایا اور بھائیا جی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے وہ دونوں اس وقت ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے تھے۔ نیچے پڑے نوکیلے ٹیلوں پر بھائیا جی اتنے برے طریقے سے گرے کہ ان کا سر پھٹ گیا اور وہ چند لمحوں میں ہی ختم ہو گئے ان کے مرنے کی دیر تھی کہ جانے کہاں سے سیروں کے حساب سے سکے اور زیوات نمودار ہوئے۔ امجد علی نے سب سے پہلے تو سارا خزانہ بوریوں میں بھر کر گدھوں پر لادا پھر بھائیا جی کی لاش کو گدھے پر رکھ کر روتا پیٹتا گاؤں آ گیا۔ لوگوں کو اس نے یہی بتایا کہ بھائیا جی ٹیلے سے پھسل کر گر پڑے اور پتھروں سے ٹکرا کر ان کی موت واقع ہو گئی۔ اور شاید حقیقت بھی یہی تھی۔

بھائیا جی کے بعد گاؤں میں اب اس کا کون رہ گیا تھا۔ پھر ویسے بھی اتنی ساری دولت کے ساتھ اس نے گاؤں میں تھوڑی رہنا تھا سو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ بہاول پور چلا گیا۔ بے انتہا دولت کے ساتھ کاروبار

کچھ نہ کہا

تیری چاہت میں تھا جو زخم ملا کچھ نہ کہا
تُو بھی انجان رہا، کیسا گلہ کچھ نہ کہا
تُو بتا کون سا یہ جرم ہوا تھا آخر
جس کے بدلے تھیں آہیں یہ صلہ، کچھ نہ کہا
کون بستی تھی، نگر تھا یا تھا قریہ گھوما
اِک مسیحا نہ ملا راز کھلا کچھ نہ کہا
پیار تو بھول چکے پھر یہ جتانا کیونکر
ہاں مگر غرض کا سودا جو ہوا کچھ نہ کہا
مان لیتے ہیں جمالؔ پیار ہے ان کو سچا
کڑوا سچ کہنا پڑا سُن ہی لیا کچھ نہ کہا

جمال زیدی۔ کراچی

شروع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

☆......☆......☆

بہت تھوڑے عرصے میں اس نے کاروبار کی دنیا میں اپنے قدم جما لیے تھے۔

شادی تو زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ سو کاروباری حلقے میں اپنے ایک دوست کی بہن کو اپنی دلہن بنا کر اپنے محل کو آباد کرنے لے آیا۔ زندگی اتنی خوبصورت ہو جائے گی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھار بھائیا جی کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لیتی تو وہ انہیں جھٹک دیتا۔ زندگی اب آگے ہی بڑھنی تھی اور بھائیا جی تو بہت پیچھے رہ گئے تھے سو انہیں یاد کرنے کا کیا فائدہ۔ ہاں البتہ وہ کبھی کبھار بھائیا جی کے لیے ختم دلا کر کھانا غریبوں میں ضرور بانٹ دیا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

بابر علی پیدا ہوا تو اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ زندگی اب مکمل ہو گئی تھی۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ بابر علی کے ڈھائی سال بعد عاصم علی نے آ کر اس کی خوشیوں کو چار چاند لگا دیے۔ زندگی سے اسے اب اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اس کے بچے پڑھ لکھ کر اپنی منزلوں تک پہنچ جائیں تو اس کی زندگی کا مقصد گویا پورا ہو جاتا۔

پہلا بیٹا ہونے کے ناتے بابر علی امجد علی کو زیادہ ہی پیارا تھا۔ اس کی چھٹی سالگرہ قریب آ رہی تھی او وہ اپنی بیوی کے ساتھ مل کر اس دن کو بہت دھوم دھام سے منانے کا پلان بنا رہا تھا۔ سب تیاریاں مکمل تھیں سالگرہ کے خوبصورت کارڈز بانٹے جا چکے تھے۔ لان کی ڈیکوریشن مکمل تھی۔ 15 پونڈ کیک کا آرڈر دیا جا چکا تھا کہ سالگرہ سے ایک دن پہلے بابر علی کو ڈائیریا ہو گیا۔ اور شدت کے ساتھ حملہ ہوا۔ ڈاکٹر کی ٹریٹمنٹ کے باوجود عین اپنی سالگرہ کی صبح وہ اس جہان فانی سے منہ موڑ گیا۔ امجد علی اور اس کی بیوی گویا پاگل سے ہو گئے۔ پہلی اولاد اور وہ بھی بیٹا، اس کا جتنا غم مناتے کم تھا مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ آہستہ آہستہ انہیں بھی صبر آتا گیا۔ پھر احمد علی اور عاصم علی نے ان کی توجہ کھینچ لی۔ اللہ پاک نے بابر علی کی جگہ احسن علی کو ان لوگوں کے پاس بھیج دیا۔ نیا کھلونا پا کر وہ بہل گئے۔

احمد علی کی چھٹی سالگرہ قریب آنے لگی تو امجد علی کو خوف سا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی انہونی ہونے جا رہی ہو۔

''شاید یہ بابر کے اچانک چلے جانے کی وجہ سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' اس نے سوچا کہ کہیں احمد کو بھی کچھ ہو نہ جائے......

سوچیں بلا روک ٹوک اس کے ذہن میں قبضہ جمائے جا رہی تھیں۔ وہ بھی تو چھ سال کا ہونے لگا ہے۔

اور امجد کا خوف بجا تھا عین اپنی سالگرہ کے دن کھیلتے ہوئے وہ پتھروں پر گرا تو اٹھ نہ سکا۔ امجد علی کی زندگی سے خوشیاں اب روٹھنے لگی تھیں زندگی کی خوبصورتی ماند پڑنے لگی تھی۔ دو بیٹے گنوا کر وہ مرجھا گیا تھا۔ اسے اب خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ دونوں بچے اپنی چھٹی سالگرہ والے دن دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ اس میں کیا راز تھا؟ اس کی سمجھ سے باہر تھا باقی دونوں بیٹوں کے معاملے میں اب وہ محتاط ہو گیا تھا۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ لاکھ احتیاط کے باوجود۔ وہ ہر دم اس کے ساتھ رہنے کے باوجود عاصم علی اس کے ہاتھوں میں اپنی زندگی کی بازی ہار گیا۔ اور یہ اس کی چھٹی سالگرہ تھی۔ وہ تو پاگل ہو گیا۔ کیا غلطی ہوئی ہے اس سے۔ اس کی اولاد چھ سال سے زیادہ جی نہیں پاتی۔ کیا گناہ کیا ہے اس نے جس کی اتنی کڑی سزا بھگت رہا ہے۔ یہ عاصم علی کی موت کا تیسرا دن تھا۔ وہ غم سے نڈھال اپنے کمرے میں پڑا بیٹوں کا سوگ منا رہا تھا۔ اس کی بیوی احسن کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھی، جب ایک سرسراتی کی آواز پر امجد علی چونک اٹھا۔ ''امجد...... علی۔''

امجد علی نے ادھر اُدھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

''کک...... کک...... کک...... کون......؟''

ام...... جد علی، ساتھ ہی ایک شبیہہ بھی واضح ہوئی۔

''بب...... بھائیا جی......''

'اسی دولت کے لیے مجھے مارا تھا تم نے۔'' بھائیا جی کے وجود سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''مم...... مم...... میں نے نہیں مارا تھا آپ کو......'' امجد علی نے اپنی صفائی پیش کی۔

''یہ تم اپنے آپ سے پوچھو کہ تم نے مجھے مارا تھا یا نہیں......'' بھائیا جی نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مل گئی دولت تمہیں۔ یہی چاہتے تھے نا۔ مگر اولاد کی دولت تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔ اپنی ساری دولت دے کر بھی تم اولاد کی دولت نہیں پا سکتے۔ تمہارا اور تمہاری اولاد کا ساتھ صرف چھ برس تک کا ہوگا...... اور یہ میرا نہیں قدرت کا فیصلہ ہے۔ قانون قدرت ہے۔''

''بھائیا جی...... بھائیا جی......'' امجد علی چلایا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

بہاول پورر کی گلیوں میں آج بھی ایک پاگل آدمی پھرتا ہے۔ جو صرف ایک ہی لفظ بولتا ہے۔

''بھائیا جی...... بھائیا جی۔''

کوئی اسے کھانا دے دیتا ہے تو کھا لیتا۔ ورنہ کئی کئی دن تک بھوکا رہتا ہے مگر اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ جس دولت کی خاطر اس نے بھائی کی جان لی تھی۔ وہ بھی کب کا منہ موڑ کر جا چکی ہے۔ اب صرف امجد علی ہے اور اس کی آواز۔

''بھائیا جی...... بھائیا جی......''

☆......☆......☆......☆



میٹھے پرندے

شفق شیکی

سیالکوٹ سے، ایک جھرکوں والی دیوار کی کتھا، جس پر میٹھے،
سنہرے پرندے میٹھی روٹی کھانے آتے تھے

پرانی گلی کی سب سے اوپری منزل بہت پر اسرار اور گہرے سناٹے میں گھری رہتی تھی۔ اوپری منزل کافی بڑی اور کھلی چھت پر مشتمل تھی اس کے مشرقی کونے میں ایک طرف گولائی میں بنا ہوا پرانا ٹوٹا ہوا خستہ حال کمرہ بنا ہوا ہے۔ جس کی طرف ایک دیوار ہی بالکل مکمل اور صحیح حالت میں موجود تھی۔ اس دیوار کو سب ''جھرکوں والی

دیوار" کہا کرتے تھے۔ اس جھروکوں والی دیوار عجیب پر اسراری دکھائی دیتی تھی۔ اس دیوار کا روغن دودھ کی طرح سفید اور کافی حد تک تازہ محسوس ہوتا تھا۔ اس دیوار میں پرانے طرز کے بہت سے جھروکے بنے ہوئے تھے۔

جھروکوں والی دیوار کے قریب جانے پر تیز روشنی کا نور کبھی کبھار محسوس ہوا کرتا تھا۔ اور اکثر خوشبو اور ٹھنڈک سی محسوس ہوتی تھی۔ اکثر ہی گرمی کے دنوں میں ہم سارے بچے بڑوں کی نظروں سے بچا کر...... کبھی گرم دوپہر میں تو کبھی کبھی ......شام میں ٹھنڈی ہوا کا مزہ لینے کے لیے سب سے اوپری منزل پر پہنچ جاتے تھے۔ جھروکوں والی دیوار کے بالکل اوپری سرے پر عجیب طرح کے پانچ یا چھ لمبائی کے رخ پر گچھے دار گھونسلے بنے ہوئے تھے نجانے کن خوبصورت پرندوں کے یہ گھونسلے تھے؟ حویلی کے تمام بڑے اس جھروکے والی دیوار کو بہت معتبر کہا کرتے تھے۔ مگر سب بڑے بعد مغرب، اس چوتھی منزل کے دروازے کو روزانہ بند کروا دیتے تھے۔ بڑے کہا کرتے تھے کہ کسی نیک روح کا بسیرا برسوں سے اس حویلی کی چوتھی منزل کی جھروکوں والی دیوار پر ہے۔

☆......☆......☆

بی اماں ہر جمعے کے دن، پرانے تیل والے چولہے پر بڑی سی لوہے والی کڑاہی رکھ کر بیسن کے ڈھیروں ڈھیر گلگلے نکالا کرتی تھیں اور ساتھ ہی دیگچے میں میوے والے میٹھے چاول بنایا کرتی تھیں۔ یوں ساری حویلی کی عید ہو جایا کرتی تھی۔......حویلی کے ہم سارے بچے اس کھلی حویلی کے باہر قطار میں کھڑے انتظار کیا کرتے تھے اور پھر لذت بھرے میوے والے چاول اور دو، دو گلگلے سب کے حصے میں آیا کرتے تھے۔ بی اماں سے بہت خاص عطر کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ضد کرنے پر مجھے اور ستارہ کو لگا دیا کرتی تھیں۔ پھر بی اماں رسوئی کی طرف جاتیں اور ایک کونے میں سے الگ الگ مٹی کی کنالی اٹھا لاتی تھیں اور کھانا ڈال کر مجھے اور ستارہ کو تھما دیتی تھیں اور ہم پر دم کر کے کہا کرتی تھیں۔ "میٹھے پرندے رزق کے انتظار میں ہوں گے۔ جاؤ شاباش جلدی سے کنالی اوپر جھروکے کی دیوار کے قریب دھر کر، دعا کر کے جلدی سے واپس اُتر آنا......"

میں اور ستارہ اکثر بی اماں سے بہت سے سوال جھروکوں والی دیوار کے متعلق کیا کرتے تھے۔

بی اماں! آپ نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں کہ وہ میٹھے پرندے کھانا کھانے کب آتے ہیں؟ اور آپ نے بھی خود دیکھا ہے ان کو کھانا کھاتے ہوئے۔"

"دیکھو! یہ جو میٹھے پرندے ہیں نا، یہ فجر کے وقت اپنا رزق کھانے آتے ہیں، اپنا رزق لیتے ہیں اور پھر کچھ ہی لمحوں میں ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ میں نے بہت پہلے ان میٹھے پرندوں کو دیکھا تھا مگر کبھی کبھار ہی یہ نظر آ پاتے ہیں۔ ان کا رنگ گہرا زرد ہوتا ہے اور یہ بگلے سے ملتے جلتے لگتے ہیں۔ یہ بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔"

☆......☆......☆

ماہ اگست کا مہینہ تھا۔ ہم سارے بچوں نے ڈھیر ساری ہرے رنگ کی پرچم والی جھنڈیاں خریدلی تھیں۔ بی اماں سے آٹے کی لئی (گوند) بھی تیار کروائی تھی۔ دو دن بعد 14 اگست کا دن تھا۔ ہم سب کا جوش و خروش دیکھنے لائق تھا۔ بڑے سے صحن میں موٹے دھاگے کی ڈوریاں چوڑائی کے رخ پہ لگا کر ہم سب کاغذ کی جھنڈیاں بڑے جوش میں لگانے میں محو تھے کہ اچانک ہی دادا حفیظ عبداللہ تشریف لائے......اور ہم سب جو بچے مزے سے صحن میں جھنڈیاں لگا رہے تھے......ان کی رعب دار آواز سے سب بچے سہم گئے۔ وہ سخت غصے میں تھے۔ ہم سب کو حکم دیا کہ تم سب نے جو یہ تماشا لگا رکھا ہے۔ یہ سب ابھی کہ ابھی یہاں سے ہٹاؤ اور یہ تماشے کہیں اور جا کر کرو......" ہم سب اتنا خوش و مگن تھے کہ ہمارا دادا صاحب کے غصے کی طرف دھیان ہی نہ رہا تھا...... خیر خوف سے جلدی جلدی سب کچھ سمیٹ کر ہم سب سے اوپری منزل پر جھروکے والی دیوار کے پاس آ گئے تھے۔ اور پھر ہم سب نے بڑے خوبصورت انداز میں کاغذی جھنڈیاں ڈوری میں پرو کر لگا دی تھیں۔ آخری ڈوری کا ایک سرا باندھنے کی جگہ نہ مل رہی تھی تو میں نے جھروکوں والی دیوار میں ڈوری کو جھروکے میں سے گزار کر ڈوری کا ایک سرا باندھ دیا۔ شام ہونے والی تھی کہ اچانک ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی اور ہلکا اندھیرا چھانے پر نیچے سے آوازیں پڑنے لگی تھیں۔

دروازہ بند کر کے ہم سب نیچے آ گئے تھے۔ اگلے روز شدید اور زوروں کی بارش برسی تھی۔ ہم سب رونے بیٹھ

گئے تھے کہ اب ہماری اتنی محنت سے لگائی گئیں جھنڈیاں خراب ہو کر بہہ جائیں گی۔

دوپہر کے قریب کہیں جا کر بارش تھمی تھی۔ ہم سارے بچے بھاگم بھاگ چوتھی منزل پر پہنچے...... اور یہ دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گئے تھے، کہ وہاں پر ایک جھنڈی بھی خراب نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ قریب جا کر دیکھنے پر اور بھی دنگ رہ گئے تھے کہ یہ خشک حالت میں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور ہم سب کو اور بھی زیادہ دھچکا لگا، جب ہم نے دیکھا کہ کاغذی جھنڈی والی ڈوری میں ایک، ایک روپے کا نوٹ بھی لگا ہوا تھا، جیسے کسی نے بڑی ہی صفائی کے ساتھ یہ ایک روپے کا نوٹ ان ڈوریوں میں ڈال دیا ہو...... ہم سب نے وہ نوٹ نکال لیے تھے اور نیچے آ کر یہ بات صرف بی اماں کو سرگوشی میں بتادی تھی۔

بی اماں نے ہماری بات سنی تو ایک لمحے میں کتنے ہی رنگ ان کے چہرے پر لہرا گئے تھے۔ اس کے پیچھے کوئی گہری بات یا راز چھپا ہو۔ میں بی اماں سے اس بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس وقت شاید مجھے مناسب الفاظ نہ مل سکے تھے۔ بی اماں نے ہمیں کہا کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا...... اور چپکے سے جا کر ان روپوں سے نکلے حلوائی کی دوکان سے کچھ میٹھا، کچھ نمکین کھالو۔"

☆......☆......☆

کچھ عرصے بعد ہم لڑکیوں نے بی اماں سے کوئی پر اسرار کہانی سنانے کا کہا تھا بی اماں پہلے سے کافی کمزور ہو چکی تھیں، خیر بی اماں مشکل سے ہی راضی ہوئی تھیں۔ ہم سب لڑکیوں نے گرم لحاف پر قبضہ جما لیا تھا۔ کمرے کے درمیان میں مٹی کی چلم میں، لکڑیاں تیزی سے آگ پکڑ رہی تھیں۔ اب بی اماں...... کی دھیمی دھیمی اور نرم آواز کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔

"یہ بات جو میں تم سب کو بتانے جا رہی ہوں یہ سچ بیتی ہے۔ یہ سچی کہانی ہماری حویلی سے جڑی ایک بہت پرانی یاد اور بات ہے۔ جس میں کچھ اسرار اور راز پوشیدہ تھے۔ اور جس کا تعلق کافی حد تک اوپری والی منزل اور جھروکے والی دیوار کی پراسراریت سے بھی جڑا ہے۔ تم لوگوں کو اس بارے میں پہلے میں نے خود ہی نہیں بتایا تھا۔ مگر اب تم لڑکیاں بالیاں سیانی ہو گئی ہو اسی لیے تم سب کو یہ بتا دینا چاہتی ہوں۔

"جب پاکستان بنا یہ تب کی بات ہے بھارت سے ہمارے ابا کے چند رشتہ دار، بڑی مشکلات اور مصائب اٹھا کر پاکستان کی سرزمین تک پہنچے تھے۔ ہمارے ابا، دادا تو پہلے سے ہی پاکستان میں تھے۔ جو بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے۔ ان رشتہ داروں میں ایک خاندان حاجی وحید غنی کا بھی تھا۔ یہ دادا صاحب کے قریب کے رشتے داروں سے بھی بڑھ کر تھے۔

یہاں اس جھروکوں والی حویلی نے کھل کر تمام ہجرت کرنے والے ان رشتے داروں کا استقبال کیا۔ حاجی وحید غنی صاحب کے خاندان کے ساتھ ان کی پرانی ملازمہ کملا بھی تھی۔ جو کہ مذہب کے حوالے سے ہندو تھی۔ مگر بڑی ہی اچھی عورت تھی۔ اس کے بڑے بچے تو وہیں بھارت میں ہی فسادات کی نذر ہو گئے تھے مگر اس کی ایک چھوٹی بچی 'بندیا' تھی جو میری ہی عمر کے آس پاس کی ہوگی۔ کملا مائی غنی صاحب کے خاندان اور ان کے بچوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور اس نے خود یہاں پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ شروع ہی سے اس خاندان کے ساتھ رہ رہی تھی، اس لیے وہ اب اس خاندان کو چھوڑنا نہ چاہتی تھی جس نے ہمیشہ کملا کو ہندو ہونے سے پہلے انسان اور گھر کا ایک فرد ہی سمجھا تھا۔

میں اور حویلی کے تمام بچے ان دنوں فجر کی نماز کے بعد، مسجد میں سیپارہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ ہم سارے بچے اکٹھے ہو کر، قریبی مسجد میں اپنا اپنا پارہ لے کر حویلی سے ایک ساتھ نکلتے تھے اور واپس آ کر سبق دہراتے تھے۔

ایک روز ہماری اسکول کی استانی نے پہلے چار کلمے یاد کر کے آنے کو کہا۔ تمہارے دادا حفیظ عبداللہ ہم تمام بچوں سے کچھ بڑے تھے۔ وہ رعب ڈال کر ہم سارے بچوں کا سبق سنا کرتے تھے۔

وہ مجھ سے بولے۔ "چلو سب سے پہلے تم چار کلمے سناؤ۔ جلدی کرو۔" میں نے پہلے تین کلمے جلدی سے سنا دیے مگر چوتھے کلمے پر اٹک گئی تو وہ مجھ سے بولے۔ "چلو کونے میں جا کر اچھے سے یاد کر کے کچھ دیر بعد مجھے سنا دینا۔ بالکل اچھے سے یاد کرنا۔"

میں کچھ ڈر گئی اور کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر چوتھا کلمہ جلدی جلدی یاد کرنے لگی۔ اتنے میں بندیا میرے قریب آئی اور مجھ سے بولی۔

"چھوٹی باجی آپ یہ جو ایک پاک قاعدہ پڑھتی ہیں

نا۔۔ میں نے کل چھپ کر دیکھا تھا۔ مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی یہ پڑھوں گی۔ آپ اماں کو مت بتانا، وہ مجھے مارے گی۔ آپ یہ یاد کرتی ہیں نا اس کو کلمہ کہتے ہیں نا؟

ہا.....ہاں! میں تو بندیا کی باتیں سن کر گنگ سی رہ گئی تھی۔

''مجھے یہ پاک قاعدہ پڑھنا نہیں آتا۔ آپ چھوٹی باجی بہت اچھی ہو۔ آپ مجھے سکھادو گی نا؟'' ہاں ضرور...... میں تمہیں سکھاؤں گی مگر۔ میں کچھ سوچ میں پڑ گئی تھی چونکہ بڑوں اور بزرگوں کا خوف اور ڈانٹ کا ڈر بھی غالب آ رہا تھا۔ ''اچھا میں تمہیں کل بتاؤں گی اس بارے میں۔''

☆......☆......☆

اگلے روز ہم سارے بچے اوپر کی چوتھی منزل پر جھروکے والی دیوار کے ساتھ ہی کوئی کھیل کھیلنے میں لگے ہوئے تھے۔ تو بندیا میرے قریب آئی اور میرے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ وہ کلمہ سکھانے کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں اس دیوار کے پاس بیٹھ کر میں تمہیں تھوڑا سا کلمہ سکھا دیتی ہوں لیکن میں تمہیں جو کلمہ سکھاؤں گی، وہ کل تم مجھے سناؤ گی ٹھیک!'' میں نے بندیا سے کہا۔

''ہاں چھوٹی باجی!'' میں نے اسے ابھی پہلے کلمے کا پہلا ہی حصہ سنایا تھا کہ نیچے سے میرے چھوٹے بہن بھائی آگئے۔ وہ مجھے آوازیں دے رہے تھے۔ میں اور بندیا یک دم سہم گئیں اور ہم دونوں باہر آ گئی تھیں۔

پھر کافی دنوں تک میرے اور بندیا کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز سہ پہر کے وقت میں یونہی اوپر کی طرف آئی جب اوپر آئی تو میں نے بندیا کو جھروکے والی دیوار کے بالکل قریب بیٹھے دیکھا۔ بندیا کا رخ دوسری طرف تھا اور وہ جھروکے والی دیوار کے نیچے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی اس کا ایک ہاتھ دیوار کے اوپر تھا اور وہ مسلسل ہل رہی تھی جیسے کوئی اپنا سبق یاد کرتا ہے۔

''بندیا'' میں نے قدرے دور سے ہی اسے آواز دے کر بلایا تھا۔ بندیا یک دم بری طرح چونک گئی تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں جلدی سے بندیا کے قریب آئی۔ وہ بہت زیادہ خوش لگ رہی تھی۔

''چھوٹی باجی! میں آپ کو کلمے والا سبق سنا دوں۔ میں نے یاد کرلیا ہے۔''

''کیا؟ تم نے یاد بھی کرلیا...... مگر؟'' مجھے کافی حیرت ہو رہی تھی۔ ''اچھا خیر چلو تم مجھے سنا دو۔'' میں بندیا کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''چھوٹی باجی پہلا کلمہ میں نے مکمل یاد کرلیا ہے۔'' یہ کہنے کے بعد بندیا نے بہت ادب واحترام کے ساتھ پہلا کلمہ مکمل سنا دیا۔ میں تو اپنی جگہ جم سی گئی تھی۔ ایک تو اس نے مکمل طور پہ پہلا کلمہ سنا دیا تھا، کوئی غلطی بھی نہ تھی اور اس کے علاوہ بہت اچھے لہجے میں سنایا تھا۔

''چھوٹی باجی! آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ پہلے کلمے کو کلمہ طیبہ کہتے ہیں۔'' اچھا یہ تو بتا دو چھوٹی باجی کہ میں نے آپ کو پورا کلمہ سنا دیا۔ آپ نے مجھے شاباش بھی نہیں دی۔''

''ہا.....ہاں......وہ تم نے......بالکل صحیح اور مکمل سنایا ہے۔'' مگر میں نے تو نہیں سکھایا تو پھر کس نے سکھایا ہے؟ میری حیرت کم نہیں ہو پا رہی تھی۔

''وہ چھوٹی باجی یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتی۔ میں پہلے اجازت لوں گی نا پھر آپ کو بتاؤں گی۔ مگر آپ کسی کو مت بتانا......یہ......کہ میں نے کلمہ سیکھا ہے۔ پھر...... مجھے سب ماریں گے۔'' بندیا کی آنکھوں میں نمی اور آواز دکھ سے رندھ گئی تھی۔

''ارے میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔'' میں نے جلدی سے کہا تھا۔ ''چلو......اٹھو......دیکھو شام ہو رہی ہے۔ اب ہم نیچے چلتے ہیں۔'' بندیا نے اپنے کپڑے جھاڑے اور پھر میرے ساتھ نیچے آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

پھر ایک روز بندیا مجھ سے بولی۔ ''چھوٹی باجی آج بڑی خوشی کا دن ہے چلو ج ہم نکڑ کے حلوائی سے گرم گرم جلیبی کھانے چلتے ہیں۔''

''کیوں آج کیا ہے بھلا اور میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''میرے پاس یہ جو ہاتھ میں سکے ہیں نا ہم ان سے ڈھیر ساری جلیبی اور امرتی کھائیں گے۔'' بندیا نے اپنی بند مٹھی کو جھٹ سے کھول کر میرے آگے کر دیا تھا۔

''ارے ...... اچھا...... مگر...... یہ سکے تم کو کس نے دیے ہیں......؟'' میں تعجب سے اس کی شکل تکنے لگی۔

''پہلے چھوٹی باجی آپ وعدہ کرو آپ یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گی۔'' اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

''نہیں میں نہیں بتاؤں گی۔'' میں قدرے ناراضگی سے کہا تھا۔

''اصل میں چھوٹی باجی مجھے یہ سکے اوپر جھروکوں والی دیوار میں رکھے ملے تھے۔ مگر میں نے ایسے ہی نہیں اٹھائے تھے وہ اوپر جھروکے والی دیوار پر جو بزرگ رہتے ہیں نا! ان سے اجازت لے کر ہی میں نے یہ سکے وہاں سے اٹھائے ہیں۔'' بندیا نے آہستہ آہستہ مجھے ساری بات بتادی۔ جو وہ شاید کافی دنوں سے بتانا چاہ رہی تھی۔

میں یہ سب سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔ اور چپ چاپ اس کی بات سن رہی تھی۔ وہ شاید کچھ اور بھی بتا رہی تھی۔

''اور...... وہ...... بزرگ جو ہیں نا! ان ہی نے مجھے کلمے کا سبق سکھایا تھا۔ وہ مجھے ٹھیک طرح سے دکھائی تو نہیں دیتے، مگر ان کی آواز سنائی دیتی ہے نا تو جیسے...... روشنی سی پھیلتی جاتی ہے۔ وہ مجھے حاجرہ نام سے پکار کر سبق سکھاتے ہیں۔ میں...... اب ان سے اور سبق بھی سیکھوں گی۔ مگر چھوٹی باجی آپ یہ سب کسی نہ بتانا...... پھر شاید...... میں کبھی بھی نہ سیکھ پاؤں گی...... اور پھر۔''

یہ ساری حقیقت جاننے کے بعد میرے تو پسینے ہی چھوٹ گئے تھے۔ مجھے یک دم اوپر والی منزل سے بہت زیادہ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ بندیا اور بھی کچھ بتا رہی تھی۔ مگر مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک دم ایسے لگا جیسے اندھیرا سا چھانے لگا ہے۔

☆......☆......☆

عجیب خوف کی وجہ سے مجھے کافی دنوں تک بخار نے گھیرے رکھا تھا۔ بندیا میرے پاس آئی۔ میرا احال وغیرہ پوچھا۔

''چھوٹی باجی...... آپ شاید میری وجہ سے ہی بیمار ہوگئی ہے نا! تو آپ بالکل فکر نہ کرو۔ میں نے آپ کے لیے خاص دعا کی ہے۔ اور...... آپ کو پتا ہے کہ...... میں نے خاص طور پر آپ کے لیے منت کا دیا جلایا تھا۔ جسے میں نے جھروکوں والی دیوار میں رکھ دیا تھا میں نے۔ بس اب آپ دیکھنا۔ دو تین دنوں میں ہی آپ کیسے ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' بندیا نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

''بندیا تم نے منت میں کیا دعا مانگی ہے۔'' میں نے نڈھال سے لہجے میں قدرے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

''نہ...... اماں کہتی ہے، جب منت کی دعا مانگتے ہیں تو اس کے پورے ہونے تک کسی کو نہیں بتاتے۔ ویسے بھی وہ بہت خاص دعا ہے۔ میں آپ کو کیسے بتا سکتی ہوں۔'' بندیا نے خلا میں تکتے ہوئے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا تھا وہ شاید کچھ چھپا رہی تھی۔

پھر وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی اور میں حیران سی رہ گئی...... بندیا...... یک دم سے مجھے بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جسے کوئی بڑی عمر کی نیک بڑھیا مجھ سے مخاطب ہے۔

☆......☆......☆

چند دنوں میں میری طبیعت کافی حد تک بہتر ہوگئی تھی۔ جمعے کے روز اماں نے سارے محلے میں نیاز بانٹی تھی۔ اسی رات کا نجانے کون سا پہر تھا، جب ہر طرف شور سا مچ گیا تھا۔ بندیا...... اس دنیا سے، اور ہم سب سے رشتہ توڑ کر عدم کی راہ کی مسافر بن گئی ہے۔'' ایک کہرام سا تھا جو ہر طرف مچا ہوا تھا۔

بندیا اکیلی ہی اتنی دور کی مسافت طے کر چلی گئی تھی ہم سب روتے ہی رہ گئے تھے۔ اس نے شاید اپنی زندگی کے بدلے میری زندگی کی منت مانگی تھی۔

آج اماں جی کو ہم سے بچھڑے ہوئے کئی زمانے بیت گئے مگر لگتا ہے...... وہ آج بھی ہم میں کہیں زندہ ہیں۔ ہم...... آج بھی اماں بی اور ان کی کملی بندیا کے لیے بہت دعائیں کرتے ہیں، انہیں یاد کرتے ہیں سب اچھے لوگوں کو...... اور...... آج...... بھی ہم کنالی میں کھانا بھر کر اوپر جھروکوں والی دیوار کے قریب رکھتے ہیں...... اماں بی کے مطابق وہاں میٹھے اور سنہری پرندے اپنا رزق لینے آتے ہیں...... مگر کئی سال بیت گئے ہیں آج تک یہ حسرت ہنوز تشنہ ہے شاید کہ کبھی میں میٹھے پرندوں کو دیکھ لوں۔

☆......☆......☆......☆





مسز نوید ہاشمی

کراچی کے ایک قدیم کالج میں ایک طالب علمہ کے ساتھ پیش آنے والا آسیبی قصہ



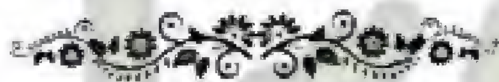
یوں تو جن، بھوت یا چڑیل کی کہانی پڑھنا، سننا دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن جب اپنے ہی ساتھ اس قسم کا پراسرار حادثہ یا واقعہ رونما ہوجائے اس کا انجانا خوف ساری زندگی پیچھا نہیں چھوڑتا۔

جب میری بیٹی کا داخلہ کالج میں ہوا تو گورنمنٹ کالج کی خستہ وشکستہ عمارت دیکھ کر میں مایوس وافسردہ ہوگئی۔ کیوں کہ میری بیٹی شروع ہی سے پرائیویٹ اسکول میں پڑھتی آئی تھی۔ جہاں مہنگی مہنگی فیسوں کے عوض تعلیمی ماحول بھی معیاری اور شاندار دیا جاتا ہے۔ طالب علم وہاں کے ماحول کا عادی ہوجاتا ہے۔ عائشہ کے والد کے انتقال کے بعد مالی مجبوری کی بناء پر گورنمنٹ کالج میں داخلہ کروایا۔

وہ پری میڈیکل کی طالبہ تھی۔ نہایت ذہین، محنتی اور خوبصورت۔ اس کا کالج کیا تھا ایک چھوٹے جنگل کا نظارا پیش کرتا تھا۔

ویران کمرے بڑے بڑے پیپل کے درخت، ویران کوریڈور، بڑے بڑے میدان ٹوٹے پھوٹے نل، گندے گندے واش رومز، غرض یہ کہ یہ عمارت آثار قدیمہ کا نمونہ نظر آتی تھی۔

کالج کا نقشہ دیکھ کر میری بیٹی رونے لگی۔ مما یہ



کیسے کالج میں میرا نام آ گیا ہے۔ میرا تو گریڈ اور مارکس بہت اچھے تھے۔"

میں نے کہا کہ بیٹا جو کالج گھر کے قریب ہوتا ہے وہاں ہی نام آتا ہے۔ بس تم کو اچھے کالج دیکھ کر نام ڈالنا چاہیے تھا۔" خیر مرتے کیا نہ کرتے۔

وہ کالج جانے لگی۔ صرف پریکٹیکل (Practical) والے دن جاتی تھی باقی سب کوچنگ سے پڑھ رہی تھی۔

ابھی عائشہ کو گئے ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ اس میں، میں نے عجیب سی تبدیلی دیکھی۔ عائشہ جو باتونی قسم کی لڑکی تھی۔ ہنس مکھ اور خوش اخلاق اب وہ چپ رہتی۔ کھانا کھانے بیٹھتی تو بیک وقت چار یا پانچ روٹیاں کھا جاتی، جب میری بیٹی عائشہ تو نازک سی، دبلی پتلی بچی تھی۔ ایک یا آدھی روٹی بھی مشکل سے کھاتی تھی، کہاں اب یہ حال کہ چار پانچ روٹیاں کھا جاتی۔

اب اکثر وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے رکھتی۔ اندر کمرے سے اس کی باتیں کرنے کی آواز آتی۔ جب میں کمرے میں جاتی تو وہ خاموش ہو جاتی۔ جب میں پوچھتی کہ عائشہ کس سے باتیں کر رہی تھی تو وہ بولتی۔

''ماما کسی سے نہیں۔ میں تو پڑھ رہی تھی۔ آپ ہر وقت C.I.D بنی میرے کمرے کے پاس کیوں گھومتی رہتی ہیں، جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔'' اس کے بے دھڑک بات کرنے کے انداز کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

اس دن میں نے اپنی کولیگ کو عائشہ کے کالج جانے اور اس کے رویے میں اچانک تبدیلی کا ذکر کیا تو وہ سوچ کر بولی۔

یار، باقی سب تو ٹھیک ہے، جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اسپیس (Space) چاہتے ہیں لیکن یہ چار پانچ روٹی کھانے والی بات ضرور پریشان کن ہے ،لہٰذا کسی عالم، مولوی وغیرہ کو دکھاؤ کہیں آسیب، جن کا سایہ کا اثر نہ ہو۔

میں اس کی بات سن کر ہنسنے لگی آج کے جدید زمانے میں آسیب، سایہ، جن کا کیا کام اپنی دوست سے تو کچھ نہیں کہا کہ کہیں برا نا مان جائے بہرحال میں فکرمند و پریشان گھر لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

ڈائننگ ٹیبل پر عائشہ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی اور وہ جس انداز سے کھا رہی تھی میں حیران تھی۔ جیسے کوئی جانور کھا رہا ہو۔ میں عائشہ کو غور سے دیکھنے لگی عائشہ نے مجھے دیکھا اور ہنسنے لگی۔

''ماما آپ اتنی حیرانی سے کیوں مجھے دیکھ رہی ہو۔ کیا کسی کو کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔''

ہاں عائشہ اتنی بدتمیزی سے کھاتے نہیں دیکھا خیر آج جمعہ تھا تم نے نماز پڑھی۔



وہ میری بات سنی ان سنی کرتی لاپروائی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس کی بدتمیزی پر بھی پریشان تھی۔

آج عائشہ ابھی تک سو کر نہیں اٹھی تھی۔ کالج جانے کا ٹائم ہونے والا تھا میں عائشہ کے کمرے میں اُسے اٹھانے گئی۔ تو عائشہ بستر پر سوتی ہوئی ملی۔

''عائشہ اٹھ جاؤ کالج جانے کا وقت ہو رہا ہے۔'' میں نے کمرہ صاف کرتے ہوئے عائشہ کو اٹھایا۔ وہ سوتے ہوئے اور پیاری لگ رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی بیٹی پر پیار آ گیا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

میں نے سوچا ضرور عائشہ رات کو سوتے سے اٹھی ہوگی اور واش روم یوز (USE) کیا ہوگا مگر نل بند کرنا بھول گئی ہوگی۔ میں واش روم میں نل بند کرنے کے لیے جانے لگی تو ابھی میں نے واش روم کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو عائشہ کو ٹوتھ برش کرتے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ پھر میں نے بیڈ پر نظر ڈالی تو بیڈ خالی تھا۔

ارے یہ کیا معاملہ ہے؟ ابھی تو عائشہ اپنے بستر پر تھی۔ اتنی جلدی واش روم میں کیسے پہنچی اور میں نے دیکھا تک نہیں۔

میں کانپتے قدموں کے ساتھ کچن میں آ گئی اور ناشتا بنانے لگی۔ عائشہ کھانے کی میز پر آ کر بیٹھ گئی تو میں نے ناشتا اس کے سامنے رکھا۔

عائشہ مجھے دیکھ کر مسکرائی میں بھی مسکرانے لگی اور پھر اپنا ناشتا لینے کچن میں گئی تو عائشہ کچن کی سلیپ پر بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ ایک عائشہ کھانے کی میز پر اور ایک کچن میں موجود تھی۔ الٰہی یہ کیا چکر ہو رہا ہے میرے ساتھ میں حیران و پریشان ہو گئی۔

آج صبح سے میرے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ یہ میرا وہم ہے کیا؟ کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا رات کو جب میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی کہ دروازہ کھول کر عائشہ میرے کمرے میں آ گئی۔

''مما مجھے نیند نہیں آ رہی پتا نہیں کیوں اور مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے ساتھ کوئی اور بھی موجود ہے۔'' میں نے اسے آیت الکرسی پڑھنے کو کہا وہ آیت الکرسی پڑھتے پڑھتے سو گئی میں پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی۔

عائشہ بے خبر سو گئی تھی کہ بے ساختہ میں نے اس کے ماتھے پر پیار کر لیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو دیکھا ایک بج رہا ہے۔ صبح آفس بھی جانا ہے۔ میں نے کتاب بند کی اور پھر ایک بار گھر کے دروازے اور کھڑکیاں وغیرہ چیک کرنے باہر گئی آج کل کے حالات کی وجہ سے تمام گھر اچھی طرح چیک کر کے سوتی تھی۔

سب چیزیں چیک کر کے میں نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھایا تو عائشہ کے کمرے پر نظر پڑی اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس کے کمرے کا دروازہ بند کرنے آگے بڑھی تو بیڈ پر عائشہ لیٹی نظر آئی۔ مگر عائشہ کو تو میں اپنے کمرے میں سوتا چھوڑ کر آئی تھی۔ میں جلدی سے اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا عائشہ میرے کمرے میں بستر پر سو رہی ہے۔

یہ کیسا اسرار تھا۔ ایک عائشہ میرے کمرے میں اور دوسرے کمرے میں اور ایک......

اب ڈر اور خوف کے مارے میرا برا حال تھا میں نے کمرے کے ایک کونے میں صوفے پر بیٹھ کر ساری رات گزار دی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا دونوں میں سے اصلی عائشہ کون ہے اور یہ سب کیا ہے؟، میں ڈر کے مارے وضو کرنے بھی نہیں گئی۔

ساری رات ٹکٹکی باندھے کبھی عائشہ کے بستر پر کبھی دروازے کو دیکھتی رہی کہ دروازہ سے دوسری عائشہ نمودار نہ ہو جائے۔ جو جو قرآنی آیات زبانی یاد تھیں وہ پڑھتی رہی۔ آخر کار صبح ہو گئی حسب معمول اب عائشہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

مما آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ سوئی کیوں نہیں ہیں۔ اس سے کیا کہتی۔

''چلیے مما میں کالج جانے کے لیے تیار ہونے جا رہی ہوں۔ آپ اچھا سا ناشتا بنا دیں۔'' وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں جانے لگی لہٰذا میں نے بے ساختہ کہا۔

''رکو عائشہ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ وہ ہنس کر بولی۔'' آپ پریشان مت ہوں مما، وہ چلی

گئی ہے۔ بے فکر ہو جایئے۔ وہ اب شام کو آئے گی۔ آیئے میرے ساتھ۔

"عائشہ کون بیٹا کس کی بات کر رہی ہو تم۔" عائشہ نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے خاموش کروا دیا عائشہ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو میں صاف دیکھ رہی تھی۔

عائشہ پہلے تم میری بات کا جواب دو کیا کہہ رہی تھیں تم عائشہ نے بے ساختہ میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے پھر وہ مجھ سے لپٹ کر بولی۔

"آج میں پراٹھا کھاؤں گی۔ کچن میں چلیے۔" میں خاموشی سے کچن میں کھانا بنانے لگی لیکن میرا دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ میں ماں تھی اتنا جان گئی تھی میری عائشہ کسی تکلیف، پریشانی میں مبتلا ہے۔ مگر کسی قسم کا دکھ درد تکلیف سمجھ نہیں آرہی تھی، نہ ہی عائشہ نے کوئی وضاحت کی۔ اسی لیے میں عائشہ کی طرف سے بے حد پریشان تھی پھر وہ کالج چلی گئی اور میں اپنے آفس پہنچی۔ میں آفس تو آگئی تھی لیکن میرا کام میں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا کہ اچانک عائشہ کے کالج سے فون آگیا۔ مجھے فوراً بلایا تھا۔

پریشان ہو کر میں کالج پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ عائشہ کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ انگارے جیسی اُسے رسی سے باندھ کر رکھا ہوا تھا مجھے دیکھ کر وہ غصے سے بولی ان لوگوں سے کہو کہ مجھے چھوڑ دیں ورنہ میں تمہاری عائشہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں خود وحشت سے بے ہوش ہوگئی۔

کافی دیر بعد جب ہوش میں آئی تو میری دوست جو کہ میرے ساتھ عائشہ کے کالج آئی تھی، اس نے فون کر کے میرے بھائی بھابی کو ساری صورت حال بتا کر وہیں بلوا لیا تھا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ کالج جا کر عائشہ روزانہ ایک ویران جگہ پیپل کے درخت کے پاس موجود اسٹور روم تھا، وہاں چلی جاتی تھی حالانکہ ٹیچرز نے منع بھی کیا تھا کہ وہاں مت جایا کرو مگر وہ باز نہ آئی۔ جب بھی کالج آتی تو اس اسٹور کے قریب چلی جاتی تھی۔ آج جب عائشہ کا ٹیچر نے پوچھا تو اسٹوڈنٹس نے بتایا کہ وہ اسٹور روم میں ہے تو ٹیچر نے چوکیدار کے ساتھ اسٹور روم میں جا کر دیکھا تو عائشہ ایک چھپکلی (Lizard) کی طرح دیوار پر موجود تھی یہ سب کچھ ٹیچر نہ دیکھ سکی اور خوف و دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد عائشہ انسانی روپ میں آگئی۔ بڑی مشکل سے چوکیدار اور میل (Male) ٹیچر نے عائشہ کو اسٹور سے نکالا۔ وہ کسی کے قابو میں نہیں آرہی تھی ابھی بھی اسے رسی سے باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔

میں اپنے بھائی کے ساتھ عائشہ کو گھر لے آئی۔ میرے بھائی اور دوست نے کسی بزرگ بابا کا پتا بتایا تھا مگر ابھی شام اور پوری رات باقی تھی۔

میرا بھائی اور دوست عائشہ سے بے حد خوفزدہ تھے۔ اس لیے وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر یہ کہہ کر چلے گئے صبح کسی بابا یا مولوی کو لے کر آجائیں گے۔ مگر بات میری بیٹی کی تھی میرا ڈر خوف سب ختم ہوگیا تھا۔ سب کے جانے کے بعد میں نے عائشہ سے اس سب کے بارے میں پوچھا عائشہ کچھ نہ بولی مگر جب اس کی آنکھ سے آنسو ٹپک کر گال پر آیا تو عائشہ نے اپنی بے بسی کا تمام حال مجھے بتا دیا۔

میں نے عائشہ کو کہا کہ نہا کر اور وضو کر کے آجاؤ بیٹا۔" وہ خاموشی سے نہانے چلی گئی۔ میں نے بھی وضو کیا اور میرے بھی خاموش آنسو متواتر آنکھوں سے روانی تھے جب میں بے دردی سے اپنے گالوں سے آنسو مٹا دیتی تو احساس ہوتا میں خود کتنی مجبور و بے بس ہوں۔ پھر نماز حاجات پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے خوب جی بھر کر پھوٹ پھوٹ کر روئی اور صدق دل سے دعا کی کہ یا اللہ میرا کون ہے تیرے سوا۔ میں کس کے پاس جاؤں میں کسی کو نہیں جانتی ہوں تو ہی میرا مالک و خالق ہے۔ پہلے بھی تُو نے ہی دور کی تھی، ہر مشکل میں تُو ہی کام آیا ہے۔ برے وقت میں میں نے تجھے ہی پکارا ہے۔ آج پھر وہ مشکل گھڑی آئی ہے۔ مجھے مایوس نہ کر میرے خدا میرا ساتھ دے کر میرا حوصلہ بڑھا۔ مجھے تجھ پر اعتماد ہے۔ اللہ میری مدد فرما۔" بس یہ الفاظ جو زیرِ لب شروع کیے تو ایک گھنٹہ یہی الفاظ

میرے منہ سے نکلتے رہے (اللہ میری مدد فرما) آنکھیں بند کیے یہی الفاظ بولے جا رہی تھی۔ آنسو بہے جا رہے تھے کہ اچانک...... قرآن پاک میری بند آنکھوں کے سامنے نظر آ گیا۔

پھر قرآن پاک کھلا اور آیت الکرسی سورۃ الناس، سورۃ الفلق اور سورۃ حشر کی آیات ایک کے بعد ایک کھلتی چلی گئیں یہ قرآنی آیات میں جاگتے ہوئے مگر آنکھیں بند کیے صدق دل سے تلاوت کر رہی تھی۔

ہم سب مسلمان ہیں یہ کہانی نہیں ایک سچا واقعہ ہے۔ شدت سے خدا سے لو لگانے پر ہماری خدا ضرور سنتا ہے۔ اس نے مجھے اشارہ دے دیا تھا کہ قرآن پاک جو میری کتاب تیرے پاس ہے وہ ہر پریشانی کا علاج بھی ہے تیری نجات کا ذریعہ بھی ہے اور تیری آخرت کا ذریعہ بھی ہے۔

میں نے آنکھیں کھولی تو عاعشہ میرے پاس آ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی بیٹی کے چہرے پر بے بسی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا دو رکعت نماز حاجات پڑھو۔ جب وہ پڑھ چکی تو میں نے اور اپنے اور اپنی بیٹی کے گرد تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کیا اور حصار کھینچا۔ پھر عائشہ سے پوچھا اب بے فکر ہو کر ہر بات بتا دو بیٹا۔ اب اللہ تعالی ہمارے ساتھ ہے اور تم اللہ تعالی کی پناہ میں آ چکی ہو' پہلے تو وہ مجھے دیکھنے لگی پھر میرے چہرے پر یقین اور اعتماد نے اسے حوصلہ دیا۔

وہ بولی کالج میں ایک انجان لڑکی روزانہ درخت کے نیچے بیٹھی ملتی اور وہ کسی کلاس کو اٹینڈ (Attend) نہیں کرتی تھی۔

میں نے اس سے دوستی کر لی کیوں کہ اس نے مجھے کہا تھا کہ مجھ سے دوستی کر لو۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ تو میں نے اس سے دوستی کر لی تھی۔

مما وہ ہر وقت میرے ساتھ رہنے لگی۔ اسکول Lab میں، گھر میں، ہر جگہ میں کمرے میں سونے کے لیے لیٹتی تو میرے ساتھ بستر پر سوتی نظر آتی۔ کھانے کی میز، باتھ روم غرض ہر جگہ اس نے میرا سایا بن کر رہنا شروع کر دیا۔ مجھ سے کہتی اپنا جسم مجھے دے دو مگر اب میں اس سے ڈرنے لگی ہوں۔ اس سے دور بھاگتی ہوں، تو مجھ پر غصہ کرتی ہے۔ اسے میرا جسم چاہیے اس کا جسم نہیں ہے نا۔

کالج میں جس نے پہلے چوکیدار کو ڈس لیا تھا۔ وہ سانپ نہیں تھا وہ یہ ہی لڑکی تھی۔ وہ لیب والی ٹیچر کو مینڈک کا پریکٹیکل کرنے پر جو کٹ لگا تھا اور وہ مر گئی وہ کٹ نہیں تھا مما اس لڑکی نے اپنے دانتوں سے کاٹا تھا۔

اس سڑک پر جو بڑا حادثہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس نے کیا تھا اسے خون اچھا لگتا ہے۔

آج جب میں آپ کو ساری بات بتا رہی ہوں تو اب یہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

میں نے وہ ساری قرآنی آیات اور سورتیں جو میں نے بند آنکھوں سے دیکھی تھیں عائشہ کو پڑھنے کا کہا اور خود بھی پڑھنا شروع کر دیں۔ نہ جانے کتنی دیر تک ہم پڑھتے رہے، پڑھتے رہے، صبح کی اذان کے ساتھ میری بند آنکھوں کے سامنے قرآن پاک بند ہوتا نظر آیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر تمام قرآنی آیات کا پانی عائشہ کو پلایا اور خود پیا پھر اس پانی کو گھر کے تمام کونوں میں چھڑکا اور پھر ہم دونوں نے نماز فجر ادا کی نماز کے بعد نفل نماز شکرانہ بھی ہم دونوں نے ادا کی۔ یقین جانیے اللہ کے کرم سے میری بیٹی عائشہ کو اس آسیب، جن یا بد روح سے نجات مل گئی۔

صبح جب میرا بھائی بھی ایک مولوی کو بلا لائے تو اس نے بتایا اس بچی پر تو کوئی اثر نہیں ہے۔"

میرا بھائی حیران رہ گیا اور میرے لب پہ مسکراہٹ تھی کہ خدا پر یقین کر کے دیکھو، وہ ضرور ہماری دعائیں سنتا اور ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔

پھر میں نے عائشہ کو اس ویران کھنڈر نما کالج سے نکال کر گھر میں ہی پڑھوائی کر کے امتحان دلوایا۔ ہاں اس کو پری میڈیکل کی جگہ کامرس لینا پڑی لیکن اس نے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ آج میری بیٹی عائشہ کی شادی ہو گئی ہے اور وہ خدا کے فضل سے ایک کامیاب خوشحال زندگی گزار رہی ہے احکام خداوندی اور نماز کی پابند ہے۔

☆......☆......☆

چلّہ ٹوٹ گیا......

مبارک علی شمسی

اسرار میں لپٹی اس کہانی کا کردار آج بھی عبرت لیے موجود ہے

دسمبر عیسوی سال کا آخری مہینہ تصور کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے جانے کے بعد زندگی کا ایک باب ختم ہو کر ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کی رومانوی اور تاریخی حیثیت کے ساتھ ساتھ کمپنیوں کی کلوزنگ بھی اسی ماہ عروج پر ہوتی ہے۔

جس کمپنی میں میں ملازمت کرتا ہوں وہاں بھی ان دنوں کلوزنگ کا کام زوروں پر ہے۔ میں کافی دنوں سے چھٹی مانگ رہا تھا۔ مگر باس ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ پچھلے کئی روز سے میں بازار جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ مگر جب بھی پروگرام بناتا آگے یہی مصروفیت آڑے آجاتی اور پروگرام دھرا کا دھرہ رہ جاتا۔

آخر کار ایک روز میں نے آفس کی تمام تر مصروفیات کو ترک کیا اور بازار جانے کی ٹھانی۔ کیوں کہ مجھے اپنے بچوں کے لیے سردیوں کے گرم کپڑے خریدنے تھے۔

میں گاڑی میں سوار ہو کر شہر حاصل پور پہنچا۔ گاڑی پارک کی اور شہر کی مصروف ترین تجارتی مرکز انار کلی بازار کا رخ کیا۔

ابھی میں بازار میں داخل ہو کر چند قدم آگے کی جانب بڑھا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک آواز نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔

''ہیلو شمسی۔''

میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر، خوبصورت مرد، بارونق و باریش چہرہ، لمبی لمبی سفید اور قدرے سنہری زلفیں، سر پر سیاہ پگڑی، ہاتھوں میں بڑی سی تسبیح، آنکھوں پر نظر کا چشمہ ٹکائے، فقیرانہ لباس میں ملبوس ایک اجنبی مخاطب تھا۔

''مزاج کیسے ہیں؟ لگتا ہے آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ آپ تو بالکل مجھے بھلا چکے ہیں۔'' دوسرے ہی لمحے اس نے جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا تعارف۔'' میں نے اس سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ وہ شخص مجھے اچھی طرح جانتا تھا مگر میں اسے کوئی منگتا سمجھ رہا تھا۔

''حیرت کی بات ہے آپ مجھے نہیں جانتے۔'' اس نے ایک دم چونک کر کہا۔

میں نے کہا کہ واقعی میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔''

خیر رسمی سلام دعا کے بعد ہم بیسمنٹ میں ایک چائے کے ہوٹل میں بیٹھ گئے اور وہاں چائے کا دور چلنے لگا۔

اس نے اپنا تعارف کروایا جس سے میں ششدر ہو کر رہ گیا تھا کہ میرا کلاس فیلو، میرے بچپن کا دوست

مفتی ارشد گاؤں کے نمبر دار چوہدری عاشق کا بیٹا جسے اکثر نئی کار اسکول میں چھوڑنے آتی تھی۔ کیوں کہ کار کا ہر نیا ماڈل ان کا شوق تھا۔ جگہ جگہ کروڑوں کے پلاٹ، پلازے اور شہر شہر کوٹھیاں رکھنے والے چوہدری کا بیٹا دربدر؟

دولت ان کے گھر کی لونڈی اور رکھیل، اندرون بیرون ملک بنک بیلنس رکھنے والے باپ کا بیٹا شہر کے گھروں سے دردر کی روٹیاں کھا کر زندگی بسر کر رہا تھا۔ زمین کے بجائے فضا میں سفر کرنے والے خاندان کا فرد بازاروں میں پیدل چلنے پر مجبور......

اسکول اور کالج لائف میں بڑے بڑے اسٹوروں سے بغیر مول تول قیمتی ملبوسات خریدنے والے شخص کو پھٹے پرانے لباس میں دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہو رہی تھی۔ اور میرا تجسس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

چائے پینے کے بعد میں نے اس کے حالات دریافت کیے کہ کن وجوہات نے اس کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا کیوں کہ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ دوبارہ اسکول میں آیا ہی نہیں تھا۔

اس کے بارے میں یہی خبریں گاؤں میں گردش کرتی رہیں کہ چھوٹا نواب بیرون ملک تعلیم کے حصول کی خاطر گیا ہوا ہے اور وہ شادی بھی وہیں کرے گا۔

26 سال کے بعد میں ملا تو اس کی حالت اور سادگی دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ میں نے جاننے کی بہت کوشش کی مگر وہ پس وپیش سے کام لینے لگا میرے اصرار کرنے پر بالآخر اس نے اپنی داستان سنانے پر آمادگی ظاہر کردی۔

☆......☆......☆

میرا نام مفتی ارشد ہے۔ میں منظور آباد گاؤں کا رہائشی ہوں۔ میں نے 16 نومبر 1986ء کی شام ایک شہنشاہ گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میرے والد محترم گاؤں کے نمبر دار اور علاقہ کے رئیس ہونے کی وجہ سے علاقہ میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ مجھ سے چھوٹے میرے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ جو کہ شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش وخرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ شروع سے والدین کے لاڈ پیار نے مجھے چڑچڑا اور دولت کی فراوانی نے مجھے مغرور بنا ڈالا تھا۔ پیسے کی فراوانی نے مجھے عیاش بھی بنا ڈالا اور میں زیور تعلیم سے



محروم ہو کر نشے کا عادی بن گیا۔ رہی سہی کسر میرے ہم عمر رئیس زادوں نے پوری کر دی کہ جنہوں نے مجھے چوری، ڈکیتی، راہزنی اور زنا جیسے برے کاموں پر لگا دیا تھا۔ یوں ہم سب مل کر ہر برائی ایک ساتھ اور ایک ہی نشست میں کرتے تھے۔

میں اپنی عیاشی اور دولت کے خمار میں دین سے بہت دور چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے نماز پڑھنا بھی ترک کر دی تھی۔ اور گانوں باجوں (موسیقی) کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی دولت اور طاقت کے بل بوتے پر میں غریبوں کی عزتوں پر ڈاکے ڈالتا رہتا تھے۔ غرض ہر برا کام مجھ میں پایا جاتا تھا۔ مظلوموں پر ظلم وستم میرا وطیرہ بن چکا تھا۔

اپنے حصے کی ساری جائیداد میں نے عیاشی میں ختم کر ڈالی، زمینیں فروخت کر ڈالی تھیں۔ کوٹھیاں اور دیگر قیمتی پلاٹ جوئے میں ہار بیٹھا تھا۔

آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں اپنے سر چھپانے کے لیے مکان بھی نہ رکھ پایا۔ اور اپنی تمام تر جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

میری حالت زار دیکھ کر سب عزیز اقارب اور دوست احباب، بہن، بھائی مجھ سے کنارا کر گئے۔

میں نے مکان کرائے پر لیا مگر تین ماہ گزر گئے میں نے مالک مکان کو ایک دھیلا تک نہ دیا۔ اس نے اگلے دن مجھے مکان سے بے دخل کر کے میرا بوریا بستر باہر پھینک دیا تھا۔

میں نے اپنا مختصر سامان اٹھایا تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ مگر مجبوراً کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ سو روڈ کے ساتھ فٹ پاتھ پر ڈیرہ جما لیا۔ اسی فٹ پاتھ پر ایک دست شناس نے اپنا ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا میرے پاس آجاؤ میں تمہیں روزانہ ضرورت کے لیے کچھ پیسے دیا کروں گا۔ بس رات کو میرے سامان اور میز وغیرہ کا خیال کرنا ہوگا۔ ۔مجبوری کے تحت میں نے اس دست شناس کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے اسی وقت اپنا بستر بوریا اس کے اڈے پر رکھ دیا۔

وہ سارا دن مجھ سے کام کرواتا اور شام کو جاتے ہوئے مجھے 50 روپے دے جاتا۔ جس سے میں کھانا کھاتا۔ کبھی سیر ہو کر کھا لیتا۔ کبھی بھوکا ہی سو جاتا کیوں کہ آج کل مہنگائی کے اس دور میں 50 روپے سے تین وقت پیٹ کا دوزخ کہاں بھرتا ہے۔

گزرا ہوا وقت بہت یاد آتا تھا اور اپنی حالت زار خود سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

بھوکا مرتے ہوئے میں نے خود عملیات کا کام شروع کر دیا۔ میرے اردگرد لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور اچھی خاصی آمدن ہونے لگی۔

میرے دل و دماغ میں عیاشی اور بے ایمانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں پھر اپنی پرانی حرکتیں دھرانے لگا۔

اسی دوران مجھے ایک چلہ کاٹنے کے لیے قدیمی قبرستان جانا پڑا۔ میں نے اس قبرستان میں ڈیرہ جما لیا۔ جس جگہ میں چلہ کرتا وہاں پر کسی بزرگ کا بسیرا تھا ۔صدیوں سے وہ اس جگہ پر رہائش پذیر تھا۔

ایک رات معمول کے مطابق عشاء کی نماز کے بعد قبرستان میں کھلے آسمان تلے چلہ کرنے میں مشغول تھا کہ اچانک مجھے اپنی طرف ایک کالا سا خوفناک قسم کا اژدھا آتا ہوا معلوم ہوا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اتنی دیر میں وہ میرے سامنے آیا اور پھن پھیلا کر بیٹھ گیا۔

اژدھا موٹا اتنا تھا کہ توبہ اور دس، بارہ فٹ لمبا تھا اور اس کے جسم پر کالے رنگ کے دھبے اسے مزید خطرناک بنا رہے تھے۔ جسے دیکھ کر خوف سے میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی اور ایک زوردار جھٹکے سے میں نیچے گر گیا اور میرا وہ خوفناک چلہ ٹوٹ چکا تھا۔

نیچے گرتے ہی مجھے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی اور اردگرد دھواں چھا گیا۔

کچھ دیر بعد دھواں چھٹا تو میں نے اٹھنے کی کوشش کی، اٹھ کر کھڑا ہوا تو میرے سامنے ایک بزرگ تشریف فرما تھا۔ انہوں نے کہا۔

''مفتی ارشد گھبراؤ مت۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ دراصل تمہارے باپ نے میرے ساتھ ایک اچھائی کی تھی۔ جس کا بدلہ میں آج چکانے آیا ہوں۔ وہ

بھلائی یہ ہے کہ انہوں نے قبرستان کے لیے ایک جگہ چھوڑ دی تھی۔ جس پر آج میرا بسیرا ہے۔ اور میں ایک عرصہ سے یہاں آباد ہوں۔

تم تو اپنی زندگی برے افعال کی نذر کر چکے ہو مگر اپنی عاقبت کو سنوار لو۔

کل تمہارے پاس اللہ کی ہر نعمت موجود تھی، جس کی تم نے قدر نہیں کی اور آج تم کھانے کے لیے اتنے پاپڑ بیل رہے ہو۔ اور جن چکروں میں تم پڑنا چاہتے ہو یہ تمہیں مزید گمراہی کی طرف لے جائیں گے۔ اور گناہوں کی دلدل میں غرق کر دیں گے۔

تم لوگوں کی عزتوں سے کھیلو گے۔ اور غریبوں پر ظلم زیادتیاں کرو گے۔ میری نصیحت مانو۔ زندگی انسان کو ایک ہی بار سنورنے کا چانس دیا کرتی ہے۔ تم یہ سب برے کام چھوڑ کر اللہ سے لو لگا لو۔ تمہارے پاس قرآن پاک ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے ایسے ویسے کام کرنے کی۔ قرآن میں موت کے سوا تمام بیماریوں کا حل موجود ہے۔ اور پانچ وقت کی نماز پڑھو تاکہ تمہیں دلی سکون میسر ہو اور یہ گندے تعویزوں کا دھندا چھوڑ دو۔

تم یہاں سے چلے جاؤ اور اللہ کا گھر آباد کرو اور اپنے سابقہ گناہوں کی توبہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔"

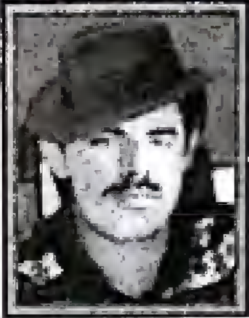
تب سے میں نے توبہ کی اور اس بزرگ کی نصیحت پر عمل کیا اور تمام غلط کام چھوڑ دیے۔ اب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے پاس گھر، مکان، ہر چیز اور ہر نعمت موجود ہے۔ اور میں دین کی طرف واپس لوٹ آیا ہوں۔"

"بزرگ صحیح کہتے ہیں کہ برے کاموں کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ بندہ اپنی عاقبت بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ اور اچھے کاموں کی وجہ سے دنیا بھی فتح و کامرانی حاصل ہوتی ہے اور دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی لوگ اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر مفتی ارشد اپنی راہ ہو لیا اور میں اس کی زندگی کے نشیب فراز اور قدرت کی مہربانی پر سبحان اللہ کہتا انار کلی بازار کی طرف مڑ گیا۔

☆......☆......☆......☆





ملک صفدر عباس اعوان



جہانیاں سے ایک ایسی پریم پہیلی جسے بُوجھنے والا خود امر ہو جاتا ہے

وہ قدیم بوسیدہ سی کھنڈر نما عمارت تھی، جس کی خستہ حالی کی داستان اس کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے بخوبی عیاں ہورہی تھی۔ اوبناش اس کھنڈر نما عمارت میں کھڑا حیرت کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ وہ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ ہر طرف ہی اندھیرا بکھرا ہوا تھا۔ سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا آکاش جس نے چاند کو گویا نگل ہی لیا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندھیرے کے ساتھ پُراسرار قسم کی خاموشی نے بھی سارے ماحول کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ اوبناش کو اس کھنڈر میں کھڑے ہوئے اپنی سانس کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ جو اس ہولناک ماحول اور پُراسرار خاموشی سے خوف زدہ اپنی جگہ پر سمٹا ہوا کھڑا تھا کہ اچانک ہی تیز گھنگروؤں کی جھنکار اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اور خاموشی کے جیسے سارے ہی قفل ٹوٹ گئے۔

گھنگروؤں کی تیز آواز کے ساتھ ہی اوبناش کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اندھیرے میں وہاں کھڑا وہ جگہ جانچنے لگا جہاں سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ مگر وہ اس آواز کا ٹھیک طور پر اندازہ نہیں لگا سکا۔ گھنگروؤں کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ یک دم ہی اس کو جیسے محسوس ہوا کہ آواز اس کے بالکل سامنے سے آرہی ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی یہ کوشش جلد ہی کامیاب ہوگئی۔ اس کو بالکل سامنے سفید لباس میں ایک دوشیزہ دکھائی دی۔ جس کے گھنے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے لیکن اس کا چہرہ نمایاں نہیں تھا۔ وہ اپنے پیروں میں گھنگرو باندھے ناچ رہی تھی۔ اس دوشیزہ کے پاؤں بڑی تیزی سے زمین پر تھرک رہے تھے۔

اوبناش کے لیے یہ سب کچھ سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ کھنڈر نما عمارت اور اس میں یہ پُراسرار سی سفید لباس والی دوشیزہ، جو ناچنے میں مگن تھی۔ اوبناش کو یہ منظر دیکھ کر اتنا خوف محسوس ہوا کہ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہوگیا۔

وہ تیزی کے ساتھ عمارت سے باہر کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ ناچتی دوشیزہ اپنی جگہ پر رک سی گئی۔

''کرشنا......!! میرے پاس آؤ کرشنا۔'' وہ پیچھے سے اس کو مسلسل کرشنا کہہ کر پکار رہی تھی۔ مگر اوبناش نے ایک لمحے کو بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس پر طاری ہوا خوف اس کو تیزی سے آگے ہی آگے بھگا لیے جارہا تھا کہ ایک مندر کو دیکھ کر اس کے پاؤں بے اختیار رک سے گئے۔

وہ کالی دیوی کا مندر تھا۔ دیو ہیکل کالی دیوی کی

مورتی کے چرنوں میں اس نے دو انسانی وجود پڑے ہوئے دیکھے۔ خون سے لت پت وہ دونوں انسانی وجود جس میں ایک عورت دوسرا مرد تھا۔ وہ لرزتے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کالی دیوی کی مورتی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ دونوں لاشوں کو بغور دیکھنے لگا۔ مرد کی لاش نیچے فرش پر پڑی ہوئی تھی اور عورت اوندھے منہ اس مرد کے سینے پر تھی۔ عورت کا چہرہ اوندھا ہونے کی وجہ سے نظر آنے سے قاصر تھا۔ مگر اویناش کی اس مرد کے چہرے پر نظر پڑی۔

او بھگوان! اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ منظر ایسا تھا کہ اس کا دل اس کے حلق میں اٹک گیا۔ وہ لاش کسی اور کی نہیں تھی بلکہ خود اس کی اپنی تھی۔ اپنی آنکھوں کے



سامنے وہ خود کو مرے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اوبناش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، یہ سب اس کے لیے اتنا ہولناک تھا کہ وہ یہ سب برداشت نہ کر سکا۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

اور...... اور...... اور...... وہ بڑبڑا کر نیند سے بیدار ہو گیا اور بستر سے اٹھ بیٹھا۔ پہلے پہل تو اس کو کوئی ہوش ہی نہ رہا کہ آخر وہ ہے کہاں۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر اور حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ کافی دیر تک وہ یونہی بستر پر بیٹھا اپنے آپ سے جنگ لڑنے میں مصروف رہا۔ وہ ایک ماہ میں نہ جانے کتنی بار یہی سپنا بار بار دیکھتا۔ جس کو اپنے ماتا پتا کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ جب سے اس نے آنکھ کھولی اپنے آپ کو اناتھ آشرم میں پایا۔ اِس جیسے کئی اور بچے وہاں پرورش پا رہے تھے۔ وہ بہت کم سم اور چپ چاپ رہنے والا بچہ تھا۔ اِس نے جلد ہی اناتھ آشرم کو اپنا گھر سمجھ لیا۔ وہیں بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے، تعلیم حاصل کرتے، سمے نے اس سے اس کا بچپن چھین کر اس کے ہاتھوں میں جوانی کی ڈور تھما دی۔ اس نے اناتھ آشرم کو خیر باد کہہ دیا۔ تعلیم سے گہری وابستگی کی وجہ سے وہ اسکول کے بعد اب کالج میں پڑھنے لگا تھا۔ کالج کے ہوسٹل میں ایک کمرہ بھی رہنے کے لیے مل گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔

زندگی کی گاڑی کو دھکا دینے کے لیے اس کو شہر میں کافی دوڑ بھاگ کے بعد اخبار کے دفتر میں ایک معمولی سی نوکری مل ہی گئی۔ جہاں سے اس کو اتنے روپے مل جاتے کہ وہ اپنا اور اپنی تعلیم کا خرچ با آسانی اٹھا سکتا تھا۔ پھر اس اکیلے تنہا شخص کا خرچ ہی آخر کتنا تھا۔ اس کا تو بچپن سے ہی کوئی اپنا اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ تنہا رہتا اور تنہائی اس کا مقدر تھی۔

اس کی یہ بے کیف، بے مزہ زندگی شاید اسی طرح گزر جاتی اگر پونم کسی بہار کے تازہ جھونکے کی طرح اس کی خزاں رسید زندگی میں دستک نہ دیتی۔ یہ پونم ہی تھی جس کی وجہ سے اوبناش کو اپنا آپ اچھا لگنے لگا تھا۔

پونم دہلی سے دور گاؤں رام گڑھ کے مکھیا کی بیٹی تھی۔ جو شہر میں اوبناش کے کالج میں ہی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ کالج کے ہی ہوسٹل میں رہتی تھی۔ پونم ہنس مکھ سندر سی لڑکی تھی۔

شروع شروع میں وہ پونم سے کترا تا رہا مگر پونم کے پیار کے آگے آخر کار اس کو ہار ماننا ہی پڑی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ پونم کو پا کر اس کو احساس ہوا کہ زندگی آخر کتنی سندر، کتنی قیمتی شے ہے۔ مگر اچانک اس کی زندگی میں ایک ایسا بھونچال آیا کہ وہ اپنا آپ ہی کھو بیٹھا۔ اس کے من میں بے سکونی نے ڈیرے جما لیے۔ وہ سپنا کسی عفریت کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔

پونم بھی اس کے اس عجیب و غریب سپنے سے کافی حیران و پریشان ہوئی تھی۔ وہ اس کی دلجوئی کرتی۔ اس کو شانت رکھنے کے لیے تسلیاں دیتی، مگر یہ سب کرنا بے سود تھا۔

............☆☆............

وہ اگلی صبح کالج پہنچا تو رات والی ساری پریشانی اس کے چہرے پر صاف عیاں تھی۔ پونم ایک لمحے میں ہی ساری صورتِ حال بھانپ گئی۔

”اوبناش رات پھر تم نے وہی سپنا دیکھا ہے ناں“ پونم اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ پونم کی بات سن کر اوبناش تھوڑا حیران ضرور ہوا کہ اس کو کیسے خبر لگ گئی۔ اس نے تو ابھی کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

”ہاں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”مگر پونم تم نے کیسے جان لیا؟“ اس کی بات پر پونم کھلکھلا کر ہنس دی۔

”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے جناب“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”تمہاری پریشانی مجھ سے چھپی ہوئی تھوڑی ہے۔“

مگر اوبناش کچھ بولا نہیں۔ وہ چپ سا بس کھڑا رہ گیا۔

”کیوں کیا ہوا۔ چپ کیوں ہو گئے۔“ پونم نے اس کی طرف دیکھا۔

”اب جب زندگی معمول پر آنے لگی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اب میری زندگی مجھ پر مہربان ہو رہی ہے۔ دکھ کی رات کا انت ہونے والا ہے اور سکھ کا سورج طلوع ہو جائے گا۔ مگر...... پونم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ لگتا ہے میرے دکھ، میری پریشانیاں میرے جیون کے ساتھ ہی ہیں اور مرتے دم تک ساتھ رہیں گے۔“ اوبناش غم

زدہ لہجے میں گویا ہوا۔
"کیوں سوچتے ہو ایسا اویناش۔ بھگوان کے واسطے ایسا نہ سوچو۔ ایک دن آئے گا جب تمہاری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔" پونم نے اس کو ڈھارس بندھائی۔ "میرا وشواس کرو۔"
مگر اویناش نے جیسے اس کی بات سنی اَن سنی کردی۔
"پونم تمہیں پتا ہے۔ وہ کھنڈر میں موجود لڑکی مجھے پکارتی ہے۔ مجھے...... مجھے کرشنا کہہ کر۔ نہ جانے کیوں۔ مجھے اپنے پاس بلانا چاہتی ہے۔ پونم میری بات کا جواب دو ناں۔" وہ پونم کی طرف دیکھنے لگا۔ "آخر وہ کیوں مجھے کرشنا سمجھتی ہے۔ کیوں کرشنا پکارتی ہے۔" اویناش کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ تو پونم بھی تڑپ کر رہ گئی۔
"میں نے پہلے بھی کہا ہے اویناش کیوں سوچتے ہو ایسا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی پریشان کرتے ہو۔ مجھے اب تمہاری بہت چنتا ہونے لگی ہے۔ اویناش یہ سپنے بس سپنے ہی ہوتے ہیں۔ حقیقت سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ بات تمہیں اب سمجھ جانی چاہیے۔ تم نے خواہ مخواہ اس سپنے کو اپنے ذہن پر سوار کرلیا ہے۔ اس لیے ایک جیسا سپنا ہر بار دیکھتے ہو۔" پونم نے اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ اویناش نے ایک نظر پونم کی طرف دیکھا، مگر وہ بولا کچھ نہیں۔
"اویناش تم کو ایک بار سائیکاٹرسٹ کے پاس جانا چاہیے۔ مناسب علاج سے تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔" پونم کی اس بات پر اویناش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"تو گویا تم صاف لفظوں میں یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں ایک دماغی مریض ہوں اور مجھے اپنے دماغ کے علاج کی ضرورت ہے۔ یہی مطلب ہے ناں تمہارا۔" اویناش کے لہجے میں تلخی سی آگئی تھی۔
"اوہو۔ میرا مطلب کہنے کا یہ نہیں تھا۔ میں نے تو صرف ایک بات کہی تھی۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو اویناش۔" پونم بولی۔
"مگر...... آخر تم کیوں......" وہ بے بسی سے بولا۔
"بس کوئی اور اگر مگر نہیں۔ تو یہ طے ہوا کہ ہم آج ہی سائیکاٹرسٹ کے پاس جا رہے ہیں۔" پونم مسکرا کے بولی۔ تو آخر کار اویناش کو بھی ہار ماننا پڑی۔

............☆☆............

کالج سے فارغ ہونے کے بعد پونم اس کو شہر کے مشہور سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گئی۔
"اچھا نوجوان یہ بتاؤ کہ سپنے میں جو جگہ تم دیکھتے ہو، کیا پہلے تم وہاں گئے ہو۔ پہلے وہ جگہ دیکھی ہے۔ میرا مطلب ہے حقیقت میں۔"
"نہیں۔ سپنے کے علاوہ میں کبھی اس جگہ نہیں گیا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون سی جگہ ہے۔"
"اچھی طرح سوچ لو نوجوان، کبھی بچپن میں جانے کا اتفاق ہوا ہو۔"
"میں ڈاکٹر صاحب آپ کو سوچ سمجھ کر ہی جواب دے رہا ہوں۔" اویناش کا لہجہ پختہ تھا۔ "میرا بچپن اس شہر کے علاوہ کہیں اور نہیں گزرا۔"
"اچھا، چلو یہ بات تو صاف ہوگئی۔" ڈاکٹر گپتا نے ہنکار بھری۔ "اب آتے ہیں اس سفید لباس میں ملبوس لڑکی کی طرف۔ جو تمہیں کرشنا کہہ کر پکارتی ہے۔ شاید تم اس سے کبھی ملے ہو۔ اس کو جانتے ہو۔"
"نہیں، میں اب تک اس کو نہیں پہچان پایا۔ سپنے میں اس لڑکی کا چہرہ واضح نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ لڑکی کون ہے۔ بس وہ مجھے کرشنا کرشنا کہہ کر بلاتی ہے۔"
"لیکن تمہارا نام تو اویناش ہے ناں۔" ڈاکٹر گپتا نے اس کی طرف دیکھا۔
"ہاں۔" اویناش آہستگی سے بولا۔
"اور تمہارا کہنا ہے کہ تم اپنے سپنے میں خود کو مرا ہوا دیکھتے ہو۔ کیا واقعی......؟"
"ہاں، یہ میں کیسے بھول سکتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ اپنے آپ کو بھلا کوئی کیوں نہیں پہچانے گا۔" اویناش عجیب بے حسی بھرے انداز میں بولا۔
ڈاکٹر گپتا نے تین چار سوالات مزید اس سے پوچھے اور اس کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ پونم وہیں بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر گپتا اس سے مخاطب ہوا۔
"دیکھیں زیادہ چنتا کی کوئی بات نہیں ہے۔ جہاں تک اب تک میری سمجھ میں بات آئی ہے۔ میری تشخیص کے مطابق کوئی ایسا اندوہناک واقعہ اس کے ذہن میں

سمایا ہوا ہے۔ بچپن کی کوئی ایسی بات، کوئی بھولی بسری یاد جواب تو شاید اس کو یاد نہیں مگر اس کے ماضی سے اس کا کوئی سمبندھ ضرور ہے۔ جواب اس کے ماضی سے کھل کر..... آپ سمجھ رہی ہیں ناں میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔"

"جی، جی۔ ڈاکٹر صاحب۔" پونم جلدی سے بولی۔

"میں کچھ ادویات لکھ کر دے رہا ہوں۔ باقاعدگی سے کھلائیں۔ امید کرتا ہوں افاقہ ہوگا۔ نیند کی بھی کچھ میڈیسن ہیں۔ ذہنی دباؤ انتشار میں واضح کمی واقع ہوگی اور ہاں ماحول تبدیل کرنے سے بھی خاطر خواہ فائدہ ہوسکتا ہے۔"

پونم کمرے سے باہر نکلی۔ وہاں اویناش کھڑا اس کا بے صبری سے منتظر تھا۔ "کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر! کوئی بات بتائی یا وہ بھی تمہاری طرح مجھے پاگل ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔" اویناش جلدی سے اُس سے گویا ہوا۔

"اویناش شانت رہو۔ ایسا کیوں سوچتے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"اچھا کھودا پہاڑ نکلا چوہا......" اویناش طنز بھرے لہجے میں بولا۔ "پونم آئندہ تم مجھے یہاں نہیں لاؤ گی۔ مجھے تو یہ ڈاکٹر خود پاگل معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کا کیا خاک علاج کرے گا۔" وہ زچ ہو کر بولا تو پونم بے اختیار ہنس دی۔ اویناش نے اس کو غصے سے گھورا۔

"اب تم بھی مجھ پر ہنس رہی ہو۔"

☆☆

زندگی جوں کی توں رواں دواں رہی۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ان کو پتا ہی نا چلا کہ ان کے فائنل پیپرز بھی آگئے۔ پیپرز دینے کا مرحلہ ختم ہوا تو وہ دن بھی آن موجود ہوا۔ جب ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا۔ پونم اگر بڑی روہانسی تھی تو اویناش بھی پونم کی دوری کو لے کر بڑا آبدیدہ تھا۔

"مجھے تمہاری بڑی چنتا رہے گی۔"

اویناش بھی خاصا غم زدہ تھا۔

"اگر ایسی بات ہے تو وعدہ کرو میں جو کہوں گی وہ تم کو ماننا پڑے گا۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو کہ پہلے میں اپنی مرضی کرتا ہوں۔" اس کی بات پر روہانسی پونم بھی مسکرا دی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم میری بات مانو گے۔"

"ہاں۔ کہہ تو رہا ہوں۔" اویناش بولا۔

"تو تم میرے ساتھ گاؤں جا رہے ہو۔" پونم نے اپنے من کی بات بیان کر دی۔

"ارے تمہارے گاؤں...... وہ کیوں بھلا؟"

اس کے دو کارن ہیں۔ ایک کارن تو یہ ہے کہ ایک جگہ رہ رہ کر تم بہت اَپ سیٹ سے ہو گے۔ ماحول تبدیل ہوگا تو تمہاری سوچ اور تمہارے ذہن پر اچھا اثر پڑے گا۔ گھوم پھر لو گے۔ کچھ انجوائے ہو جائے گا۔ اور دوسرا کارن جو خاص ہے وہ یہ کہ اس بہانے میرے ماتا پتا سے بھی مل لو گے، آخر کار کل کو تم نے ان کا داماد بننا ہے۔" پونم شرما کر بولی۔ اس کے چہرے پر سرخی سی آگئی۔

"وہ تمہیں بھی دیکھ لیں گے۔"

"لیکن پونم میرا یوں تمہارے ساتھ جانا مناسب ہوگا۔ کہیں تمہارے ماتا پتا کو میرا آنا ناگوار نہ گزرے۔"

"ارے کیوں ان کو بھلا ناگوار کیوں گزرے گا۔ تم اپنے من سے خواہ مخواہ کا یہ وہم تو نکال ہی ڈالو۔"

"مگر پھر بھی پونم......!" اویناش اس کو سمجھانا چاہتا تھا۔

"ارے چند دنوں کی تو بات ہے، پھر اویناش تم واپس آجانا۔" پونم ہمیشہ کی طرح آج بھی بضد تھی۔

"لیکن پھر دوبارہ بھی تمہیں گاؤں واپس آنا پڑے گا۔ مجھے اپنے ساتھ جیون بھر کے لیے......"

پونم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اویناش کو بھی ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جو ابھی تک باہر ہی بیگ لیے کھڑا تھا۔ اس کے اشارے پر اویناش بھی جلدی سے پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ لڑکا کون ہے۔ کیوں ساتھ جا رہا ہے۔ اس جیسے کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرے۔ مگر وہ اپنے مالک کی بیٹی سے یہ سب پوچھنے کا ادھیکار نہیں رکھتا تھا، وہ چپ رہا۔ اس نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کو منزل مقصود کی طرف گامزن کر دیا۔

جلد ہی آکاش کو گھنے سیاہ بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اچانک ہی موسم بڑا خراب ہو گیا تھا۔ گرجتے سیاہ

بادل برسنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ اویناش نے گاڑی کے شیشے سے باہر جھانکا۔

''بہت طوفانی بارش آنے کا امکان نظر آرہا ہے۔''

''گاڑی تیز چلاؤ کاکا ہمیں بارش آنے سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہیے۔ غضب کا طوفان ہے۔'' پونم کے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی کو مزید تیز کر دیا۔

جلد ہی گاڑی گاؤں کی حدود میں پہنچ چکی تھی۔ آگے سڑک کچی تھی، ڈرائیور نے احتیاط برتتے ہوئے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔

گاؤں کی حدود شروع ہوئی تو ایک ٹھنڈی یخ ہوا کا جھونکا گاڑی کے اندر بیٹھے اویناش سے ٹکرایا، ساتھ ہی اس کے کانوں میں مانوس سی آواز ٹکرائی، ''کرشنا......!'' اویناش کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔ گاڑی کے شیشے پوری طرح بند تھے۔ ہوا کے جھونکے کا اندر آنا کسی صورت بھی نہیں بنتا تھا۔ اویناش کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار سے ہو گئے۔ پونم سے اس کی یہ حالت چھپی نہ رہ سکی۔

''خیریت تو ہے اویناش کیا ہوا......؟''

''نہیں۔ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔'' وہ ہولے سے بولا۔ پونم کو یہ بتا کر وہ دوبارہ باور نہیں کرانا چاہتا تھا کہ اب بھی اس کی حالت پہلے سے نہیں بدلی۔

گاؤں کی کچی سڑک پر چلتی ہوئی گاڑی جلد ہی ان کو حویلی تک لے آئی۔ اچانک بادل اتنا زور سے گرجا کہ گاڑی سے نکلتے ہوئے پونم اور اویناش دونوں کانپ اٹھے۔ گرجتے بادل کے ساتھ ہی تیز دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر کر جلدی سے حویلی میں داخل ہو گئے۔ جہاں پونم کا پتا مکھیا وجے کمار اور ماتا کملا دیوی اس کی راہ تک رہے تھے۔

مکھیا وجے کمار ادھیڑ عمر کا رعب دار شخصیت والا شخص تھا۔ جو تہبند اور سفید کرتے میں ملبوس تھا۔ سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی جب کہ کملا دیوی بھی ڈھلتی عمر کی باوقار خاتون تھیں جو پیلے نیلے رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھیں۔

پونم کو دیکھ کر وہ دونوں خوشی سے کھل اٹھے۔ مگر ساتھ میں ایک نوجوان لڑکے کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر حیرت کے ساتھ تجسس بھی تھا۔ پونم جلدی سے بھاگ کر اپنے ماتا پتا سے جا ملی۔

اویناش دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا ان کے پاس جا پہنچا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور آگے بڑھ کر ان دونوں کے چرنوں کو چھوا۔ مکھیا وجے کمار نے پہلے اویناش کو دیکھا اور پھر پونم کے چہرے پر سوالیہ نظر ڈالی۔

''یہ اویناش ہے۔ پتا جی میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔''

مکھیا نے اویناش سے رسمی بات چیت کی۔ اُن کے رویے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کو اویناش کا آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ مکھیا کا تلخ رویہ اویناش کو بخوبی نظر آ گیا تھا۔

پونم نے ملازم کو کہہ کر اویناش کے لیے مہمان خانہ کھلوا دیا اور ملازم نے اس کا بیگ پکڑا اور مہمان خانے کی طرف مڑ گیا۔ اویناش بھی بغیر کوئی بات کیے چپ چاپ ملازم کے پیچھے ہولیا۔

پونم کو اکیلے پا کر اس کے پتا نے فوراً ہی اویناش کے متعلق سوال کیا۔

''آخر پونم بیٹا تمہیں کیا ضرورت تھی یوں کسی اجنبی لڑکے کو اپنے ساتھ لانے کی۔ تمہیں پتا بھی ہے۔ یہاں گاؤں کا ماحول ہے، یہاں کے لوگ اس قسم کی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ یہ گاؤں ہے شہر نہیں۔''

''مگر پتا جی اویناش اجنبی تو نہیں ہے۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔'' پونم اپنے پتا کو سمجھانا چاہتی تھی۔ مکھیا کا لہجہ سخت تھا۔

''پتا جی وہ بس چند دنوں کے لیے آیا ہے۔ چلا جائے گا۔'' فی الحال پونم نے اپنے پتا کا غصہ دیکھ کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔

☆☆

ملازمہ اویناش کو ایک بڑے سے کشادہ کمرے میں لے آئی۔ جو خاص طور پر مہمانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا وہ کمرہ نہایت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کی ایک بڑی سی کھڑکی تھی جو شمال کی طرف کھلتی تھی۔

ملازمہ اس کو کمرے میں پہنچا کر خود باہر چلی گئی۔ اویناش کچھ دیر بیڈ پر لیٹا آرام کرتا رہا، پھر وہ کھڑکی کھول کر وہیں کھڑا باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ باہر بڑی تیز بارش

برس رہی تھی۔ ایک طوفان تھا جو نارکنے کا نام لے رہا تھا۔

وہ بستر پر لیٹ گیا۔ تھکن کی وجہ سے اس کی لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ دروازے کی دستک پر اس کی آنکھ کھلی۔

اس کو یک دم ہی شدید سردی کا احساس ہوا۔ حالانکہ وہ نومبر کے اوائل دن تھے۔ شاید بارش کی وجہ سے فضا میں خنکی زیادہ ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا، وہ بستر سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر ملازمہ ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لیے ہوئے کھڑی تھی۔ ملازمہ نے وہ ٹرے اندر آ کر میز پر رکھ دی۔

''صاحب جی کوئی کام تو نہیں۔'' ملازمہ اس سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں یہ آتش دان میں کچھ لکڑیاں اور ڈال کر آگ سلگا دو۔ کمرے میں بہت سردی ہو رہی ہے۔'' ملازمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ آتش دان میں آگ سلگا کر کمرے سے چلی گئی۔ وہ کمبل اوڑھ کر پھر بستر پر لیٹ گیا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں جا بیٹھا۔ اس کی نیند جیسے جیسے گہری ہوتی گئی، بھی ہولناک سپنا کسی فلم کی ریل کی طرح اس کے دماغ میں چلنے لگا۔ وہی کھنڈر نما عمارت میں وہ سفید لباس پہنے وہی لڑکی، وہ کالی دیوی کا مندر اور دو انسانی لاشیں جس میں ایک لاش خود اس کی اپنی تھی۔ مگر اس بار وہ اپنے سپنے میں حسب معمول ڈرا نہیں۔ سپنے میں اس نے آگے بڑھ کر لڑکی کے اوندھے منہ کو سیدھا کر کے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ لڑکی نہایت دلکش نقوش کی مالک سندر لڑکی تھی۔ لڑکی کی آنکھیں بند تھیں مگر...... دوسرے لمحے اویناش نے دیکھا وہ مردہ لڑکی اپنی آنکھیں کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کرشنا......!'' لڑکی کے منہ سے آواز نکلی۔

اویناش کے لیے یہ سب اتنا ہولناک تھا، اس کے منہ سے زوردار چیخ نکلی اور وہ سپنے کی دنیا سے باہر نکل آیا۔

''یہ کھڑکی کیسے کھل گئی۔ میں نے خود بند کی تھی۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ''تیز ہوا کی وجہ سے کھل گئی ہے، شاید میں کنڈی لگانا بھول گیا ہوں گا۔''

وہ ہکا بکا ساکت اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ خوف سے اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ اس کو لگا جیسے وہ دوبارہ کوئی سپنا تو نہیں دیکھ رہا۔ اس نے صرف اپنے سپنے میں ہی یہ آواز سنی تھی۔ مگر...... یہ حقیقت تھی، اٹل حقیقت...... وہ کوئی سپنا نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بیداری کے عالم میں پورے ہوش حواس میں کھڑا تھا۔ اس نے اپنی نگاہ سامنے دوڑائی۔ ایک بار پھر اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ سامنے وہی عمارت تھی۔ جو وہ سپنے میں ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔ عجیب کشمکش میں وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اندر کھنڈر نما عمارت میں داخل ہو گیا۔

چاند کی شفاف چاندنی میں اس نے اسی سفید لباس والی لڑکی کو پشت کے سامنے کھڑا پایا۔

''کون...... کون ہو تم......؟'' اویناش نے آگے بڑھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں بمشکل سوال کیا۔ وہ لڑکی اچانک ہی اس کی طرف مڑ گئی۔ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب صورت والی لڑکی جس کو وہ کالی کے مندر میں مردہ دیکھتا تھا۔ لیکن اب وہ زندہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ 'کیا ایک بھٹکتی ہوئی آتما......' یہ سوچ کر ہی اویناش کی گھگھی بندھ گئی۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔

''کرشنا...... مجھے وشواس تھا، تم آؤ گے۔'' لڑکی کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔

''تم...... تم ہو کون......!'' اویناش ڈرتے ہوئے پیچھے قدموں پر لوٹنے لگا۔

''مجھے بھول گئے......؟ میں تمہاری پریمکا...... تمہاری رادھا! مدتوں سے تمہاری تلاش میں اس ویرانے میں بھٹک رہی ہوں۔'' وہ لڑکی دھیرے سے بولی۔ پھر اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ گھنگروؤں کی تیز جھنکار اس ویرانے میں گونجنے لگی۔ پھر وہ لڑکی ناچتے ناچتے اس کی نظروں سے دوبارہ غائب ہو گئی۔ اچانک اس کھنڈر میں اندھیرا سا چھا گیا۔ آکاش پر کالے سیاہ بادل اچانک ہی امڈ آیا۔ کڑکتی تیز بجلی کے ساتھ طوفانی بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ خوف کی ایک لہر اویناش کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اس سے جتنی جلدی ہو سکا، تیزی کے ساتھ باہر کی طرف بھاگا۔ آخر کار کافی دور بھاگتے ہوئے وہ ایک جگہ تھک ہار کر رک گیا۔ اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ دور دور ویرانہ تھا۔ آبادی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

حویلی جانے کا کون سا رستہ تھا۔ وہ یہ بھی بھول بیٹھا تھا۔ بارش سے بری طرح بھیگتے ہوئے اس کو شدید سردی

سی لگنے لگی۔ یک دم ہی بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی۔ وہ پناہ ڈھونڈنے کے خیال سے پیچھے جانے کی بجائے آگے کی طرف دوبارہ بھاگنے لگا کہ دور اس کو کسی عمارت کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ مزید تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔ قریب پہنچنے کے بعد اس کو پتا چلا کہ وہ کوئی مندر ہے یہ مندر بھی حسب سابقہ اس کے لیے انجان نہیں تھا۔ یہ وہی سپنے والا کالی دیوی کا مندر تھا۔ وہ تیزی سے مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ شاید یہ ہوا کا اثر تھا یا کچھ اور کہ مندر میں لگی ہوئیں ساری گھنٹیاں تیزی سے بجنے لگی۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچا۔ سامنے دیو قامت کالی کی مورتی کھڑی تھی۔ کالی سیاہ وہ مورتی جس کے کئی ہاتھ اور سرخ زبان باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ وہ کالی دیوی کی مورتی کو آج کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کو وہاں انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور وہاں روشنی سی بکھر گئی۔ اویناش نے مڑ کر دیکھا۔ اس کو لالٹین اٹھائے کوئی بندہ نظر آیا۔ لالٹین کی مدھم پڑتی ہوئی روشنی میں اس بندے کا وضع قطع صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ بوڑھا سا شخص شاید اس مندر کا پجاری تھا۔ سر پر ایک طرف چھوٹی سی چٹیا کے علاوہ باقی سارا سر گنجا اور چہرے پر بھی کوئی بال نہیں تھا۔

''کون ہے......؟'' وہ لالٹین اوپر اٹھائے اویناش کی طرف بڑھا۔ وہ بوڑھا لالٹین کی دھیمی روشنی میں اُسے جاننے کا مشتاق تھا۔

''میں۔ میں۔ میں اویناش ہوں۔''

''اویناش......! کون اویناش!'' اس بوڑھے نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''رات کے اِس سمے، اس طوفان میں تم اس وقت مندر میں کیا کر رہے ہو۔''

''وہ۔ وہ میں شہر سے آیا ہوں۔ مکھیا وجے کمار جی کا مہمان ہوں۔ وہ اس طوفان میں راستہ بھٹک گیا۔ تو اِدھر آ نکلا۔'' اویناش شاید اپنی پوزیشن اس بوڑھے کے سامنے واضح کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے منہ میں جو آیا وہ اس نے بتا دیا۔

''آپ پجاری ہیں اس مندر کے......؟''

''ہاں میں اس کالی کے مندر کا پجاری ہوں۔'' وہ بوڑھا بولا۔ ''اچھا تم شہر سے آئے ہو۔ اس لیے مجھے نہیں جانتے۔ میں بھی کہوں تم کو پہلے کبھی اس گاؤں میں نہیں دیکھا۔'' اس بوڑھے پجاری نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''پہلی بار آئے ہو اس گاؤں میں......؟''

''ہاں آیا تو میں اس گاؤں میں پہلی بار ہوں پجاری جی۔ مگر......!'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ کچھ سمے گزرنے کے بعد وہ گویا ہوا۔ ''مگر اپنے سپنوں میں اس جگہ سے اچھی طرح سے واقف ہوں۔ یہ مندر، یہ کالی دیوی کا مجسمہ اور وہ پیچھے دور کھنڈر نما عمارت ان سب کو اپنے سپنوں میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔'' اس کی بات پر اس بوڑھے پجاری نے عجیب نظروں سے اس کو دیکھا۔

''کیا......؟ یہ سب کچھ تم سپنوں میں دیکھتے ہو۔'' اس پجاری کے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔

''ہاں......'' اویناش نے اس بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ''اور وہ سفید لباس میں ملبوس لڑکی بھی جو نہ جانے کیوں مجھے کرشنا کہہ کر پکارتی ہے۔'' اویناش نے نا چاہتے ہونے کے باوجود بھی وہ سب کچھ اس پجاری کو بتا دیا جو وہ اپنے سپنے میں دیکھتا چلا آ رہا تھا اور اس رات کے سمے وہ کس طرح یہاں پہنچا یہ بھی اس کو باور کرا دیا۔ بوڑھے پجاری کا منہ دیکھنے کے لائق تھا۔

''میں بہت الجھا ہوا ہوں پجاری جی۔ کچھ سمجھ نہیں آتا یہ سب میرے ساتھ ہی آخر کیوں ہو رہا ہے۔ آخر ان سب باتوں کا کیا مقصد ہے۔'' اویناش نے یہ سب شاید اس خیال سے اس کو بتا دیا کہ وہ بوڑھا پجاری اس کی کچھ مدد ہی کر دے۔ اس کو اس اذیت سے نکال دے۔

''کیا...... کرشنا......!'' وہ بوڑھا پجاری بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ ''جہاں تک میرا اندازہ ہے تم واقعی کرشنا ہو۔ کرشن چندر اس کالی کے مندر کے پجاری رام چندر کے پتر......'' بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئیں۔ ''او کالی ماتا تُو نے آخر کر دکھایا۔'' بوڑھا پجاری زیرِ لب زور سے چلا اٹھا۔ اویناش نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔

''میں۔ میں اویناش ہوں۔ پجاری جی۔''

''تمہارا نام جو بھی ہو۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ پر میں اس جنم کی بات نہیں کر رہا ہوں پتر۔ یہ

بات تو تیرے پچھلے جنم کی ہے لڑکے۔'' پجاری نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پچھلے جنم میں تُو رام چندر پجاری کا پتر تھا۔ کرشن چندر نام تھا تیرا۔ پیار سے تجھے سب کرشنا کہتے تھے۔''

''یہ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' اوِیناش اس بوڑھے کی باتوں پر وشواس نہیں کررہا تھا۔ ''پچھلا جنم میں کسی پچھلے جنم کو نہیں مانتا۔ ہوش کرو پجاری۔'' اوِیناش کو لگا جیسے اس بوڑھے پجاری کا دماغ خراب ہے۔

''ہوش کی مجھے نہیں لڑکے تجھے ضرورت ہے اور پھر تمہارے نا ماننے سے کیا ہوسکتا ہے بھلا'' پجاری اس سے سخت لہجے میں بولا۔ ''ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ آج وہ ہوگیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ مجھے کالی پر وشواس تھا۔ کالی ماتا تجھے ایک دن ضرور اس جگہ لائے گی اور دیکھو آج وہ ہوگیا۔''

اوِیناش الجھی ہوئی نظروں سے اس پجاری کو دیکھے جارہا تھا۔

''مجھے پتا ہے کہ تم میری باتوں پر وشواس نہیں کررہے ہو۔'' پجاری اس کی الجھن بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ''مگر ساری حقیقت جاننے کے بعد تم کو آخر میری باتوں پر وشواس کرنا ہی پڑے گا لڑکے کہ میں واقعی کتنا سچ کہہ رہا ہوں۔ تم کو علم ہے کہ وہ سفید لباس والی لڑکی کون ہے۔''

اوِیناش جو اس بوڑھے پجاری کی باتوں پر کھویا ہوا کھڑا تھا۔ یوں سوال پوچھنے پر چونک گیا۔ ''وہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ تمہاری پریمکا ہے رادھا......!'' اوِیناش کو یک دم ہوش سا آگیا۔

''ہاں۔ رادھا...... کھنڈر میں اس لڑکی نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔'' اوِیناش بے اختیار بول پڑا۔ تو کیا یہ بوڑھا پجاری سچ کہہ رہا ہے۔ اوِیناش اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔

''وہ مدتوں سے اس ویرانے میں بھٹک رہی ہے۔ صرف تمہارے انتظار میں، وہ تمہارے سپنوں میں آکر تم کو تمہارے پچھلے جنم کی وہ باتیں بتانا چاہتی تھی جن کو تم فراموش کر بیٹھے ہو اور دیکھو وہ تمہیں یہاں تک آخر لے ہی آئی۔ یہ تمہارا اور اس کا سچا پریم بھی تھا کہ سنسار میں تم نے دوسرا جنم لیا ہے۔''

''رادھا! میری پریمکا......'' اوِیناش عجیب کشمکش کی کیفیت میں وہاں کھڑا رہا۔ وہ بولا کچھ نہیں۔

''آؤ میرے ساتھ میری کٹیا میں۔ میں تم کو تمہارے گزرے ہوئے ماضی کے بارے میں بتاؤں۔ پھر تم کو ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔''

وہ بوڑھا پجاری اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی مندر کے ساتھ بنی ہوئی کٹیا میں لے آیا۔ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی وہ چھوٹی سی کٹیا میں بس ایک چارپائی اور کچھ دوسرا تھوڑا بہت استعمال کا سامان تھا۔

کٹیا میں داخل ہوکر اس بوڑھے نے جھک کر چارپائی میں سے ایک پرانے سے لوہے کے بنے ٹرنک کو کھینچا۔ اس ٹرنک کو باہر نکال کر اس نے اس زنگ آلود ٹرنک کو جلدی سے کھولا۔ اس میں کسی پرانے سے کپڑے میں لپٹی ہوئی مورتی نکالی۔ بوڑھے پجاری نے اس مورتی کو جلدی سے کپڑے سے آزاد کیا۔ اوِیناش کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''او...... یہ...... یہ تو اسی کھنڈر میں نظر آنے والی لڑکی کی مورتی ہے۔''

''ہاں۔ یہ اسی کی مورتی ہے۔ رادھا کی......'' بوڑھا چارپائی پر جا بیٹھا۔ اوِیناش پاس پڑے ایک بڑے پتھر پر جیسے ڈھے سا گیا۔ بوڑھے پجاری نے بات شروع کی۔

''بات بہت پرانی ہے۔ مدت گزر گئی ہے۔ تقریباً ایک صدی پہلے کا قصہ ہے۔ یہ گاؤں جو چندن پور کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ایک ٹھاکر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ یہ سارا علاقہ اس کی تحویل میں آتا تھا۔ رام چندن نام کا ایک پجاری اس کالی کے مندر کا سیوک تھا۔ رام چندن کا ایک ہی پتر تھا۔ کرشن چندن جس کو سب پیار سے کرشنا کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ کشن کنھیا کی طرح تھا بھی بڑا نٹ کھٹ، ہر وقت بانسری بجاتا رہتا تھا۔ بانسری بجانے کا شوق اگرچہ اس کو بچپن سے ہی تھا۔ مگر جوانی میں قدم رکھتے ہی اس کا یہ شوق جنون میں بدل گیا تھا۔ اس کا پتا رام چندن پجاری مورتی بنانے کا کام کرتا تھا۔ کرشنا نے دیوتاؤں کی مورتیاں بنانے کا ہنر بھی خوب اچھی طرح سیکھ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تو اپنے پتا سے بھی زیادہ نکھار تھا۔ دور دور سے لوگ اس سے مورتیاں بنوانے آتے تھے۔ اس کے بانسری کے مدھر سنگیت کے

بھی بہت چرچے تھے۔ کرشنا جب اپنی بانسری سے سُر بکھیرتا تو سنسار سارا کا سارا خاموش ایک جگہ ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا۔

اُس دن مہاراجہ رنجیت سنگھ کا جنم دن تھا۔ بڑی دور سے سازو آواز کے استاد کئی لوگ اس کے محل میں چلے آئے۔ مہاراجہ کی سب کو کھلے عام دعوت تھی۔ کرشنا بھی اپنا ہنر دکھانے محل کی طرف چل پڑا۔ کئی لوگوں نے اپنے ساز و سنگیت پیش کیے۔ کرشنا نے بھی بانسری بجانا شروع کی کہ محل کے دربار میں ایک شعلہ جوالا لپکا۔ وہ اپسرا تھی یا آکاش کی کوئی پری۔ ایسی سندرتا سنسار میں کسی نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ رادھا تھی، مشہور رقاصہ جو اپنی ماں چمپا بائی کے ساتھ محل میں مہاراجہ کے جنم دن پر آئی تھی۔ کرشنا کی نظریں رادھا کی نظروں سے ٹکرائیں۔ ان دونوں نے محسوس کیا جیسے وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ رادھا پاؤں میں گھنگرو باندھے ناچنے لگی۔ ہر کوئی محو ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ناچتی رہی یہاں تک کہ باقی سازو آواز والے تھک ہار کر چپ ہوگئے۔ لیکن کرشنا اپنی مدھر بانسری بجاتا رہا اور رادھا بانسری کی لے پر ناچتی رہی۔ محل میں موجود یہ اچنبھے کی بات تھی۔ نہ جانے کتنے سے تک کرشنا بانسری بجاتا رہا اور رادھا ناچتی رہی۔ محل میں سارے لوگ ان دونوں کے فن پر عش عش کر اُٹھے۔

اگلے دن رادھا کالی دیوی کے مندر پوجا کے لیے گئی تو وہاں کرشنا سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہنر کی تعریف کی۔ جن میں دونوں کے پریم کا تیر تو پہلے سے ہی پیوست ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے رستے ایک دوسرے کو من میں بسا کر دونوں نے خود کو پریم کے اٹوٹ دھاگے سے باندھ لیا۔

پھر ان کی روز ہی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی اس کالی کے مندر پر اور کبھی مندر کے پچھواڑے دور کنول کے پھولوں سے بھرے تالاب پر۔ کرشنا بانسری کے سُر بکھیرتا تو رادھا اس کی بانسری کے مدھر آواز سے کھنچی ہوئی اس کی اور چلی آتی۔ مگر ان کے سچے پریم کے آگے کئی کٹھن مراحل باقی تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی پہلی ہی نظر میں رادھا پر من ہار بیٹھا تھا۔ رادھا جیسی سندر کنیا اس نے اپنے جیون میں نہیں دیکھی تھی۔ اس کا اظہار ایک دن اس نے اس کی ماں چمپا بائی سے کر دیا۔ مہاراجہ نے ان دونوں کو محل میں رہنے کی اجازت دے دی۔

”کیوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں چمپا بائی۔“ مہاراجہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں شرمندہ کرتے ہو مہاراج۔ ہم تو پہلے ہی آپ کے بڑے ابھاری ہیں، اپنے محل میں رہنے کی اجازت دے کر اور رادھا کو اپنی داسی بنا کر آپ نے ہمیں بے مول خرید لیا ہے۔“ چمپا بائی ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”داسی......“ مہاراجہ رنجیت سنگھ بولا اور ہنسنے لگا۔

”ہاں مہاراج! رادھا داسی بن کر آپ کے چرنوں میں پڑی رہے گی۔“

”داسی نہیں چمپا۔“ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”مہارانی کہو۔ ہم اس کو مہارانی بنا کر چرنوں میں نہیں من میں بٹھانا چاہتے ہیں۔“ چمپا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ رادھا کو بھی مہاراجہ کی نیت میں کھوٹ نظر آنے لگا تھا۔ وہ وقت بے وقت رقص کے لیے اس کو بلوا لیتا۔ رادھا کو چنتا ہونے لگی کہ کہیں مہاراجہ اس کے اور کرشنا کے پریم میں راکھشس بن کر نہ آجائے۔ اس لیے ایک دن وہ کرشنا سے ملی تو اپنے من کا ڈر اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

”کرشنا۔ کہیں ہمیں کوئی الگ نہ کر دے۔ میرے من میں ہر وقت یہی بُرے بُرے وسوسے آتے رہتے ہیں۔“ رادھا اداس لہجے میں اس سے بولی۔

وہ دونوں مندر کے پاس اُگے ہوئے بڑے سے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے پریم کے وعدے قسمیں نبھانے کی باتیں کرتے رہے۔ ان دونوں نے اپنے ہاتھوں سے چاقو سے پیپل کے تنے پر کرشنا اور رادھا بھی لکھا۔ ان کا گمان تھا کہ یہ درخت ان کے پریم کی یاد دلاتا رہے گا۔ کرشنا نے رادھا کی مورتی بھی اس کو دکھائی۔ جو اس نے اس کی بنائی تھی۔ اپنی مورتی کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے کرشنا کے گلے لگ گئی تھی۔

”سچ کرشنا۔ تم مجھ سے اتنا پریم کرتے ہو۔“

”یہ تو مجھے خبر نہیں...... رادھا مگر میں اتنا جانتا ہوں

کہ تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔ ہمارا پریم بھی اس طرح ہی ہے جیسے سیتا اور رام۔ رادھا اور شام کا تھا۔" دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

☆......☆......

اگلے دن اس علاقے میں بیساکھی کا میلہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے میلے میں جھولے جھولتے۔ مختلف کھانے کی چیزوں سے دل بہلاتے ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔ کرشنا نے رادھا کو میلے سے سبز رنگ کی چوڑیاں بھی لے کر دیں۔ میلے میں گھومتے سے ان کو ایک سادھو بابا مل گیا۔ جس نے نہایت میلا کچیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے بال اور داڑھی مٹی سے پُر تھی۔ وہ سادھو ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

وہ کافی سے تک ان کے چہروں کی طرف دیکھتا رہا۔ رادھا اس عجیب وغریب حلیے میں ملبوس اس سادھو کو دیکھ کر کرشنا کے ساتھ جا لگی، وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"ہوں...... پریمی ہو۔" سادھو نے ہنکار بھری۔

"ہاں...... ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت پریم کرتے ہیں۔" کرشنا رادھا کا ہاتھ تھام کر مسکرا کر بولا۔ تو رادھا بھی مسکرا دی۔

"مجھے سب پتا ہے بالک......!" سادھو تیز آواز میں بولا۔ "پریمی ہو پر جنم جنم کے...... پر اس سنسار کے ظالم لوگ تمہارے اس پریم کو نہیں جانتے۔ بھگوان جانے اس سنسار کے ریت رواج ہی الگ ہیں ہمیشہ دو پریمیوں کو ایک نہیں ہونے دیتے۔" کرشنا اور رادھا غور سے اس کی باتیں سننے لگے۔

"تمہارے پریم کے راستے میں بھی بڑی کٹھن سیمائیں ہیں۔ جن کو تم دونوں نے پار کرنا ہے۔ پھر تم دونوں کا پریم امر ہوگا۔ ورنہ......" سادھو کہتے کہتے رک گیا۔

"ورنہ کیا سادھو بابا......" کرشنا جہاں چنتا لیے ہوئے تھا وہاں رادھا بھی کوئی کم فکرمند نہ تھی۔ سادھو کی باتیں ان کے من میں خوف جگانے لگی تھیں۔

"کوئی کارن بتاؤ سادھو بابا......" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"ہاں...... کارن...... کارن تو ایک ہے۔" سادھو نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنے گلے میں پڑے کالے موتیوں کی مالا اتار کر کرشنا کے ہاتھ میں تھمائی۔ "پوری پورن ماشی کی رات جب چاند آکاش کے بالکل بیچ میں آجائے۔ سات پھیرے اور منگل سوتر ڈالنے کے بعد یہ سیاہ مالا اس لڑکی کے گلے میں ڈال دینا۔ رام سب اچھے کرے گا۔ پھر تم دونوں کو کوئی بھی جدا نہیں کر سکتا۔ مر بھی گئے تو دوسرے جنم میں ایک ساتھ رہو گے۔ ورنہ ہر جنم میں یونہی بھٹکتے رہو گے۔ تم دونوں کو شانتی نہیں ملے گی۔" کرشنا نے واپسی پر وہ مالا اپنے پتا کے حوالے کر دی اور ساری حقیقت بتا دی۔ اس کے پتا کو ان دونوں کے پریم کا پہلے سے ہی پتا تھا۔ مگر جلد ہی رادھا کی ماں چمپا بائی کو بھی ان کے پریم کی خبر ہو گئی۔ چمپا بائی نے رادھا کو کرشنا سے باز رہنے کی دھمکی دی اور اس کو مہاراجہ کی نیت سے بھی خبردار کیا۔

"تیرا بیاہ ہوگا تو صرف مہاراجہ سے، دیکھتی ہوں کیسے تُو بیاہ کے لیے راضی نہیں ہوتی۔"

چمپا بائی نے اسی وقت ساری بات مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بتا دی۔ مہاراجہ کا غصہ دیکھنے کے لائق تھا۔ رادھا کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اسی دن زبردستی اس سے بیاہ کی تیاری کرنے لگا۔ اڑتی اڑتی بات کرشنا کے کانوں تک جا پہنچی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ ساری قید و بند کو پھلانگ کر کرشنا نے اپنی رادھا کو مہاراجہ کی قید سے آزاد کیا اور وہ محل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مہاراجہ غیظ وغضب کا طوفان لیے اپنی فوج کے ہمراہ ان کے پیچھے جا لپکا۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے مندر جانے کے بجائے پھولوں بھرے تالاب کی اُور جا نکلے اور وہاں اُگی ہوئی بڑی بڑی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ مہاراجہ ان کو ڈھونڈتا ہوا کالی کے مندر جا پہنچا۔ اور اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ رات گئے تک کرشنا اور رادھا وہیں جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے رہے۔

پورن ماشی کی وہ رات جو آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ یوں یہاں ڈر کے بیٹھنے سے ان دونوں کو اپنی اس مشکل کا حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان دونوں نے مندر جا کر سات پھیروں کے بندھن کے ساتھ ہمیشہ کے لیے

اٹوٹ بندھن میں بندھ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل کر دوڑتے ہوئے کالی کے مندر جا پہنچے۔ جہاں کرشنا کا پتا ان دونوں کی آنے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ ان کے پاس سے نہیں تھا۔ مہاراجہ کسی بھی وقت دوبارہ وہاں آسکتا تھا۔ وہ مہاراجہ کے آنے سے پہلے سات پھیروں کے بندھن اور رادھا کے گلے میں کالے موتیوں کی مالا ڈال کر کرشنا اور رادھا ہمیشہ کے لیے پریم امر کرنا چاہتے تھے۔ رام چندر نے اگنی میں آگ لگا کر سات پھیروں کے ساتھ ان کو بیاہ جیسے انمول رشتے میں باندھ دیا۔ کرشنا اپنے پتا رام چندر سے وہ کالے موتیوں والی مالا لے کر جلدی سے رادھا کے گلے میں پہنانے لگا کہ ایک ہوا میں لہراتا ہوا تیر اس کے سینے پر عین دل کے مقام میں آ کر پیوست ہو گیا۔ کرشنا لڑکھڑا کر نیچے کالی دیوی کے چرنوں میں گر پڑا۔ رادھا چیختے ہوئے اس کی طرف لپکی کہ مہاراجہ نے اس کو پکڑ لیا اور زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ رادھا نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے منہ پر تھوک دیا۔

''مہاراجہ اگر اس جنم میں، میں کرشنا کی نہیں ہو سکتی تو تیری بھی نہیں ہو سکتی۔'' رادھا نے جلدی سے ساتھ کھڑے سپاہی سے تلوار چھینی اور اپنے پیٹ میں گھونپ دی۔ مہاراجہ کو اس بات کی توقع نہیں تھی۔ رادھا کرشنا کے سینے پر جا گری۔ کرشنا آخری سانسیں لے رہا تھا۔

''یہ تو نے کیا کیا رادھا...... خود کو ہی مار ڈالا......''

''کرشنا تو اگر نہیں تو میں نے اس جیون کا کیا کرنا ہے۔ ہم اگلے جنم میں ملیں گے کرشنا! ایک نئے جنم میں۔''

''ہاں رادھا بھگوان ہمیں دوبارہ ملائے گا۔'' کرشنا نے اپنے باپو کی طرف دیکھا۔ ''باپو یہ کالے موتیوں والی مالا ہم تمہارے پاس چھوڑے جا رہے ہیں۔ کرشنا نے مرتے سے اپنے باپو سے وچن لیا۔ پھر ان دونوں نے وہیں جان دے دی۔

مہاراجہ نے ان دونوں کی لاشوں کو اس مندر کے پیچھے گڑھے میں دفنا دیا۔ کرشنا اور رادھا کا رام چند پجاری وہ موتیوں کی مالا سنبھالے دوسرے جنم کا انتظار کرنے لگا۔ مگر کرشنا یعنی تم نہیں آئے اور مرتے وقت تمہارے پتا نے اپنے چیلے کو وہ مالا تھما دی اور اس سے کالی ماتا کی سوگند لی کہ بطور امانت اپنے پاس سنبھال کر رکھو گے۔ جب تک کہ تم دوسرا جنم لے کر یہاں اس مندر میں آ نہیں جاتے۔ وہ چیلہ بھی مر گیا۔ اور پھر یہ نسل در نسل مالا چلتی ہوئی میرے پاس آ پہنچی۔ میں بھی ہر پجاری کی مانند آس لگائے اپنے جیون کے دن پورے کر رہا تھا کہ تم ایک نا ایک دن ضرور لوٹو گے اور دیکھو تم لوٹ آئے۔ میں بہت بھاگیشالی ہوں کہ یہ سندر سمے میرے جیون میں آیا۔ شبھ گھڑی لوٹ آئی۔''

اویناش کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑیں۔ اپنے پچھلے جنم کی کہانی سن کر جہاں اس کو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہاں اس کا من بہت دکھی بھی تھا کہ پچھلے جنم میں اس کا اور رادھا کا پریم امر نہیں ہو سکا تھا۔ اپنے پچھلے جنم کا ایک ایک گزرا ہوا لمحہ اس کو یاد آ گیا تھا۔ یک دم ہی وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں چھایا ہوا کئی سالوں کا بوجھ اچانک ہی چھٹ گیا تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ دکھ کی گھڑی کا انت ہو چلا ہے اور خوشیاں اس کی راہ میں کھڑی اس کی منتظر ہیں۔

''پر میری رادھا کہاں ہے پجاری جی؟ کیا مجھے وہ اس جیون میں ملے گی، ایک نئے جنم میں۔''

''ہاں۔ اوش ملے گی۔ اس نے لازماً تمہارے ساتھ ہی دوسرا جنم لیا ہوگا۔ مگر اب اس کو ڈھونڈنا تمہارا کام ہے۔'' بوڑھا پجاری اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس کو تمہیں تلاش کرنا ہوگا۔ میرا وشواس ہے وہ تمہیں ملے گی۔ اس کا اور تمہارا جسم کا نہیں بلکہ روح کا رشتہ ہے۔'' پجاری نے ٹرنک دوبارہ کھولا اور اس میں بڑے بڑے کالے موتیوں والی مالا اٹھا کر اس کے حوالے کر دی۔ ''یہ لو اپنی امانت'' اور مالا کے ساتھ بانسری بھی دے دی۔ پجاری کالے موتیوں والی مالا اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''آج میں اس امانت کی رکھشا سے مکت ہوا اور اس کالی ماتا کی سوگند سے بھی جو تمہارے پتا نے یہ مالا دیتے ہوئے لی تھی۔''

اویناش وہ مالا ہاتھ میں تھامے کتنی دیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ پجاری سے اجازت طلب کر کے اور اس کے کہنے پر ہی رادھا کی مورتی، بانسری اور مالا ہاتھ میں پکڑے نم آنکھوں سے کٹیا سے باہر نکل آیا۔ رات ڈھل چکی تھی۔

اس کو سے کا پتا ہی نہ چل سکا کہ کتنا وقت بیت چکا تھا۔

☆☆

صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ ہر طرف دن کا اجالا بکھر رہا تھا۔ مندر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر وہ اس درخت کے پاس آ پہنچا۔ وہ پیپل کا درخت جس میں اس نے اور رادھا نے اپنا نام لکھا تھا۔ انگلیوں کی پوروں سے وہ اس لکھے ہوئے نام کو چھونے لگا۔ پیپل کے درخت کے موٹے سے تنے پر آج بھی 'کرشنا رادھا' لکھا صاف پڑھا جا سکتا تھا...... ''رادھا تم کہاں ہو۔''

وہ فوراً اپنے کمرے میں آیا۔ اُس نے اُس مالا اور بانسری کو احتیاط کے ساتھ اپنے سامان والے بیگ میں رکھا اور رادھا کی مورتی کو میز پر رکھ چھوڑا کہ کمرے میں پونم آ نکلی۔

''اویناش کہاں چلے گئے تھے تم......؟ صبح سے تمہاری اتنی چنتا ہو رہی تھی۔ ملازمہ نے بتایا کہ تم کمرے میں نہیں ہو۔ میں سمجھی کہ تم کہیں ناراض ہو کر واپس شہر نہ چلے گئے ہو۔''

''وہ میں...... پونم......'' وہ اس کو بتاتے ہوئے جھجک پڑا۔ مبادا پونم ساری حقیقت جان کر نہ جانے کیا ردِعمل ظاہر کرے۔

پونم جو اس کے جواب کی منتظر تھی، اچانک اس کی نگاہ میز پر رکھی ہوئی مورتی پر پڑی۔ اس کی توجہ اس مورتی کی طرف مبذول ہو گئی۔

''ارے یہ مورتی کس کی ہے اویناش۔'' وہ مورتی کے قریب آ گئی۔ ''کتنی سندر ہو گی وہ لڑکی جس کی یہ مورتی ہے۔ کہاں سے اس کو اٹھا کر لائے ہو۔ پہلے تو تمہارے پاس نہیں تھی۔'' پونم نے اس کی طرف دیکھا۔

''پونم یہ رادھا ہے۔'' اویناش ہولے سے بولا۔

''رادھا...... کون رادھا؟''

''وہ رادھا جو میرے سپنوں میں روز آتی تھی۔ میری پریمکا رادھا۔ میرے پچھلے جنم کی ساتھی۔ ہم دونوں پچھلے جنم میں ایک دوسرے سے بہت پریم کرتے تھے۔''

''پچھلا جنم!! ہوش کرو اویناش! کیا کہہ رہے ہو۔ پونم کو شدید حیرانگی ہوئی۔ ''کیا اناپ شناپ بول رہے ہو۔''

''میرا وشواس کرو پونم۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''لگتا ہے رات بھر تم نے وہی سپنا دیکھا ہے۔ پھر تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہے اس لیے ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔''

''تم میرا وشواس کیوں نہیں کر رہی ہو پونم۔ تمہیں پتا ہے اپنے سپنوں میں، میں جو کھنڈر اور مندر دیکھتا تھا وہ اس گاؤں میں موجود ہیں۔ میں خود آج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''ایک منٹ۔ ایک منٹ۔'' پونم تیزی سے بولی۔ ''تمہارے کہنے کے مطابق گاؤں میں جو کالی دیوی کا مندر ہے اور دوسری وہ جو کھنڈر نما عمارت ہے۔ یہ وہی ہیں جو تم اپنے سپنوں میں دیکھتے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کو کوئی دھوکہ بھی ہو سکتا ہے اویناش۔ تم تو کبھی اس گاؤں آئے بھی نہیں۔'' پونم یہ سب ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔

''اور پھر یہ رادھا۔ پچھلا جنم یہ سب کیا ہے۔''

''کیا بکواس ہے اویناش۔ اور کچھ نہیں تمہارا دماغ خراب ہو گیا۔'' پونم اس کی باتوں سے تنگ آ کر بولی۔ اویناش کو یقین تھا کہ پونم اس کی بات پر کبھی یقین نہیں کرے گی۔ اس لیے اس نے اپنے پچھلے سارے جنم کی کہانی بھی اس کے گوش گزار کر دی۔ پچھلے جنم کی کہانی سن کر پونم پہلے پہل تو اویناش کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

اویناش اس کو دیکھتا رہ گیا۔

''اس دور میں بھی تم پچھلے جنم پر وشواس کرتے ہو۔''

''تو کیا پچھلا جنم نہیں ہوتا۔ دھرم میں تو سات جنموں کا لکھا ہوا ہے۔''

''ہاں۔ مگر میں نہیں مانتی۔ تم اس بوڑھے پجاری کی باتوں میں آ گئے ہو۔ اس نے اناپ شناپ بول کر تمہارا دماغ مزید خراب کر دیا ہے۔ مجھے تو وشواس نہیں ہو رہا کہ تم نے اتنا پڑھ لکھ کر اس فرسودہ کہانی کو سچ مان کیسے لیا ہے۔'' پونم اس کے قریب آ گئی۔

''میں...... میں پونم آخر تم کو کیسے سمجھاؤں۔ یہ سچ ہے۔'' اس نے پونم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پونم کو اس کا ہاتھ بڑا گرم محسوس ہوا۔ پونم نے فوراً اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

اس کا سارا جسم بُری طرح پھنک رہا تھا۔ ''او...... اویناش تمہیں تو بڑا تیز بخار ہے۔''

''ہاں وہ باہر بارش میں بھیگنے کی وجہ سے ہو گیا ہوگا۔'' اویناش اپنے سر کو پکڑتے ہوئے بیڈ پر آ بیٹھا۔

''تم بھی نہ جانے کیا کرتے رہتے ہو۔ اپنی تو تمہیں کوئی چنتا ہے ہی نہیں۔'' پونم نے اس کو بیڈ پر لٹا دیا۔ دوپہر تک پونم اویناش کے سرہانے بیٹھ کر ٹھنڈی پٹیاں کرتی رہی۔ حکیم کی دی ہوئی دوائی اور پٹیاں کرنے کی وجہ سے اس کے بخار میں کچھ افاقہ ہوا۔

پونم کی ماں کو خبر ہوئی تو وہ بھی اویناش کو دیکھنے آئی۔ مگر وہ گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ مکھیا نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ اپنی پتنی کے اصرار پر اس نے اویناش کو کچھ دن مزید رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

☆☆

اگلی صبح جا کر اویناش کی طبیعت سنبھلی اور بخار اتر گیا۔ صبح کے دس بجے کا سمے تھا کہ اس کی آنکھ کھلی۔ پونم کمرے میں چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں گرم سوپ کا پیالہ تھا۔ پونم نے وہ گرم سوپ کا پیالہ بیڈ کی سائیڈ والی ٹیبل پر رکھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری اویناش۔ تمہارے تیز بخار کی وجہ سے میں تو بہت فکر مند ہو گئی تھی۔''

''ہاں۔ اب کچھ ٹھیک ہے۔ پر سر میں ابھی بھی چکر سے آ رہے ہیں۔'' اویناش نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔

''چلو اویناش باہر چلتے ہیں۔ موسم باہر بہت سندر ہو رہا ہے۔ اب بستر چھوڑ بھی دو تم۔ اویناش۔ یونہی بستر پر پڑے رہے تو کہاں تمہاری طبیعت سنبھال پائے گی۔ پہلے ہی اناپ شناپ سوچ سوچ کر تم نے اپنا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تم پڑے ہوئے نہ جانے کیا کیا سوچنے لگتے ہو۔'' اس نے مزید اس سے کوئی بحث نہیں کی۔ اور اس کو حویلی سے باہر لے آئی۔

☆☆

ڈھلتی شام بہت سندر دلکش منظر پیش کر رہی تھی۔ آکاش ہر اڑتے سفید روئی جیسے بادل، ٹھنڈی میٹھی دھوپ، خوشگوار تاثر دیتی ہوا، وہ دونوں گاؤں کی پکی سڑک پر چلتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔

چاروں طرف سرسبز کھلیان، اونچے اونچے درخت اور پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ گاؤں واقعی سنسار کی سندر جگہوں سے ایک جگہ تھی۔

گاؤں کی کھیتوں کی پگڈنڈیاں سے چلتے۔ سرسوں کے پھول توڑتی، اس سے کھیلتی پونم اس کو جنوب کی طرف لے آئی۔ جہاں ایک بڑی سی ندی بہتی تھی۔ یہ جگہ کافی پتھریلی تھی۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے دو بڑے پتھروں پر جا بیٹھے۔ ندی کے اس پار کی زمین خالی اور بیابان تھی۔

اویناش نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دور اس پار اس کو جھونپڑیاں سی نظر آئیں، یہ جھونپڑیاں خانہ بدوشوں کی تھیں۔

جس طرف وہ بیٹھے تھے اُس پار دائیں طرف دور جنگل میں اس نے کچھ نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو بھی دیکھا۔ یہ یقیناً ان خانہ بدوشوں کی عورتیں تھیں جو ایندھن کے لیے سوکھی لکڑیاں تلاش کرنے میں مگن تھیں کہ اُسے رادھا کی صورت کی ایک لڑکی دکھائی دی۔ اس لڑکی کا چہرہ اویناش کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ حیرت اور پھر خوشی سے لبریز اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ستواں ناک، روشن ماتھا، بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں، چاند جیسا سندر چہرہ۔ وہ کوئی اور نہیں اس کی رادھا تھی۔

خوشی ملن کی گھڑی تھی کہ اس کا سارا جسم جیسے رقص کرنے لگا۔ وہ خوشی سے چلّا اٹھا۔

''رادھا......''

جتنی تیزی سے اویناش بھاگ سکتا تھا اس سے بھی زیادہ بھاگتا ہوا وہ اس لڑکی کے پاس جا پہنچا۔ جو اس ساری حقیقت سے بے خبر اپنی لکڑیوں کی گٹھری باندھنے میں مصروف تھی۔ اویناش پھولتی سانسوں سے اس کے سامنے جا پہنچا۔

اس لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نوجوان لڑکے کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ یک دم ہی گھبرا سی گئی۔ وہ باقی سب عورتوں سے اکیلی ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔

''رادھا! مجھے پورا وشواس تھا تم مجھے مل جاؤ گی۔

ہمارا پریم سچا تھا۔تم دوسرے جنم میں دوبارہ مجھے مل گئی ہو۔''

گھبرائی ہوئی لڑکی مزید بوکھلا سی گئی۔ایک نوجوان لڑکے کا یوں اس طرح سے مخاطب ہونا۔اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔وہ عجیب اجنبی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔لڑکی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ نوجوان آخر کون ہے اوراس کو کیوں رادھا بلا رہا ہے۔وہ خوف سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''رادھا مجھ سے ڈرو نہیں۔میں کرشن چندر ہوں۔ تمہارا کرشنا، بھگوان نے ہمیں دوبارہ ملا دیا۔

یہاں تک کہ اویناش مزید کچھ کہتا پونم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آپہنچی تھی۔پونم بھی اس لڑکی کو دیکھ کر ششدر ہو کر رہ گئی۔واقعی اس مورتی سے اس لڑکی کی شکل کتنی ملتی تھی۔وہ لڑکی واقعی اس مورتی جیسی ہی تھی۔ پونم بھی پہلے پہل بوکھلائی مگر پھر جلد سنبھل گئی۔

''پونم دیکھو میں نہیں جانتا تھا کہ رادھا مجھے ملے گی۔ میری رادھا کا میری طرح لازماً دوسرا جنم ہوا ہوگا۔ہمارا پریم سچا تھا۔دوسرے جنم میں پھر مجھے رادھا مل گئی۔''

''اویناش تم میرے ساتھ آؤ۔'' پونم نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے اس کو بازو سے پکڑا۔

''اے گوری! وہاں کھڑی کن سے باتیں کر رہی ہے تُو۔ہم جا رہے ہیں جلدی آ۔'' دور کھڑی وہ خانہ بدوش عورتیں اس لڑکی کو آوازیں دینے لگیں۔

لڑکی نے جلدی سے لکڑیوں کی گٹھری سر پر اٹھالی، اویناش پھر اس کے سامنے آگیا۔

''مجھے پہچانو رادھا میں کرشنا ہوں۔تمہارا کرشنا۔''

لڑکی پھر بھی چپ رہی۔

''پونم تم نے مجھے کیوں روکا۔وہ جا رہی ہے پونم رادھا جا رہی ہے۔یہ چلی جائے گی۔مجھے اس کو بتانا ہے کہ میں کون ہوں۔وہ کون ہے۔'' اویناش کے لہجے میں شدید بے تابی تھی۔

''چپ رہو اویناش۔بس اب ایک لفظ نہ بولنا۔'' پونم سخت لہجے میں اس سے بولی۔''کسی راہ چلتی لڑکی سے اس طرح کا رویہ۔تمہارا واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے۔پاگل ہو گئے ہو تم اور مجھے بھی کر دو گے۔تم آخر کر کیا رہے ہو۔تمہیں پتا ہے وہ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی لڑکی تھی اوران کے قبیلے کی لڑکی کو سرِ راہ یوں چھیڑنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔'' پونم نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ لوگ اپنی عزت اور غیرت کے لیے قتل جیسے فعل سے بھی نہیں چوکتے۔''

''پونم آخر تم کس مٹی کی بنی ہو۔تم کو کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم کو واقعی ابھی تک اس ساری حقیقت پر وشواس نہیں آیا۔یا جان بوجھ کر انجان بنی یہ سب ڈھونگ کر رہی ہو۔'' اویناش غصے سے بولا۔

گوری تیزی سے سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے بھاگتی ہوئی ان خانہ بدوش عورتوں کے پاس جا پہنچی۔جو اس کے انتظار میں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

''اے گوری! کون تھا وہ بابو؟ تجھ سے کیا بول رہا تھا۔'' ان عورتوں میں سے ایک عورت نے جلدی سے سوال کیا، باقی عورتیں بھی گوری کو اشتیاق سے دیکھنے لگیں۔

''پتا نہیں......! مجھے کیا معلوم کون تھا۔'' گوری ان کو جواب دیے بغیر آگے چل پڑی۔

''اے۔تجھے نہیں معلوم...... بات تو وہ تجھ سے کر رہا تھا اور تُو کہہ رہی ہے مجھے معلوم نہیں۔سچ بتا۔تُو چھپا رہی ہے ناں ہم سے۔بتا جلدی بتا۔'' دوسری عورت بولی۔

''ہاں واقعی! گوری ہولے سے بولی۔نہ جانے کون تھا۔مجھے رادھا کہہ کر پکار رہا تھا۔

''رادھا......'' ساری عورتیں بیک وقت بولی۔اور ہنس پڑیں۔

''ہاں۔اور پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔مگر تم سب میری بات سنو۔قبیلے جا کر یہ بات بھگوان کے لیے کسی کو نا بتانا، خاص کر میری موسی کو۔ ورنہ میری جان کو عذاب آجائے گا۔'' سب عورتیں پھر ہنسنے لگ گئیں۔

گوری اس خانہ بدوش قبیلے کی سب لڑکیوں میں سے نہایت سندر لڑکی تھی۔قبیلے کے اکثر نوجوان اس کو پانے کی خواہش اپنے من میں آس لگائے بیٹھے تھے اور یہ را کا ان میں سے ایک تھا۔مگر گوری کے مزاج ہی الگ

تھے۔ بستی کے کسی لڑکے کو وہ منہ نہیں لگاتی تھی۔

☆......☆......☆

یہی باتیں سوچتے سوچتے رات بیت گئی اور سورج نے انگڑائی لی اور بیدار ہوگیا۔ ہر طرف دن کا سماں سا ہوگیا۔ چہچہاتے پرندوں نے سورج کے نکلنے کی خبر دی۔ تو اویناش بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بانسری اٹھائے حویلی سے چپ چاپ باہر نکل آیا۔ گاؤں کے کچے پکے راستوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا وہ اس ندی کے کنارے اس پتھریلی جگہ پر آن پہنچا۔ جہاں وہ کل بیٹھا تھا۔

وہاں بڑے پتھر پر بیٹھ کر اس نے بانسری پر وہی سُر بکھیرا جو وہ پچھلے جنم میں بانسری سے نکالتا تھا۔ یہ اس کے سُر کا مخصوص مدھر پن تھا یا کوئی اور وجہ درختوں پر، آکاش پر اڑتے ہوئے پنچھی اچانک ہی بولنا چھوڑ گئے، جیسے ان کو چپ سی لگ گئی ہو۔

ہر طرف گمبھیر سناٹا سا چھا گیا۔ اس ماحول میں صرف بانسری کی آواز ہی گونج رہی تھی۔

ندی کے اس پار دور خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں تک بانسری کی آواز گئی تو روزمرہ کے کاموں میں مصروف گوری کے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس بانسری کی آواز، اس کا مدھر سنگیت اس کے من کے تاروں کو ہلانے لگا۔ اس کو لگا جیسے وہ کسی اور جہاں میں چلی گئی ہو۔ یہ اس بانسری کے سنگیت کا ہی اثر تھا کہ اس کے دماغ پر نشہ سا چھا گیا۔ سب کام چھوڑ کر اس بانسری کی آواز میں کھوئی ہوئی وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی اس طرف جانے لگی، جہاں اویناش بانسری بجا رہا تھا۔ تھوڑے ہی سے میں وہ اس کے سامنے تھی۔ اویناش نے کسی انسانی قدموں کی آواز سنی تو بانسری بجاتے رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا...... گوری اس کی طرف کھڑی دیکھ رہی تھی۔

بانسری کا ساز تھما تو گوری جیسے اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔ وہ حیران تھی کہ اتنی دور وہ یہاں کیسے بنا اپنی مرضی کے آگئی تھی۔ اپنے سامنے کل والے نوجوان کو دیکھ کر وہ پھر بوکھلا سی گئی۔

اویناش تو اس کو دوبارہ یوں اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ گوری جلدی سے واپسی کے لیے پلٹی کہ اویناش تیزی سے چلتا ہوا اس کے سامنے آگیا اور جلدی سے اس نے گوری کا ہاتھ تھام لیا۔ گوری نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''رادھا...... پہچانو مجھے۔ یاد کرو میں تمہارا کرشنا ہوں۔ پچھلے جنم میں ہم دونوں پریمی تھے۔''

''پچھلا جنم۔'' گوری بے یقینی سے بولی۔ ''تم کون ہو بابو۔ کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میرا ہاتھ چھوڑو، مجھے جانے دو۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

یہاں تک کہ اویناش کوئی اور بات کرتا دور جنگل کی طرف سے اس کو گھوڑا دوڑانے کی آواز آئی۔ خانہ بدوش قبیلے کا سب سے کڑیل جوان اور گوری کا سب سے مضبوط امیدوار 'راکا' اپنا گھوڑا تیزی سے دوڑاتا ہوا اِدھر ہی آرہا تھا۔ گوری نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ اویناش کی نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ اس نے گوری کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''تم نے ہمارے قبیلے کی لڑکی کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔'' راکا نے آگے بڑھ کر اویناش کو پکارا۔ ''تم نے گوری پر اپنی گندی نظر ڈال کر بُرا کیا۔''

راکا اتنی اونچی آواز سے چلا رہا تھا کہ اردگرد کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بندے ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

''چلو راکا یہاں تماشا نا بناؤ۔'' گوری راکے کو زبردستی وہاں سے واپس لے گئی۔ اب کی بار بھی اس نے کئی بار مڑ کر واپس اویناش کی طرف دیکھا۔

☆......☆......☆

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ مکھیا وجے کمار کے مہمان نے خانہ بدوشوں کے قبیلے کی لڑکی کو چھیڑا تھا۔ پورے گاؤں میں باتیں ہونے لگیں۔ شام تک تو یہ بات مکھیا کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔

مکھیا وجے کمار تو پہلے ہی اویناش سے خائف تھا، اب تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی پتنی کملا دیوی اور اپنی بیٹی پونم کو بلا کر دو ٹوک بات کی۔ پونم پوری بات سن کر چپ رہی۔ لیکن یہ بات سن کر اس کی ماں کملا حیران ضرور تھی۔ پونم نے تو اس کو بتایا تھا کہ اویناش بہت شریف مہذب لڑکا ہے۔ مکھیا وجے کمار کا غصہ عروج پر تھا۔

''بس بہت ہو گیا اب میں اس لڑکے کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کو کل صبح ہی اس گاؤں سے جانا ہوگا۔ تمہارے کہنے پر اتنے دن رکھنے کا انجام دیکھ لیا ہے میں نے۔''

''مگر پتا جی! یہ غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ اویناش ایسا لڑکا نہیں ہے۔'' پونم سب کچھ جانتی تھی۔ واقعی یہ سچ ہوگا۔ مگر وہ اپنے پتا کو آخر کس طرح سمجھاتی۔

پریشان کھڑی پونم اپنے پتا کا فیصلہ سن کر سوچ میں پڑ گئی۔

اویناش شام ہوتے ہی نیند سے بیدار ہوا۔ یک دم ہی اس کو گوری کی یاد ستانے لگی۔ بانسری ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکلا کہ پونم اس کے سامنے آ گئی۔ اس کی سُرخ آنکھیں دیکھ کر پونم کو لگا جیسے وہ چین سے سو نہیں پایا تھا۔ اس کے بکھرے بال، اس کا میلا لباس صاف طور پر بتا رہا تھا کہ وہ کتنا اَپ سیٹ اور ذہنی طور پر اپنے آپ میں نہیں ہے۔

''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ اویناش۔ اس وقت کہاں جا رہے ہو۔'' پونم اس سے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''اپنی رادھا سے ملنے۔''

''ہوں...... اپنا اور اپنے ساتھ میرا تماشا بنا رہے ہو۔ کیا حرکتیں کرنے لگے ہو اویناش۔''

''ہٹ جاؤ۔ پونم مجھے میری رادھا تک پہنچنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ تم بھی نہیں۔'' اس نے سختی سے پونم کو پیچھے کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل گیا۔

☆......☆......☆

''بھگوان کے لیے بابو یہ بانسری نہ بجاؤ۔ بند کرو اس بانسری کو۔'' اویناش نے بانسری ہونٹوں سے ہٹائی اور گوری کو اپنے ہاتھوں سے اوپر اٹھایا۔

''بابو! تم کون ہو۔ کیوں مجھے یوں تنگ کرتے ہو۔ اس بانسری کی آواز پر مجھے کچھ ہونے سا لگتا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا۔ کیا سحر ہے تمہاری اس بانسری میں۔'' وہ سسک پڑی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اویناش تڑپ اٹھا۔

''گوری تم یوں نہ رو۔ میں تمہیں یوں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ تم رادھا ہو اور میں تمہارا کرشنا۔''

''میں رادھا نہیں ہوں۔ میں گوری ہوں۔ رادھا میرا نام نہیں ہے۔ تم مجھے رادھا کیوں پکارتے ہو۔''

''میں اس جنم کی نہیں بلکہ ہمارے پچھلے جنم کا بتا رہا ہوں۔ پچھلے جنم میں تمہارا نام رادھا اور میرا نام کرشنا تھا۔''

''مجھے جانے دو بابو کسی نے دیکھ لیا تو بُرا ہوگا۔''

گوری واپس جانے کے لیے مڑی تو اویناش نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''گوری اگر تم کو میری باتوں پر وشواس نہیں تو تم خود آ کر دیکھ لو۔ وہ ٹھاکر رنجیت سنگھ کے محل کے کھنڈر اور کالی دیوی کا مندر آج بھی اس گاؤں میں موجود ہیں۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔ تم کو خود وشواس آ جائے گا۔''

گوری نا چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل دی۔ وہ جلد ہی گوری کو اس کھنڈر نما عمارت میں لے آیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

''دیکھو یہ کھنڈر یہ پرانی عمارت۔ یہ ٹھاکر رنجیت سنگھ کا محل تھا، اس محل میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔''

گوری غور سے محل کو دیکھنے لگی۔ مگر اس کی آنکھوں میں ابھی تک اجنبیت تھی۔

''گوری کچھ یاد آیا۔'' اویناش نے بے تابی سے پوچھا۔

''بابو مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔'' اویناش اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر آیا۔

''دیکھو وہ جگہ۔'' اویناش نے اس کھنڈر نما عمارت کے پیچھے دور اس جگہ اشارہ کیا جہاں اونچے بڑے مٹی کے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ پھر وہ خوشی سے چلا اٹھی۔

''کرشنا!''

اویناش کو اپنے آپ پر وشواس نہیں ہو رہا تھا کہ گوری کو اپنا پچھلا جنم یاد آ گیا تھا۔

''گوری تمہیں سب یاد آ گیا۔'' اویناش خوشی سے چہک اٹھا۔

''ہاں! مجھے سب یاد آ گیا۔'' گوری بولی۔ ''تم کرشنا ہو! میرے کرشنا۔'' خوشی سے گوری اس کے گلے لگ گئی۔

''گوری دیکھو کالی ماتا نے ہمیں پھر اکٹھا کر دیا۔ ہمیں

نیا جنم دیا۔ تا کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو سکیں۔

وہ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے آپس میں پیار بھری اپنے پچھلے جنم کی باتیں کرنے لگ گئے کہ وہ بوڑھا پجاری ان کی باتیں سن کر اپنی کٹیا سے نکل کر ان کے پاس آگیا۔

''پجاری جی دیکھو میری رادھا مجھے مل گئی۔ آپ سچ کہتے تھے۔''

پجاری کی حالت بھی دیدنی تھی۔ رادھا کے دوسرے جنم کو دیکھ کر وہ بھی ان دونوں کی خوشی میں بے انتہا خوش تھا۔

''مجھے پورا وشواس تھا۔'' پجاری اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بس میری یہ پرارتھنا ہے کہ اب مزید کوئی دکھ کی گھڑی تم دونوں کے پریم کے بیچ میں نہ آئے۔ میرا آشیرواد تم دونوں کے ساتھ ہمیشہ بنے رہے گا۔ جگ جگ جیو۔''

وہ دونوں آگے بڑھ کر پجاری کے چرنوں پر جھک گئے۔

☆☆

شام کے سائے پھیلنے لگے گوری کو نا پا کر اس کی موسی دوسری جھونپڑیوں میں جا کر گوری کا پتا معلوم کرنے لگی۔ مگر کسی کو گوری کے متعلق کوئی خبر نہیں تھی۔ موسی نے راکا سے گوری کی تلاش کے سلسلے میں بات کی۔

''اے راکا پتر نہ جانے گوری کہاں چلی گئی۔ جنگل میں لکڑیاں لینے گئی تھی۔ رات ہونے کو ہے مگر اب تک نہیں لوٹی۔ تُو پتا کر مجھے بڑی چنتا ہو رہی ہے، اس کی جوان چھوری ہے۔''

کھیتوں میں کام کرنے والے بندے شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اپنے اپنے گھروں میں واپس لوٹ رہے تھے، راکا نے ایک بندے کو روک لیا۔

''تم نے کسی لڑکی کو تو ادھر نہیں دیکھا۔ ہمارے قبیلے کی تھی۔ چولی اور گھگھرا پہنے ہوئی ہے۔''

''تمہارے قبیلے کی......'' وہ بندہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''ہاں یاد آیا۔'' وہ یک دم بولا۔ ''شام کے سمے ابھی دن ڈھلا تھا ایک لڑکی کو دیکھا تو تھا۔ تمہارے قبیلے کی ہی تھی۔''

''اچھا!'' راکا بے تابی سے بولا۔ ''کہاں دیکھا تھا۔''

''اس ندی والے کنارے پر اس نوجوان کے ساتھ جو مکھیا جی کا مہمان ہے۔ پھر وہ اس طرف نکل گئے جہاں کالی کا مندر ہے۔'' راکا غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے اور کوئی بات سنے بغیر مندر کی طرف گھوڑا بھگا دیا۔

کالی کے مندر کے قریب پہنچتے ہی اس کو وہ دونوں نظر آگئے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور ہنستے خوشی سے چہچہاتے اس کی طرف چلے آرہے تھے۔

''گوری!!'' راکا اتنی زور سے چلایا کہ وہ دونوں چونک گئے۔ راکا نے گھوڑا ان دونوں کے قریب روکا اور نیچے زمین پر اتر آیا۔

''تُو یہاں رات کے سمے اس نوجوان کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ غیر مرد کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ کون ہے یہ بابو۔'' راکا دھاڑ کر بولا۔

''راکا اوینا ش کوئی غیر مرد نہیں ہے۔ یہ تو میرا کرشنا ہے۔ صرف میرا کرشنا، میں اس سے پریم کرتی ہوں۔''

''گوری!'' راکا نے غصے میں ہاتھ اٹھا کر اس کو مارنا چاہا کہ اویناش نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''تُو نے اگر گوری پر اب کی بار ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ گوری سچ کہہ رہی ہے۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے پریم کرتا ہوں۔ جنم جنم سے ہمارا دونوں کا ساتھ ہے۔''

راکا کے لیے یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ اویناش پر چڑھ دوڑا، دونوں کی آپس میں مڈبھیڑ شروع ہو گئی۔

راکا غصے سے کانپتا ہوا لڑکھڑا کر بڑی مشکل سے قابو میں آیا اور قبیلے والوں کو لے کر حویلی میں پہنچ گیا۔

☆☆

اپنی حویلی میں خانہ بدوشوں کے اتنے سارے بندوں کو دیکھ کر مکھیا کا حیران و پریشان ہونا لازمی تھا۔ جلد ہی ساری صورت حال کا مکھیا کو علم ہو گیا۔ یہ بات کملا دیوی کے ذریعے پونم تک بھی جا پہنچی۔

”منکھیا وہ بے کمار تیرے اس مہمان چھوکرے نے ہماری بستی کی چھوکری پر پہلے بُری نظر رکھی اور آج اس کو ورغلا کر بھگا کر لے گیا ہے۔ ہمیں انصاف چاہیے منکھیا، ہماری عزت ہمیں واپس چاہیے۔ تُو اس گاؤں کا منکھیا ہے۔ ہمیں انصاف دینا تیری ذمے داری ہے۔“

اوبناش حویلی میں آن پہنچا اس کے ساتھ گوری بھی تھی۔ سب لوگوں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

”ارے میری بچی...... گوری تُو کہاں چلی گئی تھی۔“ گوری کی موسی تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اس کو گلے سے لگالیا۔

”موسی میں تو یہیں تھی میں نے کہاں جانا ہے۔“ گوری نے اپنی بستی کے سب لوگوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کو راکا کھڑا ہوا نظر بھی آیا۔ گوری کو سمجھنے میں ایک منٹ بھی دیر نا لگی کہ یہ سب راکا کی کارستانی ہے۔ وہی بستی کے لوگوں کو بھڑکا کر منکھیا کے پاس لایا ہے۔

منکھیا اوبناش کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں بولا۔

”بول نوجوان کیا سمبندھ ہے تمہارا اس گوری کے ساتھ کہ یہ اپنے قبیلے سے بغاوت پر اتر آئی ہے۔“

”سمبندھ...... سمبندھ تو بڑا پُرانا ہے۔ ہمارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے، آپ سب کو وشواس کرنے میں شاید سمے لگے۔“ اوبناش نے مختصراً اپنے پچھلے جنم کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

منکھیا کے ساتھ باقی سارے لوگ حیران اپنے پاؤں پر کھڑے جے کے جے رہ گئے۔ ان کے چہروں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اوبناش کے ساتھ کھڑی پونم کو بھی بخوبی اس بات کا اندازہ ہو چلا تھا۔

”ٹھیک ہے اگر آپ سب کو میری بات پر وشواس نہیں تو۔“ اوبناش نے ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ کالی دیوی کے مندر کے بوڑھے پجاری سے خود ساری حقیقت جان سکتے ہیں۔ ابھی دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

اوبناش نے اتنے پُرعزم لہجے میں کہا کہ راکا کا من ڈولنے لگا۔ اس کو ایک دم ہی لگنے لگا جیسے اوبناش کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ پجاری سے یوں ملنے کی بات کرنا اور گوری کا اٹل وشواس یوں آپس میں ان دونوں کی پریم کی نظر آتی طاقت...... راکا کو خطرے کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں۔

اوبناش کی بات ان سب کے لیے حیرت انگیز تو تھی مگر آخر منکھیا اور بستی کے چند بوڑھوں کے مشورے پر وہ سب آخر اس ساری حقیقت کو جاننے کے لیے مندر کے بوڑھے پجاری کے پاس جانے کو تیار ہو گئے۔ راکا جو وہاں کھڑا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا فوراً پہلے ہی وہاں سے نظر بچا کر بھاگ نکلا اور طوفان کی تیزی سے بھاگتا ہوا کچھ ہی دیر میں کالی کے مندر جا پہنچا۔ اس کے مندر میں پجاری کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر پجاری نہ ملا۔ راکا کی نظر مندر کے ساتھ بنی چھوٹی سی کٹیا پر جا پڑی۔ وہ جلدی سے کٹیا کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس بوڑھے پجاری کو سامنے چارپائی پر لیٹے پایا۔ راکا کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ سی آگئی۔

راکا اس کا گلا اور زور سے دبانے لگا۔

”پاپی ہے تُو۔ تُو جتنی مرضی کوشش کرلے، ان دونوں پریمیوں کو ایک ہونے سے نہیں روک سکتا۔ کالی ماتا تیرا سروناش کرے گی۔“ بوڑھے پجاری کی بمشکل آواز نکلی۔ راکا اس کا گلا دبانے میں مصروف رہا۔ جب تک اس پجاری کی بدن سے جان نہیں نکل گئی۔

بوڑھے نے زور سے اونچی سانس لی۔ جو اس کے جیون کی آخری سانس تھی۔ پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

اتنی دیر میں منکھیا ان سب لوگوں کا ہجوم لے کر کالی کے مندر جا پہنچا تھا۔ راکا نے جب یہ ساری صورت حال دیکھی تو فوراً ہی کٹیا سے نکل کر مندر کے پیچھے جا چھپا۔ ہجوم کالی کے مندر پہنچا تو وہ احتیاط سے دوبارہ ہجوم میں داخل ہو گیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نا ہو سکی۔ لیکن اوبناش کا اس کو ہجوم میں دیکھتے ہی شک سا ہونے لگا کہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ یہاں آتے سے راکا ہجوم میں نہیں تھا۔ منکھیا کے ساتھ چند اور بندے پجاری کی کٹیا میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پجاری سے بات کرنے کی کوشش کی۔ مگر پجاری تو اپنی جیون کی بازی ہار چکا تھا۔ منکھیا نے

پجاری کو ہلایا جُلایا۔ اس کی نبض اور سانس چیک کی...... پجاری کی نبض بند تھی اور سانس رک چکی تھی۔

''او...... پجاری کا تو دیہانت ہو گیا ہے۔''

مُکھیا کے ساتھ باقی سب نے بھی چُپ سادھ لی۔ اویناش کو اس بات کی توقع نا تھی کہ وہ بوڑھا پجاری یوں اچانک مر جائے گا۔ مُکھیا نے کُٹیا سے باہر نکل کر سب لوگوں کو اطلاع دی۔ اویناش کی نگاہ راکا پر جا پڑی جس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کو لگا جیسے پجاری کے مرنے میں اس راکا کا ہی ہاتھ ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر راکا کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''اس نے پجاری کی ہتھیا کی ہے۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ سچائی آپ سب پر واضح ہو۔ بول تُو نے ایسا کیوں کیا۔'' وہ اس سے الجھ پڑا کہ لوگوں نے اس کو پکڑ کر ایک طرف کیا۔

''پجاری کا تو دیہانت ہو چکا ہے۔ اب کس سے پوچھا جائے۔ تم اپنی گواہی میں کوئی اور ثبوت پیش کر سکتے ہو، تو پھر بات ہے۔'' بستی کے باقی بڑے بوڑھوں نے مُکھیا کی بات میں ہاں ملائی۔

''ثبوت......'' اویناش کچھ سے سوچتا رہا۔ ''میں۔ میں آپ سب کو وہ پیپل کا درخت دکھاتا ہوں جس کے تنے پر میں نے اور گوری نے پچھلے جنم میں اپنا نام لکھا تھا۔ کرشنا اور رادھا۔'' وہ مندر سے اتر کے تیزی اس درخت کی جانب بڑھا۔ جو مندر کے پاس ہی دائیں طرف اُگا ہوا تھا۔ وہ صدیوں پرانا قدیم درخت تھا۔ گاؤں والے یہ سب جانتے تھے۔ ''یہ دیکھیں اس پر نام واضح لکھا ہوا ہے۔''

مُکھیا کے ساتھ باقی سب نے بھی دیکھا، واقعی اس پر کرشنا رادھا لکھا ہوا تھا۔

راکا اس کی طرف دیکھتے ہوئے طنز بھرے لہجے میں بولا۔ ''کیا پتا کہ تم نے یہ نام اب لکھا ہو۔''

''اچھا میں آپ سب کو وہ جگہ دکھاتا ہوں جہاں پچھلے جنم میں مجھے اور گوری کو دفن کر دیا گیا تھا۔ اس مندر کے پیچھے آپ سب آؤ میرے ساتھ۔''

وہاں پر جا کر اس نے اس جگہ کی تصدیق کی۔ ''اس جگہ پر میں قتل کر کے دفن کر دیا گیا تھا۔''

اس کی بات پر فوراً ہی سے اس جگہ کی کھدائی شروع کر دی گئی۔ آدمی کھدائی کرتے رہے مگر اس میں کچھ نہیں نکلا۔

مُکھیا اور باقی سب لوگوں کو مایوسی ہوئی۔

''مُکھیا جی آپ خواہ مخواہ اس شہری بابو کی باتوں میں آ گئے ہیں۔ ارے جھوٹا ہے، پاپی ہے یہ۔'' راکا مسکراتے ہوئے مُکھیا سے بولا۔ مُکھیا خاموش رہا کہ اچانک کھدائی کے دوران کچھ انسانی ہڈیاں نظر آنے لگ گئیں۔ کھوپڑیاں، ہاتھ اور ٹانگوں کی ہڈیاں جن کی حالت بہت خستہ اور پرانی ہو رہی تھی۔

شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ پورن ماشی کی رات تھی۔ مُکھیا کو فیصلہ کرنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ ثبوت کو مدنظر رکھ کر فیصلہ اویناش کے حق میں ہی جانا چاہیے تھا۔ مگر بستی والوں کی بات میں بھی کچھ وزن تھا۔ واقعی ہڈیاں نظر تو آئیں مگر ان سے پہچان ممکن نہیں تھی کہ واقعی یہ پہلے جنم کے کرشنا اور رادھا کے جسموں کی ہڈیاں ہیں یا نہیں...... آخر کافی سوچ بچار کر مُکھیا ان سب لوگوں کو لے کر واپس حویلی آ گیا۔ حویلی میں گوری کے ساتھ پونم کو بھی سب معاملے کی خبر ہو گئی۔

تبھی پونم کمرے میں اچانک آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے میں لپٹی کوئی شے تھی۔ مُکھیا نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

''پتا جی میں کچھ آپ کو دکھانا چاہتی ہوں۔ یہ دونوں سچے ہیں یا جھوٹے۔ میرے پاس اس کا ثبوت ہے پتا جی۔''

''پونم...... ثبوت اور تمہارے پاس۔'' مُکھیا کے ساتھ باقی سارے لوگ بھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ گوری اچانک اپنا ہاتھ راکا سے چھڑا کر اویناش کی طرف بھاگ نکلی۔ پونم نے کپڑے میں موجود وہ رادھا والی مورتی ان سب کے سامنے کر دی۔ گوری کے ساتھ باقی سب لوگوں کو جھٹکا لگا۔ وہ ہو بہو گوری کی شکل کی مورتی تھی۔

''یہ میری مورتی ہے!'' کرشنا نے پچھلے جنم میں میری لیے بنائی تھی۔

یہ اویناش اس مورتی کو اس دن لے کر آیا تھا جس دن اس پجاری نے اس کو اس کے پچھلے جنم کے بارے میں بتایا تھا۔

''پتا جی اویناش اور گوری کوئی عام پریمی نہیں ہیں۔ جنم جنم کے ساتھی ہیں، فیصلہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

بات سب پر اب مکمل کر سامنے آچکی تھی۔ اب اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ ٹھکیا تو پہلے ہی وشواس کر بیٹھا تھا۔ مگر اب بستی کے سارے لوگوں کو بھی وشواس کرنا پڑا۔ یوں بنی بنائی بات بگڑ جائے گی راکا کے ہوش وحواس کو بھی اس بات کی خبر نہ تھی۔ اس نے تھوڑی بہت حیل و حجت کرنے کی کوشش کی۔

مزید وقت ضائع کیے بغیر آج رات ہی ان دونوں کو سات پھیروں کے ساتھ اٹوٹ بندھن میں باندھنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ حویلی کو سجایا جانے لگا۔ آنے والے لوگوں کے لیے کھانوں کی دیگیں پکنے لگی۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔

پونم نے گوری کو اپنے ہاتھ سے دلہن بنایا۔ ساتھ والے گاؤں کے پجاری کو بلوا کر کالی ماتا کے مندر میں کالی دیوی کو ساکشی مان کر سات پھیرے لے کر وہ بیاہ کے بندھن میں بندھ گئے۔

☆☆

اویناش اندر کمرے میں گیا جہاں گوری دلہن بنی اس کی منتظر تھی۔ دلہن کے روپ میں وہ کوئی اپسرا آکاش سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔

''گوری آج میں اتنا خوش ہوں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ سنسار کی ساری خوشیاں یک دم میری جھولی میں آن گری ہوں۔'' گوری اس کی بات پر مسکرا دی۔

''میں جانتی ہوں اویناش میرے من کی بھی حالت ایسی ہی ہے۔''

ہاں..... گوری میں بھی اسی سمے کے انتظار میں تھا۔

اویناش نے مسکرا کر اپنی جیب سے وہ بڑے بڑے کالے موتیوں کی مالا نکالی۔ یہ موتیوں کی مالا ان کے ہر جنم کا سرمایہ تھی، اسی مالا کے پہننے سے ان دونوں کا پریم ساتوں جنم کے لیے امر ہو جاتا تھا۔

پھر اس شبھ گھڑی کا انتظار چند سالوں پر تو محیط نہیں تھا۔ ایک صدی بیت چکی تھی۔ اویناش نے موتیوں کی مالا گوری کے گلے میں پہنانے کے لیے ہاتھ آگے کیا کہ یک دم ہی کھڑکی سے ایک انسانی سایا اندر کمرے میں آن کودا۔ اویناش اور گوری نے بے اختیار کھڑکی کی جانب دیکھا۔

کھڑکی کے پاس کوئی اور نہیں بلکہ راکا اپنے ہاتھ میں بڑا سا خنجر ہے ان دونوں کو غصے سے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''را..... کا..... تو یہاں.....'' گوری اس کو دیکھ کر بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔

''ہاں..... تُو نے یہ کیسے سوچ لیا تھا گوری کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے کسی اور کی ہونے دوں گا۔ مجھے چھوڑ کر کسی اور کے سنگ اپنا جیون بتانے چلی تھی پاگل لڑکی۔ تجھے تو بعد میں دیکھوں گا۔ پہلے اس مردود کے جیون کا انت کر دوں۔ جس کے پریم میں تُو نے مجھے ٹھکرا دیا۔ تم دونوں کے جیون کا انت میرے ہاتھوں سے ہوگا۔''

راکے نے خنجر پہلے گوری کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ زہر سے بھرے تیز دھار والے خنجر کے وار سے گوری شدید زخمی ہو کر فرش پر گر پڑی۔

اویناش کے منہ سے دردناک چیخ نکلی اور زمین پر ڈھے گیا۔ راکے نے خنجر سے پے در پے وار کر کے اویناش کا سینہ زخمی کر دیا۔ اویناش کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ وہ درد کے مارے کراہ اٹھا۔

کمرے میں چیخوں کی آوازیں سن کر حویلی کی ملازمہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔ یہ سب دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ چلاتے ہوئے حویلی میں بتانے کے لیے واپس بھاگی۔ راکے نے موقع غنیمت جان کر جلدی سے دوبارہ کھڑکی سے باہر کی طرف کودا اور بھاگ نکلا۔

اویناش کی آنکھوں کے آگے موت کے سائے منڈلانے لگے۔ اس کے پاس اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر دوبارہ گوری کی حالت دیکھ سکے۔ گوری کی سانسیں

ابھی چل رہی تھیں۔

''اویناش......'' وہ پھر اکھڑی ہوئی سانس سے بولی۔ ''میں...... میں...... اویناش...... اب دوبارہ اگلے جنم میں تیرے بغیر بھٹکنا نہیں چاہتی...... میں اب جدائی کی اذیت...... برداشت...... نہیں کرسکتی۔''

اویناش نے بمشکل سر اٹھایا ''گوری......'' وہ درد آمیز لہجے میں بولا۔

''اویناش...... مجھے جنم جنم جدائی سے ہمیشہ کے لیے مکت کرنا ہوگا۔''

''گوری...... میں...... بھی...... یہی چاہتا ہوں۔'' اویناش اپنے زخمی بدن کو گھسیٹتے ہوئے اس کے پاس آگیا۔

''اویناش۔ تجھے وہ مالا میرے گلے میں پہنانا ہوگی......'' گوری کی آنکھیں دوبارہ بند ہونے لگیں۔

اویناش نے اپنے دائیں طرف اور پھر بائیں طرف ہاتھ مارا کہ اچانک مالا اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اویناش نے کانپتے ہاتھ سے مالا اٹھائی۔ گوری نے آخری بار اپنی بند ہوتی آنکھوں سے اویناش کو اور پھر اس کے ہاتھ میں پکڑی مالا کو دیکھا۔

اویناش نے ایک ہاتھ سے مالا گوری کے گلے میں ڈال دی۔ گوری کے منہ سے آخری ہچکی نکلی۔

''گوری اب ہر جنم میں ہم تم ساتھ ہوں گے۔'' گوری کے ہونٹ تھرتھرائے۔ چہرے پر سکون سا اُمڈ آیا۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ فوراً ہی اویناش کی گردن بھی ایک طرف ڈھلک گئی۔

حویلی میں ایک شور سا اٹھ گیا۔ پونم اور اس کے ماتا پتا فوراً اویناش کے کمرے کی طرف بھاگے۔ آگے نظر آتا وہ دردناک منظر ان کی آنکھوں میں آنسو لے آیا۔

کمرے میں انہوں نے دونوں پریمیوں کو مردہ حالت میں پایا۔ اپنے پہلے جنم کی طرح اذیت سے وہ دونوں اسی طرح ہو بہو مرے تھے۔ اویناش کی لاش فرش پر پڑی تھی اور گوری اس کے سینے پر سر رکھ کر اپنے جیون کی بازی ہار چکی تھی۔ مگر وہ اس جنم میں وہ مر کر بھی اپنا پریم امر کر گئے تھے۔

☆☆☆

جینے نہیں دوں گی

سدرہ انور علی

محبت کی آگ میں جلنے والے اگر محبت نا پاسکیں تو مر کر بھی جینے نہیں دیتے

سوہنی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ بہت ہی لاڈ پیار میں پلی ہوئی سوہنی کے والدین ،اس کی ناز برداریاں کرتے ہوئے نہ تھکتے۔ جائز تو جائز نا جائز خواہش بھی اس کی پوری کی جاتی۔سوہنی تھی بھی تو بہت خوبصورت،شرارتی، چنچل، نٹ کھٹ سی سرخ و سفید اونچی لمبی۔اسکول ہو یا کھیل ہر جگہ آگے آگے۔والدین کے بے جالاڈ پیار نے اسے بگاڑا نہیں بلکہ سنوارا تھا۔ لیکن سوہنی کی ایک عادت کی بہت بری تھی۔اور وہ تھی بدلہ لینے کی عادت۔اگر کوئی اسے ناحق تنگ کرتا، چھیڑتا ،مارتا تو جب تک وہ بدلہ نہ لے لیتی اسے چین نہ آتا۔

اس کی دوستوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔لیکن زیبا اس کی بیسٹ فرینڈ تھی۔کلاس ہو اسکول گراؤنڈ ہو کہ وہ پارک ہو یا مارکیٹ وہ ہر جگہ ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں۔یوں کہنا غلط نہ ہوگا۔ایک جان دو قالب چونکہ ان کے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے ایک ہی گلی میں اس لیے ہر جگہ اکٹھیں پائی جاتیں۔

☆......☆......☆

''سوہنی! اری سوہنی! بھئی جلدی کرو آٹھ بجنے میں بیس منٹ باقی ہیں اور پورا آدھا گھنٹہ پیدل بھی چلنا ہے اوپر سے گرمی دیکھو۔سورج ابھی سے آگ برسا رہا ہے۔اور تم ہو کہ گھر کے کمرے سے نکل ہی نہیں رہی ہو۔'' زیبا دور سے ہی سوہنی کو آوازیں دیتی ہوئی آرہی تھی۔

''اتنی کیوں باؤلی ہوئی جارہی ہو۔پہنچ جائیں گے جلدی ہی۔'' سوہنی کمرے سے برآمد ہوئی۔

مئی کا مہینہ تھا سردیوں کو رخصت ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔دھوپ کی تمازت نے سارے ماحول کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا وہ دونوں بہت تیزی سے اسکول کی جانب جارہی تھیں۔ابھی بمشکل پندرہ بیس منٹ کا سفر طے کیا ہوگا کہ زیبا نے سوہنی کو کہنی مار کر کہا۔

''دیکھو تو سوہنی یہ لڑکا دوسری بار یہاں سے گزرا ہے۔تیرے چہرے پہ نظریں گاڑھے ہوئے ہے۔''

''تو کیا ہوا ہوگا کوئی راہی۔''

نہیں پگلی دیکھ وہ پھر ہمارے پیچھے آرہا ہے۔'' سوہنی کے برابر سے گزرتے ہوئے اس نے سوہنی سے آنکھیں ملائیں بس بے اختیار ہی سوہنی کی نظریں اوپر اٹھی تھیں۔ لڑکے کی نظریں اپنے چہرے پر گڑے کو دیکھ کر وہ کھول اٹھی غصے سے اس کی رگیں تن گئیں۔اس سے پہلے کے سوہنی کچھ کہتی وہ لڑکا آگے جا چکا تھا۔سوہنی اور زیبا کا اسکول قریب آچکا تھا۔وہ دونوں اسکول میں داخل ہوگئیں۔سارا دن اس کا پڑھائی میں دل نہ لگا۔وہ بہت مضطرب اور پریشان رہی

اور سوچتی رہی کہ نجانے کب سے وہ لڑکا ہمارے پیچھے ہے ؟لیکن سونی نے سوچ لیا تھا کہ اُسے کیسے سبق سکھانا ہے۔

واپسی پر سونی نے ادھر اُدھر لڑکے کو دیکھنا چاہا۔ سامنے ہی وہ لڑکا کھڑا تھا جب اس نے دیکھا کہ لڑکی مجھے ڈھونڈ رہی ہے تو وہ زیرلب مسکرایا اور ان دونوں کے پیچھے چلنے لگا ۔سڑک پر اور طالبات اور لوگ جا رہے تھے۔ سونی کا تو جی چاہ رہا تھا لڑکے کا دماغ صاف کر دے لیکن زیبا اسے روک رہی تھی۔ آگے ایک لمبی سی گلی آ رہی اچانک ہی اس لڑکے نے آگے ہاتھ بڑھایا اس کی مٹھی میں کاغذ کا پرزہ دبا ہوا تھا۔ سونی نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا لڑکے کو اتنی توقع نہیں تھی وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب تک سونی اور زیبا گلی کا موڑ نہ مڑ گئیں۔

دیکھ زیبا میں اسے ایسا سبق سکھاؤں گی کہ تا قیامت یاد رکھے گا۔ اب وہ آ کر دکھائے ہمارے پیچھے اس کی اتنی جرأت کہ میری طرف ہاتھ بڑھائے۔ ہاتھ توڑ دوں گی میں اس کے۔''

اس کے بعد بھی وہ سونی اور زیبا کو کئی جگہ نظر آیا لیکن دور دور ہی رہتا۔ اس نے پھر کبھی ان کے نزدیک آنے کی غلطی نہیں کی۔ دن اسی طرح گزرتے جا رہے تھے اور سونی کے غصے میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس لڑکے کو کچا چبا ڈالے۔

☆......☆......☆

آج بہت دن بعد موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہر سُو چل رہے تھے۔ پرندوں کی چہکار نے ماحول کی خوشگواریت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ سونی اور زیبا بازار جانے کو تیار تھیں۔ سونی کی ویسے بھی عادت تھی کہ عصر کی نماز پڑھ کر بازار جاتی۔ اس وقت شام کے سائے پھیل رہے ہوتے۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس وقت شاپنگ کرنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ وہ دونوں خراماں خراماں چلی جا رہی تھیں۔ مارکیٹ پہنچ کر وہ دونوں سب سے پہلے دہی بڑے کی شاپ میں داخل ہو گئیں۔ ابھی وہ بیٹھنے ہی نہ پائیں تھی کہ زیبا کی نظر سامنے پڑی۔ وہاں ایک کرسی پر وہی لڑکا بیٹھا تھا۔ ہاتھ تھوڑی تلے رکھے کچھ پریشان سا۔ سیاہ ٹراؤزر اور سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ، بڑھتی ہوئی شیو، ماتھے پر آئے ہوئے بال اس کا سراپا وجیہہ بنا رہے تھے۔ وہ بھی ان دونوں کو



دیکھ چکا تھا سوہنی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی یک دم وہ اٹھ کر ان کے قریب آ گیا اور بولا۔

"پلیز! آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" سوہنی کی پھنکار اس قدر شدید تھی کہ اس شاپ کے درودیوار اور وہاں موجود ہر شخص لرز اٹھا۔

"کون سا نمبر دوں جوتے کا یا سینڈل کا۔ بتا کون سا نمبر دوں؟" بے اختیار ہی سوہنی کا ہاتھ نیچے ہوا اور اس نے ایک گلاس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ گلاس کی ضرب اس قدر شدید تھی کہ اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ آس پاس کی دکانوں کے لوگ اکٹھے ہو گئے سب اس لڑکے کے گرد جمع ہو گئے۔ اور یہی موقع غنیمت تھا جب زیبا نے تقریباً کھینچنے کے انداز میں سوہنی کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے دکان سے باہر لے آئی۔

کسی کی نظر اس کی طرف نہیں پڑی یا کسی نے توجہ نہیں دی۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بنا وہ آگے بڑھتی چلی گئیں اور گھر آ کر سانس لیا۔

زیبا نے سوچا اب اس پاگل لڑکی سے بات کرنا بھی فضول ہے کجا کہ سمجھانا۔ سوہنی پر کوئی اثر نہیں ہونا۔

زیبا اب دل ہی دل میں پریشان تھی کہ اب بات آگے بڑھ جائے گی۔ اب تو وہ لڑکا ہم سے بدلہ ضرور لے گا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر بھی واپس آیا ہے؟

اسی بات کا زیبا کو ڈر تھا جو ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

یہ اس سے اگلے دن کی بات ہے اسکول سے واپسی پر وہ لڑکا پھر ان کے پیچھے چل پڑا اور کہنے لگا کہ "میں آپ سے سچی محبت کرتا ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یقین کیجیے میرا خود پر اختیار نہیں۔" لڑکے کے ماتھے پر اب بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بہت آس بھری نظروں سے سوہنی کی جانب دیکھ رہا تھا سوہنی بھی شاید کسی کمزور لمحے کی زد میں آ چکی تھی۔ جو اب تک خاموش کھڑی تھی۔ یکا یک سوہنی نے چہرہ اوپر اٹھایا بے بس ہوتے دل کو تھپکی دی۔ دماغ کو جھٹک کر وہ لڑکے کی جانب بڑھ گئی۔ سوہنی بھی صارم سے محبت کرنے لگی تھی شدید اور ٹوٹ کر ایسی محبت جس میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔

سوہنی کو صارم کے علاوہ نہ کچھ سوجھتا نہ کچھ نظر آتا۔ بہت سارا وقت گھر ہو یا کالج سوہنی موبائل پہ صارم سے باتوں میں لگی رہتی اب سوہنی کالج میں آ چکی تھی۔ صارم بھی اسی کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک دوسرے میں اس قدر مگن ہو گئے کہ انہیں دنیا جہاں کی کچھ فکر نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو زیبا کلس کر رہ جاتی کہ سوہنی نے بالکل نے اسے بالکل اگنور کر دیا تھا یا محبت چیز ہی ایسی ہے جو ہر چیز سے بے پرواہ کر دیتی ہے۔ دن یونہی پر لگا کر اڑتے جا رہے تھے ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل گئے۔ سوہنی کی صارم سے منگنی ہو چکی تھی۔ سوہنی کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ صارم اسے بالکل وقت نہیں دے رہا ہے ہر وقت کسی اور سے فون پہ باتیں کرتا رہتا جب بھی فون کرتی نمبر بزی ملتا۔ سوہنی کئی بار شکوہ بھی کر چکی تھی صارم سے لیکن وہ ہر بار کوئی نا کوئی بہانا کر کے سوہنی کو ٹال دیتا سوہنی کے دل میں ہول اٹھتے کہ صارم کسی اور کو چاہنے لگا ہے مرد کی فطرت ہی یہی ہے۔

☆......☆......☆

بارش نے بھی شاید آج نہ رکنے کی قسم اٹھا رکھی تھی ہر طرف جل تھل ہو رہی تھی۔ کالج کی دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے گملے اور درخت دھل کر مزید نکھر گئے تھے۔ سوہنی خاموشی سے اس برستی بارش میں کالج کے برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ اس خوبصورت موسم نے بھی اس کی اداسی کم نہ کی تھی۔ وہ تو اس ٹھنڈے موسم میں بھی اندر جھلس رہی تھی۔ نرم ٹھنڈی پھوار بھی اس کے جذبات کی آگ کو کم نہیں کر سکی تھی۔ اس کا دوپٹہ ڈھلک کر شانوں پر آ گرا تھا۔ یکدم اسے سامنے سے صارم آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سوہنی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ سوہنی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا۔

"صارم اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ پڑھائی تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی اب میرا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا۔" صارم نے سر اٹھا کر دیکھا اور استہزائیہ انداز میں زوردار قہقہہ لگایا۔

"میں اور تم سے شادی؟ ناممکن ایسا کبھی بھی ہو سکتا کہ میں تم سے شادی کر لوں وہ سوہنی کے تھوڑا اور نزدیک ہوا اور آہستہ سے کہا۔

سونی وقار احمد! کیا تمہیں وہ دن بھول گیا، جب تم نے میرے سر پر گلاس مارا تھا بھری مارکیٹ میں میری انسلٹ کی تھی۔ مجھے تم سے کوئی پیار نہیں ہے اور تم ہو کہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ مجھ سے صارم چوہدری سے دوستو! سنو یہ لڑکی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

اردگرد بیٹھے ہوئے اور جاتے ہوئے تمام طلبا و طالبات مڑ مڑ کر سونی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سونی نے ساکت چہرے کے ساتھ صارم کی طرف دیکھا اور نظریں بے یقینی انداز میں صارم کے چہرے پر گاڑھ میں سونی کے ہونٹ پھڑ پھڑائے۔ پورے جسم میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ صارم نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ نارسائی اور ناقدری کے شدید احساس نے اسے توڑ کے رکھ دیا۔ اس لمحے اسے لگا وہ مر چکی ہے۔ مگر وہ سانس تو لے رہی تھی کہتے ہیں کہ اگر کسی انسان کے خواب مر جائیں تو درحقیقت وہ انسان بھی اسی وقت مر جایا کرتے ہیں۔ مگر وہ موت کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔

سونی ایک عذاب کی مانند زندگی گزار رہی تھی، جدائی کا عذاب پہلے ایک زندہ اور شوخ وشنگ لڑکی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور دل رکھنے والی اتنی قریبی اور خون کے رشتے موجود ہونے کے باوجود وہ صارم کے لیے ترستی تھی۔ تنہائیوں میں روتی تھی۔ آخر اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ یکدم سونی کے دماغ میں ایک کوندا لپکا اور اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔ اپنی ماں سے اجازت لے کر وہ زیبا کے گھر چلی گئی کیا کرنے والی تھی وہ اب؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

زیبا سونی کو دور سے ہی مطمئن انداز میں آتے دیکھ کر کھلکھلا اٹھی تھی۔ سونی نے اس کے پاس آ کر کہا۔

"زیبا تم چاہتی ہو نا کہ میں خوش رہوں تو تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

"کیوں نہیں سونی" زیبا اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے کسی ایسے عامل کے پاس لے چلو جو کالے جادو کی سمجھ رکھتا ہو۔"

"ہیں کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟" زیبا حیرانی سے سونی کا منہ تک رہ تھی۔ مجھے بہت جلدی ہے پلیز زیبا۔"

بہت سوچنے کے بعد اسے ایک ایسے عامل کا پتا ملا جو کالا جادو کرلیتا تھا۔ ایسا جادو جو انسان کو تڑپاتے تڑپاتے قبر میں سلا دیتا ہے۔ عامل عامر شاہ بنگالی۔

سونی وہاں سے اٹھ کر سید ھا بنگالی کے آشیانے کی طرف چل پڑی۔ زیبا بھی اس کے ساتھ تھی جونہی وہ اندر داخل ہونے لگیں سامنے سے موٹر سائیکل پہ آتے ہوئے صارم کی نگاہ سونی پر پڑ چکی تھی۔ سونی اور زیبا اندر جا چکی تھیں اندر کیا ہوا صارم نہیں جانتا تھا۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد صارم اندر داخل ہوگیا۔ لڑکیاں عامل سے کیا کہہ کر اور لے کر گئی تھیں اس نے کچھ پیسوں کا لالچ دے کر سب کچھ اگلوا لیا۔ اب اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ تقدیر، طوفان، موت، جہنم، زہریلے سانپ ان میں سے کوئی اس قدر خراب نہیں جتنی عورت ہے۔

☆......☆......☆

سورج اپنی گردش مکمل کرتے ہوئے غروب ہو چکا تھا۔ دھوپ کسی پرندے کی طرح اپنے پر سمیٹ چکی تھی۔ شام کے گہرے سائے ہوتے ہوتے گھور اندھیرا چھا گیا۔ چودھویں کا چاند آہستہ آہستہ اوپر آ رہا تھا نرم چاندنی ہر سو اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ مدھم روشنی نے سارے ماحول کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ دفعتاً ایک مکان سے دو سائے آہستگی سے باہر نکلے ان کا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ وہ دونوں سائے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے، اردگرد کا جائزہ لیتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی مشکل پندرہ منٹ کا سفر طے کیا ہوگا کہ قبرستان سے کچھ فاصلے پر ایک اور سایہ ان کے پیچھے چل دیا۔ وہ بہت محتاط انداز میں ہر طرف دیکھ کر دبے پاؤں چل رہا تھا کچھ دور ہی گئے ہوں کہ دفعتاً اگلے دو سایوں کو اپنے پیچھے کچھ سرسراہٹ سنائی دی۔ خوف سے ان کی آنکھیں پھیلنے لگیں، پچھلا سایہ کسی اوٹ میں ہوگیا۔ اس کا ہاتھ پینٹ کی سائیڈ پہ گیا جہاں ایک خنجر اڑسا ہوا تھا۔ اگلے سایوں کو اب کچھ ڈر سا لگا۔

قبرستان میں داخل ہو کر انہوں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، ان کے ہاتھ میں ایک تھیلے میں کچھ سامان تھا۔ قبرستان میں ہُو کا عالم تھا۔ ہر طرف پھیلا سناٹا اور بھی

دہشت پھیلا رہا تھا۔ ماحول میں وحشت ناک خاموشی طاری تھی مگر کبھی کبھار جھینگروں، کتوں کی آوازیں ماحول میں سنسنی پیدا کر دیتی تھیں۔ ایسے میں دو سائے اچانک ایک قبر کے پاس رک گئے وہ دو سائے ایک سوہنی اور زیبا کے تھے۔ انہوں نے تھیلے سے کھرپا نکالا اور مٹی کھودنا شروع کی۔ تیسرا سایہ جو کہ صارم تھا وہ ان کے بالکل قریب آ چکا تھا۔ اسے پہچاننے میں ناکامی ہو رہی تھی کہ سوہنی کون ہے؟ اچانک اس نے خنجر باہر نکالا۔ ان کے پیچھے جا کر کہا "مردود عورت تجھ سے شادی نہیں کی تو میری زندگی میں زہر گھولنے کھڑی ہوگئی؟" اس نے اس کے ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر دل کے مقام پہ ایک وار کیا اور پھر دوسرا بھی۔ وہ زیبا تھی۔ سوہنی بھاگنا چاہتی تھی کہ اس نے سوہنی کو بھی بے دردی سے خنجر کے وار سے ختم کر دیا۔ سوہنی کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں زیبا کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اور ان میں یہی سوال تھا کہ میرا صارم آج بہت عجلت میں تیار ہو کر یونیورسٹی پہنچا تھا۔

کچھ مہینوں سے اس کی راتوں کی نیند حرام تھی۔ یونیورسٹی پہنچ کر وہ اپنے دوست خرم کے پاس پہنچا جو کہ اپنی گرل فرینڈ ماہی کے پاس خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ان کے پاس بیٹھے اسے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اس نے سفید کپڑوں میں ملبوس سوہنی کو خرم کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے دیکھا۔ صارم اچھل کر پیچھے ہٹا۔ ماہی نے حیران نظروں سے اسے دیکھا لیکن خرم ایک جگہ پر جما بیٹھا تھا۔ اچانک اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ پوری یونیورسٹی میں ایک کہرام برپا تھا۔ خرم کی شہ رگ پر ایک نیلے رنگ کا نشان تھا۔ اس کے پورے جسم میں ایک قطرہ بھی خون کا باقی نہیں تھا۔ سب حیران و پریشان تھے ۔ پولیس بھی اس معمے کو حل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ صارم کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے ۔ وہ سارا دن بہت پریشان رہا تھا ۔ کروٹ پہ کروٹ بدل رہا تھا۔ نیند تھی کہ آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک اس کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس نے حیران ہو کر دیکھا رات کے 2:30 بج رہے تھے۔ دستک پھر ہوئی اس نے اندر سے ہی پوچھا۔

"کون" باہر سے کوئی آواز نہیں آئی اچانک اس نے مڑ کر دیکھا تو کرسی پر معصوم پری پیکر سوہنی براجمان تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی سفاکیت تھی کہ خوف کے مارے صارم کا دل لرز اٹھا۔ وہ لاک کھول کر باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ دروازے تک ہی نہیں پہنچ رہا تھا اور وہ ایک ہی جگہ جم گیا تھا۔ وہ سوہنی کی طرف دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ انتقام کی آگ سے شعلے اٹھ رہے تھے سوہنی نے ایک تفرتی قہقہہ لگایا اور اسے اس حالت میں دیکھ کر ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی کی حدود میں لوگ آ جا رہے تھے کہ ایک گاڑی مین گیٹ کے پاس آ کر رکی اور اس میں سے ایک لڑکا آذر اور لڑکی کرن باہر نکلے وہ دونوں ایک دوسرے سے بے لوث محبت کرتے تھے۔ ان کے خواب پورے ہونے والے تھے کیوں کہ دو دن بعد شہر کے معروف ہوٹل میں ان کی منگنی کی تقریب منعقد ہونا تھی۔ یونیورسٹی میں آ کر آذر نے کرن کو پیار و بھری نظروں سے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم دھڑام سے نیچے آ گرا۔ کرن اڑ کر اس کے اوپر جا گری۔ اس کی چیخوں نے یونیورسٹی کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیئے۔ سارے طالب علم اساتذہ آذر کے ارد گرد اکٹھے ہونا شروع ہوگئے ۔ اس کی شہ رگ پر بھی ایک نیل پڑا ہوا تھا اور جسم میں خون کا کوئی قطرہ باقی نہ رہا تھا۔ یہ واقعات یونیورسٹی میں ہوتے رہے اور لگاتار سات اموات اسی نوعیت کی تھیں جن کا معمہ اب تک حل نہ ہو سکا تھا۔

☆......☆......☆

عید کی آمد تھی۔ بازاروں میں رونق تھی۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ رات کے 12 بجے کا وقت تھا جب حماد صفیہ سے وعدہ کر رہا تھا کہ اسے چاند رات کو شاپنگ کروانے ضرور لے جائے گا۔ چوڑیاں اور گجرے بھی پہنائے گا۔ آخر چاند رات آ پہنچی صفیہ نے اپنی ماں سے بہانا کیا کہ وہ ساتھ والے ہمسایوں کے گھر جا رہی ہے۔ باہر حماد موٹر بائیک لے کر کھڑا تھا۔ وہ بائیک پر بیٹھی اور بائیک فراٹے بھرتے ہوئے گلی کا موڑ مڑ گئی۔ مارکیٹ میں جا کر وہ سیدھے آئسکریم پارلر میں داخل ہوئے اور آئسکریم کا آڈر دیا۔ حماد بہت پیار سے، آئسکریم کھاتی ہوئی صفیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب

جگمگا رہے تھے۔ یک دم اسے دائیں کندھے کے قریب ایک قہقہہ سنائی دیا، وہ ابھی اس طرف دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اس کی گردن پر اسے دو گیلے گیلے ہونٹ محسوس ہوئے کچھ سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے حماد لڑھکتا ہوا ماہم کی گود میں آ گرا۔ اُس کی شہ رگ پر گول سا نیل دیکھ کر وہ اس کے اوپر گرتی چلی گئی۔ سارے شہر میں عجیب سی وحشت اور پراسرایت پھیلی ہوئی تھی پورے شہر میں 36 کے قریب پراسرار اموات ہو چکی تھیں، اور ایک معمہ بن کر رہ گئی تھیں مائیں اپنے بیٹوں کو باہر نہ نکلنے دیتی، بہنیں ہر وقت بھائیوں کے لیے دعا گو رہتیں۔

☆......☆......☆

آج گھر میں پھر وہی بات چھڑی ہوئی تھی کہ صارم شادی نہیں کرتا تمام گھر والے بہن بھائی دوست احباب اس کی منتیں کر کے تھک چکے تھے صارم کی می نے کہا ''صارم بیٹا تم پورے 32 سال کے ہو گئے۔ ہو بیٹا اب تو مان جاؤ۔ تم میری بڑی اولاد ہو پانچ سال ہو گئے ہیں تمہارا منہ تکتے تکتے انہوں نے اچانک اپنا دوپٹا اتار کر صارم کے قدموں میں رکھ دیا۔ صارم تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے لمحے کی تاخیر کیے بنا دوپٹا اٹھا کر ماں کے سر پر رکھا، انہیں گلے لگا لیا اور ہاں کر دی۔

☆......☆......☆

شہر کے معروف ہوٹل میں آج شہر کے نامور بزنس مین کے بیٹے کی شادی تھی۔ کئی دھیرے دھیرے لوگ آتے جا رہے تھے۔ صارم کی می، پاپا بھی بہت خوش تھے کیوں کہ آج ان کے چہیتے، لاڈلے اور نازوں سے پلے بیٹے کی شادی تھی۔ خوشی سے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے دلہن کو اندر لایا جا چکا تھا۔ بالا آخر نکاح کا وقت آن پہنچا۔ صارم کا نکاح اس کی کزن ڈاکٹر فائزہ سے ہوتے ہی ہر طرف مبارک باد کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ قرآن پاک اور لال چنری کے سائے میں فائزہ کو صارم کے پہلو میں لا کر بٹھا دیا گیا...... ایک گھنٹہ گزرا تھا رخصتی کی تیاریاں شروع تھیں اس لمحے صارم بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی محبت کو پا لینے کا احساس ہی اتنا خوش کن ہوتا ہے صارم اپنی محبت کے نشے میں کھویا ہوا تھا کہ فائزہ نے اس کا کندھا ہلایا اور کہا۔

''صارم یہ کیوٹ سی لڑکی کون ہے؟ کتنی معصوم اور خوبصورت ہے۔'' صارم نے چونک کر فائزہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سفید لباس میں ملبوس سوہنی تھی اس کی آنکھوں میں قہر، اور نفرت کے الاؤ جل رہے تھے تو اس کے سینے کے بائیں جانب خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا لیکن خون نیچے نہیں گر رہا تھا اور خون فائزہ کو بھی نظر نہیں آ رہا تھا وہ چلتی ہوئی اسٹیج کے قریب آ چکی تھی۔ صارم کو اپنی موت یقینی لگ رہی تھی۔ اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ گئی فائزہ نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ سوہنی اب اسٹیج کے اوپر چڑھ آئی تھی اور آ کر صارم کے دائیں پہلو میں کھڑی ہو گئی تھی۔ تم کیا سمجھتے تھے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ تم مجھ سے بچ جاؤ گے۔'' اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔

''تم نے میری زندگی تو برباد کی ہی تھی۔ میری دنیا بھی برباد کر ڈالی میرے ماں باپ کو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ آج وہی تکلیف وہی آنسو میں تمہارے ماں باپ کو دوں گی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا منہ صارم کے قریب کرنا شروع کر دیا اور اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا۔ فائزہ غش کھا کر نیچے گری اس کی چیخیں بلند تھیں۔ اس نے سوہنی کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ تمام لوگ اسٹیج کے نزدیک آ گئے۔ صارم کی ماں صارم کے اوپر ہی غش کھا کر گر پڑیں۔

سوہنی اپنا انتقام پورا کر کے جا چکی تھی۔ میرج ہال میں ہر طرف آہ و بکا مچی ہوئی تھی۔ پولیس آ چکی تھی۔ اس وقت انسپکٹر عامر محمود بھی موجود تھے۔ انہوں نے لاش کا معائنہ کیا تو یکدم ان کی نظر گردن پر پڑے نشان پر پڑی۔ اچانک ہی وہ کھڑے ہو گئے اور سر کو نفی میں ہلا دیا۔ یہ ان کا کیس نہیں تھا۔

ایک لڑکی جو کسی کے نکاح میں آتے ہی بیوہ ہو گئی۔ کیا اس کا قصور تھا؟

صارم جس نے اپنی انا کو تسکین پہنچانے کے لیے دو بے گناہ لڑکیوں کا قتل کیا اور سوہنی...... جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے محبت کی تھی سچی محبت......

ٹوٹ کے چاہنے والوں کے دل توڑ دیے جائیں تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔

☆......☆......☆......☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی چھٹی کڑی



خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہمشکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہمشکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہمشکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے





مشابہہ ہے۔ بہر کیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہمشکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہمشکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

''مس انیشا کہاں ہیں؟'' شاہ زیب نے سوال کیا بوڑھے کی بے ربط گفتگو کچھ عجیب سی محسوس ہونے لگی تھی۔

''وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔''

''آپ نے کہا تھا کہ آپ کی دو پوتیاں ہیں، دوسری کو میں نے نہیں دیکھا۔''

''جسے نہیں دیکھا اسے دیکھنے کی کوشش بے کار ہے، ہمیں صرف سامنے دیکھنا چاہیے ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش بعض اوقات نقصان دہ ہو جاتی ہے۔ ویسے بارہ سنگھا...... اس کائنات میں ایک عجیب و غریب مقام رکھتا ہے۔''

''مجھے یوں محسوس ہوتا ہے مسٹر سائمن جیسے بارہ سنگھے کا آپ کی زندگی سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ کیا آپ نے کبھی اپنے ذہن کو ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی کہ اس میں بارہ سنگھے کا تصور اس قدر جاگزیں کیوں ہے۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا مجھے پاگل قرار دینا چاہتے ہو۔ یہ کہنا چاہتے ہو کہ بارہ سنگھا بذات خود کوئی انفرادیت نہیں رکھتا۔ صاحبزادے اگر دنیا کی حقیقت پر غور کرو تو بارہ سنگھا اس میں تمہارا سب سے زیادہ معاون ہوتا ہے۔ میں تمہیں بارہ سنگھے کے بارے میں جو تفصیلات بتاؤں گا شاید تم خواب میں بھی کبھی نہ سوچ سکو۔'' بوڑھے نے پُر خیال انداز میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''زیادہ قدیم دور کا انسان جب تہذیب سے ناآشنا تھا اور اس کی فکر صرف چند چیزوں تک محدود تھی۔'' شاہ زیب دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا، لیکن دفعتاً ہی اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ شاہ زیب کے سامنے ناقابل یقین منظر تھا۔ بوڑھے کی بیساکھیاں وہیں کرسی کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور اس وقت بالکل صحیح کھڑا شاہ زیب کو لیکچر دے رہا تھا۔ شاہ زیب کے چہرے کو دیکھ کر اس نے ایک مدبرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''یہ نظریہ فکر اس وقت تبدیل ہوا...''

''اوہ اوہ مسٹر سائمن، مسٹر سائمن، آپ آپ... بغیر بیساکھیوں کے کھڑے ہیں۔'' شاہ زیب نے بوڑھے کو اس کے پیروں کی جانب متوجہ کیا لیکن بوڑھے نے اس کی بات کی جانب توجہ نہیں دی۔

''میرا ذہن بھٹکا کر تم بارہ سنگھے کی افادیت اور اس کی تاریخی شخصیت کو نظر انداز کرنا چاہتے ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔''

''مسٹر سائمن، آپ بغیر بیساکھیوں کے کھڑے ہیں۔''

''تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔'' بوڑھا واپسی کے لیے مڑا اور پھر اس نے دونوں بیساکھیاں اٹھا کر بغلوں کے نیچے لگا لیں اور ٹہلنے کے انداز میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

''تو میں بارہ سنگھے کی افادیت اور اس کی تاریخی حیثیت پر تبصرہ کر رہا تھا۔'' اس نے اس بات کا نوٹس لیے بغیر کہا اور شاہ زیب احمقوں کے سے انداز میں کھوپڑی کھجانے لگا، اسے یہ پاگلوں کا خاندان معلوم ہوتا تھا۔ فقیروں کی طرح لفٹ لے کر سفر کرنے اور بھوکوں مرنے والی کروڑ پتی پوتی، معذوروں کی طرح بیساکھیاں بغل میں دبا کر چلنے والا دادا اور پھر

بارہ سنگھا...... یہ سب احساس دلاتا تھا کہ یہ فارم ہاؤس درحقیقت پاگل خانہ ہے۔ بیساکھیاں بغل میں لگانے کے بعد بوڑھا بارہ سنگھے کے بارے میں نجانے کیا کیا باتیں شاہ زیب کو بتاتا رہا لیکن شاہ زیب اس کی کیفیت پر غور کر رہا تھا۔ اسی وقت انیشا ایک خوبصورت کار میں اندر داخل ہوئی۔ اس نے کار ایک طرف کھڑی کی اور اتر کر ہمارے پاس آ گئی۔

''ہیلو مسٹر شاہ زیب! کیسے مزاج ہیں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ شخص بارہ سنگھے کو تسلیم نہیں کرتا انیشا اور تم جانتی ہو ایسی کیفیت میں، میں آؤٹ ہو جاتا ہوں۔ سوری انیشا اس وقت تم اپنے مہمان کو خود ہی سنبھالو، میرا ٹیمپر لوز ہو چکا ہے۔'' بوڑھے نے بیساکھیوں کے سہارے تیز تیز آگے بڑھتے ہوئے کہا اور پھر چبوترے سے اتر کر عمارت میں داخل ہو گیا۔ انیشا عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر میری طرف رخ کر کے بولی۔

''ہوا کیا تھا؟''

''کچھ نہیں انیشا، بس تقدیر کی خرابی کہو۔ اب میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں، سوائے اپنی تقدیر کو کوسنے کے۔''

''ارے ارے، مگر کیا ہوا۔ تمہیں دادا جان کی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے، بارہ سنگھا درحقیقت ان کا ایک کمپلیکس ہے اور وہ جب بھی ایشیا کا تصور کرتے ہیں بارہ سنگھے کے بارے میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ ویسے پچھلے کئی سال سے انہوں نے بارہ سنگھے کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں کی تھی، لیکن تمہارے نام کے ساتھ چونکہ ایشیا کا تصور ابھرتا ہے۔ اوہو، شاید تم لوگ چائے پی چکے ہو، لیکن میں چائے پینا چاہتی ہوں۔''

''کیا تم یہ بات سن کر حیران نہیں ہو گی انیشا کہ تمہارے دادا جان بارہ سنگھے کے تذکرے پر اس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ بیساکھیوں کے بغیر بھی ٹہلتے ہوئے دور چلے جاتے ہیں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر گفتگو کر سکتے ہیں۔''

''تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، دادا جان اکثر بیساکھیوں کے بغیر بھی چل لیتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' شاہ زیب نے حیرت سے کہا۔

''ایک پیالی چائے اور پیو میرے ساتھ، یہ میں نے تمہارے لیے بنائی ہے۔'' انیشا نے کہا اور شاہ زیب اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم کہہ رہی تھیں کہ وہ بغیر بیساکھیوں کے بھی چل لیتے ہیں۔''

''ہاں وہ معذور تو نہیں ہیں صرف معذور آدمی بیساکھیوں کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ان کی تو دونوں ٹانگیں درست ہیں۔''

''تب پھر یہ بیساکھیاں۔''

''بیساکھیاں، بیساکھیاں ہوتی ہیں۔ اوہ..... کہیں تم نے یہ سوال تو نہیں کر ڈالا ان سے کہ وہ بغیر بیساکھیوں کے کیسے چل رہے تھے؟''

''نہیں میں نے ان سے یہ سوال نہیں کیا؟'' شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''دراصل بیساکھیوں سے چلنا ان کا مشغلہ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بیساکھیاں بغل میں دبا کر چلتے ہوئے وہ بے حد سکون محسوس کرتے ہیں اور اس سلسلے میں بھی اتنے ہی جذباتی ہیں جتنے بارہ سنگھے کے سلسلے میں۔'' انیشا نے جواب دیا اور چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا لیکن شاہ زیب نے اپنی چائے کی پیالی نہیں اٹھائی۔ وہ اس پاگل خاندان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انیشا کے چہرے سے ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں بھی کوئی شرارت کر رہی ہے۔

''تم کہاں گئی تھیں؟''

''بھیک مانگنے۔'' انیشا نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''اکثر میں لاگن کے آس پاس کے علاقوں میں بھیک مانگنے جاتی ہوں۔ دیکھو کار میں میرا اڈریس رکھا ہوا ہے، بالوں کی وگ بھی ہے لیکن بعض اوقات مجھے اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، بس بھیک مانگنے کے نئے نئے طریقے آنے

چاہیے ہیں۔"

"تم شاید سنجیدگی سے مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔"

"مسٹر شاہ زیب، کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ ہم تم چند لمحات کے مسافر تھے، دوستی کی بنیاد پر میں تمہیں یہاں لے آئی، میں نے تمہیں اپنے فارم ہاؤس کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اور دادا جان کے بارے میں بھی بس اتنا ہی کافی نہیں تھا، ضروری ہے کہ تم ہم لوگوں کے بارے میں ساری چھان بین کرو۔ دادا جان اگر بارہ سنگھے کے مرض کا شکار ہیں تو ہونے دو، تم ڈاکٹر تو نہیں ہو اور پھر وہ اگر بغیر بیساکھیوں کے چند قدم چل لیتے ہیں تو اس سے تم پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سوری ڈیئر، یہ بات بہتر نہیں ہوگی، آئندہ احتیاط رکھنا۔"

اس نے اپنی چائے کی پیالی خالی کی اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی، شاہ زیب اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ تھیلا لینے کے لیے اندر جانا ضروری تھا ورنہ شاید یہیں سے بانسوں کے دروازے کے دوسری جانب چھلانگ لگا دیتا جو اس پاگل خانے میں داخلے کا واحد راستہ تھا کیونکہ بانسوں کی اونچی باڑھ کے حصار کو پھلانگنا اس کے بس سے باہر تھا۔ یہاں اس پاگل خانے میں کسی بھی وقت کوئی ایسی بات رونما ہو سکتی ہے جو اس کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے اور اب وہ کوئی مصیبت مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حیرت تھی ان تمام لوگوں پر۔ وہ کافی دیر تک وہاں اکیلا بیٹھا رہا اور اس کے بعد یہی فیصلہ کر کے وہاں سے اٹھا کہ اپنا بیگ لے کر یہاں سے نکل جائے۔۔ وہ پھر اسی کمرے میں پہنچا جہاں اس کا بیگ رکھا ہوا تھا تو انیشا اس کے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ شاہ زیب کو دیکھ کر مسکرائی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم فوراً اپنے کمرے میں آؤ گے، میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

"تمہیں یہ یقین کیوں تھا انیشا۔"

"اس لیے کہ میں نے تمہارے چہرے پر تمہارا پروگرام پڑھ لیا تھا۔ اب تم یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو گے لیکن میرے خیال میں یہ تمہاری زیادتی ہوگی۔"

"نہیں انیشا پلیز، میں ویسے بھی زیادہ دیر تمہارے پاس نہیں رک سکتا تھا۔ لاگن کو دیکھتا ہوا یہاں سے اسٹاک ہوم نکل جاؤں گا، بس یہی میرا پروگرام ہے۔"

"اس طرح سے تم نہیں جا سکتے مسٹر شاہ زیب۔ میں کہتی ہوں کہ آخر تمہیں تجسس کیا پیدا ہو گیا ہے۔ دراصل بارہ سنگھا......"

"ایک منٹ، اگر تم نے دوبارہ بارہ سنگھے کا نام لیا تو ہو سکتا ہے میں دیوار سے سر پھوڑ لوں۔"

"گویا بارہ سنگھا تم پر بھی سوار ہو گیا ہے۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا پھر بولی "سوری شاہ زیب مگر اس طرح واپس جانا بداخلاقی ہے۔ بس تم ان تمام باتوں کو ذہن سے نکال دو۔ دادا جان اگر بیساکھیوں سے چلتے ہیں تو تمہیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے، بھئی یہ ان کی پسند ہے، میں اگر اپنی پسند کی زندگی گزار لیتی ہوں تو یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، کیا اس کے بغیر ہم لوگ دوست نہیں رہ سکتے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن براہ کرم اب تم مجھے نہ بارہ سنگھے کی کہانی سنانا اور نہ اپنے بھیک مانگنے کی۔"

"وعدہ۔" انیشا نے شاہ زیب کی بات کا برا مانے بغیر کہا اور اس کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ میں تمہیں اپنا فارم ہاؤس دکھاؤں۔"

☆......☆......☆

شاہ زیب نے آمادگی کا اظہار کر دیا، فارم ہاؤس کی جو صورت حال سامنے کی سمت دیکھی جا چکی تھی اس کا عقبی حصہ اس سے بھی زیادہ حسین تھا، وہاں ایک انتہائی خوبصورت سوئمنگ پول بھی تھا جس کے کنارے چھتریاں لگائی گئی تھیں۔ خاصا حسین ماحول تھا، لیکن انیشا بھیک مانگنے جاتی تھی، لفٹ لے کر سفر کرتی تھی، اہل یورپ کا یہ رنگ بھی شاہ زیب کے لیے اجنبی تھا۔ کافی دیر انیشا اس کے ساتھ رہی پھر شام کے سائے جھک آئے۔ رات کے کھانے پر بوڑھا دادا موجود نہیں تھا۔

صرف انیشا ہی نے اس کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانے کے بعد وہ دونوں کوفی پیتے ہوئے گفتگو کرنے لگے۔
''لاگمن کے نواح بہت حسین ہیں، کل میں تمہیں کچھ ایسی جگہیں دکھاؤں گی جو تمہیں بے حد پسند آئیں گی۔''
''تمہاری دوسری بہن ابھی تک نظر نہیں آئی، کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے؟''
''وہ ہمیشہ غائب رہتی ہے، شاید ہی تمہیں نظر آئے۔''
''ان دنوں یہاں موجود نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے سوال کیا۔
انیشا اس انداز میں ہنس پڑی جیسے وہ شاہ زیب کو ذہنی مریض سمجھ رہی ہو۔ اس کے ہنسنے کی وجہ فوراً ہی شاہ زیب کی سمجھ میں آگئی تھی۔ شاہ زیب نے پھر اس کے گھر کے بارے میں کرید شروع کر دی تھی۔ اس نے شاہ زیب کو اپنی بہن کے بارے میں مزید کچھ نہیں بتایا بلکہ سوئیڈن کی تاریخ اور وائی کنگز لٹیروں کے بارے میں تفصیلات بتانے لگی اور وہ خاموشی سے اس کی بکواس سنتا رہا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، باتیں کافی دیر جاری رہیں اور پھر شاہ زیب اس سے اجازت لے کر اپنی آرام گاہ میں پہنچ گیا۔
شاہ زیب کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ بس اب یہ میز بانی ختم ہو جانی چاہیے۔ زندگی پر جمود طاری ہو گیا ہے۔ مجھے ان تمام کہانیوں سے کیا لینا دینا، مجھے تو اپنے باقی ہم شکلوں کی تلاش تھی، لیکن جب اپنے وطن سے اتنی دور آ چکا ہوں تو لگے ہاتھوں دنیا دیکھ لوں، جبکہ وقت میرا ساتھ دے رہا ہے۔

☆......☆......☆

یہ وحشت اس قدر سوار ہو گئی کہ شاہ زیب نے اسی رات قصبہ چھوڑ دیا۔ اب اس نے اسٹاک ہوم کا رخ کیا تھا۔ ایک اجنبی لیکن بہت بڑی دنیا، جہاں اس نے ایک ہوٹل میں رہائش اختیار کی، بڑی ہمت کے ساتھ۔
دوسرے دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں تیار ہو کر اسٹاک ہوم کی سڑکوں پر نکل آیا۔ خریداری بھی کرنی تھی کیونکہ میرے پاس ڈھنگ کے لباس نہیں تھے۔ اس تھوڑی سی ہی سرگشت نے شاہ زیب کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ اسٹاک ہوم کی زندگی الٹی گنگا کی مانند ہے، یعنی عورتوں کا راج تھا، مردوں کی حیثیت نئی نویلی نوجوان لڑکیوں کی مانند، جنہیں قدم قدم پر خطرات درپیش ہوتے ہیں۔
شام تقریباً ساڑھے چھ بجے جب آسمان سے ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، میں موسم کی مناسبت سے لباس پہن کر ہوٹل کے نچلے حصے میں آ گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگیں ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک ویٹر میرے قریب پہنچ گیا۔
''جناب وہ سامنے والی میز پر موجود محترمہ آپ کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہیں۔''
شاہ زیب نے تعجب خیز انداز میں اس طرف دیکھا تو تقریباً چالیس بیالیس سالہ ایک خاتون میک اپ میں لتھڑی مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھیں۔ شاہ زیب اٹھ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس صورت سے اس کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ خاتون نے لہک کر اس کا استقبال کیا تھا۔
''میرا نام نینسی ہے۔''
''مجھے فرانک کہتے ہیں۔''
''ویری گڈ، آپ کا نام بہت خوبصورت ہے۔''
''کیا آپ نے مجھے میرے نام کی خوبصورتی کی اطلاع دینے کے لیے ہی یہاں بلایا ہے؟''
''نہیں... بلکہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے۔'' خاتون کی آنکھوں سے ایسے تاثرات جھلک رہے تھے کہ شاہ زیب کے اندر پھر ہلچل مچ گئی۔
''اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو براہ کرم مجھے بتائیے، میرا خیال ہے اس سے پہلے میں آپ سے کبھی متعارف نہیں ہوا۔''
''تمہارا حسین چہرہ ہی تمہارا تعارف ہے مسٹر فرانک، بس میں چاہتی ہوں کہ یہ شام اور یہ رات تمہارے ساتھ بسر ہو۔''

بظاہر لگتا یوں تھا جیسے یہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحات کسی دیرینہ خواہش کی تکمیل کر کے گزارنا چاہتی ہیں۔ شاہ زیب آہستہ سے ان کی میز سے اٹھ گیا۔
''کسی کو بلانے سے پہلے اپنی حقیقت ضرور واضح کر دیا کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کا سر اس عقبی دیوار پر دے مارے۔'' محترمہ کا منہ حیرت سے کھلا اور شاہ زیب جھلایا ہوا اپنی میز پر واپس آ بیٹھا۔
بارش کچھ تیز ہو گئی تھی اس لیے باہر جانے کا وقت نہ تھا، ہال میں جگہ جگہ مختلف پروگرام ہو رہے تھے بالآخر وہ ڈسکو روم میں پہنچ گیا اور یہاں برپا طوفان بدتمیزی دیکھتا رہا۔ یہیں اس نے رات کا کھانا کھایا۔ لوگ اسے تنہا سمجھ رہے تھے اور بے شمار دل والیوں نے اس کی تنہائی پر رحم کھا کر اسے دور کرنے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن عیش کی کاک ٹیل ہر جگہ تو قابل قبول نہیں ہوتی، چنانچہ شاہ زیب نے ان سے معذرت کر لی اور وہ حیرت سے اسے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

اس ہوٹل میں قیام کسی بھی طرح قابل قبول نہیں تھا، یہاں تین دن گزر گئے تھے اور ان تین دنوں میں اس نے خود کو انتہائی بہتر محسوس کیا تھا کیونکہ ان دنوں ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایک شہزادے ہی کی مانند زندگی گزار رہا تھا۔ اس دوران اسٹاک ہوم کے زیادہ وسیع علاقے نہیں دیکھے تھے۔ بس دو تین بار ہی وہ باہر نکلا تھا، سویڈن کی دل پھینک لڑکیاں اس کی جانب متوجہ رہتی تھیں۔
بعد میں اُسے اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہاں کی زیادہ تر آبادی خاص طور سے لڑکیاں کالے بال، کالی آنکھیں اور گندمی رنگت پر مرتی ہیں... سرخ، سنہرے بھورے بال اور آنکھیں دیکھ دیکھ کر وہ اکتا گئی تھیں۔ بہر طور یہ لمحات بھی ناپسندیدہ نہیں تھے۔
اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ایک سیاح کی حیثیت سے اسٹاک ہوم اور اس کے نواح کا جائزہ لے۔ اس نے اسٹاک ہوم کے نقشے طلب کیے اور ان کی مدد سے سیاحت کا ایک پروگرام بنا ڈالا۔ ہوٹل سے کرائے کی کار کا بندوبست ہو گیا تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کی ڈرائیور ایک جوان لڑکی تھی۔
اس کا نام روزا تھا۔ روزا صرف ڈرائیور ہی نہیں گائیڈ بھی تھی۔ چنانچہ وہ اُسے لیے ہوئے اسٹاک ہوم کے مختلف علاقوں میں گھومتی پھری، اس نے محسوس کیا کہ وہ تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور گفتگو کے دوران اس کی باتوں سے علمیت جھلکنے لگتی تھی۔
''سویڈن اخلاقی قدروں سے جنگ کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا ہے اور اب وہ واپسی کے راستے جا رہا ہے، لیکن نئی نسل واپسی کے راستے گم کر چکی ہے، جنس اپنی کشش کھو چکی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کوئی کیا کرے، بھٹکی نسل کچھ کر کے رہے گی کیونکہ یہ مایوسی صرف تباہی کا پیغام ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔
''تم اس عمر کی نمائندگی کر رہی ہو؟''
''ہاں میں خود کو ان سے الگ تو نہیں کہتی۔'' اس نے کہا۔
''مگر تم پُرسکون ہو۔''
''سکون کے اس مصنوعی خول کے دوسری طرف دیکھنا چاہتے ہو؟'' اس نے چمکدار آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔
میں نے گھبرا کر نفی میں گردن ہلا دی ''نہیں نہیں.. میں تو صرف تمہارے خیالات پوچھ رہا تھا۔''
وہ ہنس پڑی اس کے بعد سویڈن کی نئی نسل کے بارے میں مزید کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن روزا نے اس کے سوچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ دیا تھا۔
اسٹاک ہوم بھی جزیروں کا شہر تھا جسے مخصوص طرز کے پُل ایک دوسرے سے ملاتے تھے۔ شہر کی مشہور سڑک کنگ کاٹن، کانفرٹ ہال، کیز ابل، سپ کا وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور جہاں دنیا کی مشہور ترین شخصیتیں آ چکی تھیں، ان کی تصاویر بھی وہاں آویزاں تھیں۔ روزا ہر جگہ کے بارے میں تفصیلات بتاتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے شاہ زیب سے شہزادہ یوجین کا محل دیکھنے کی

بات کی اور شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا کہ اب تو میری نکیل اس کے ہاتھ میں ہے، جہاں اس کا جی چاہے لے جائے، چنانچہ ہم شہزادہ یوجین کے محل کی جانب چل پڑے جو گھنے درختوں اور سرسبز پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔

یہاں سے سمندر کی ایک شاخ نہر کی صورت میں اسٹاک ہوم میں داخل ہوتی ہے، ٹیلوں کے تختوں اور بلند درختوں کے درمیان چلتے ہوئے وہ سمندر کے کنارے آگئے جہاں بے شمار لوگ بینچوں پر بیٹھے تازہ دھوپ اور تازہ سمندری ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے، روزا اب صرف ایک ڈرائیور نہیں رہی تھی بلکہ اس کی حیثیت ایک دوست کی سی ہوگئی تھی۔

وہ لوگ ساحل کے ساتھ پانی میں ابھری ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے، اس خطرناک صورت حال کے بعد روزا نے پھر کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو باعث پریشانی ہوتی۔ نجانے کتنی دیر شاہ زیب اور لڑکی روزا وہاں موجود رہے، پھر سورج ڈھل گیا اور روزا کہنے لگی۔

”یہ موسم سویڈن کے رہنے والوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دھوپ نظر آگئی تو یوں سمجھو عید ہوگئی، ورنہ موسم سرما کے بعد نیلے طوفان اور مہینوں نظر نہ آنے والا سورج، زندگی بھی منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر چند کہ کاروبار زندگی چلتا رہتا ہے، لیکن دلوں میں کوئی امنگ نہیں ہوتی۔“

کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جو درختوں میں گھری ہوئی تھی اور وہاں روزا نے اپنی گہری اور چمکدار آنکھوں کے ساتھ شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوٹل میں بے شمار مسافر آتے ہیں، قیام کرتے ہیں اور ان میں سے لاتعداد کے لیے میں ہی ڈرائیور ہوتی ہوں۔ ہوٹل والے خاص طور سے میرا انتخاب کرتے ہیں کہ میں دنیا کی پانچ زبانیں جانتی ہوں، اور جو لوگ صاحب حیثیت ہوتے ہیں وہ اپنی گڈ بک میں ہوٹل کا نام لکھ کر جاتے ہیں اور اس کے بعد اگر ان کا کوئی دوست یا بذات خود وہ کبھی اسٹاک ہوم کا رخ کرتے ہیں تو اس ہوٹل کے قیام کو اولیت دیتے ہیں۔ میں نہ صرف ایک اچھی ڈرائیور ہوں بلکہ ایک اچھی گائیڈ بھی ہوں اور ایک اچھی ساتھی بھی۔ میرے پاس اس کی کئی سندیں ہیں، لیکن ایک بات کہوں مسٹر۔ تم بھی میری زندگی کی کتاب میں اپنا ایک ورق چھوڑے جا رہے ہو، جبکہ میں کبھی زندگی کی ڈائری نہیں لکھتی۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں اپنی ڈائری کے اس ورق پر لکھوں گی کہ میں وہ ہستی ہوں جسے خلا کے ایک نامعلوم سیارے سے آنے والے کا قرب نصیب ہوا اور وہ اس دنیا کے رہنے والوں سے بالکل مختلف تھا۔ جوان نسل میں خواہ اس کا تعلق زمین کے کسی خطے سے ہو، عیش پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور تنہائیاں اس کے ہوش و حواس چھین لیتی ہیں، لیکن کوئی بھی تنہائی، کوئی بھی لفظ تمہیں متاثر نہیں کرتا۔ میں مسلسل محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری نگاہ ایک بار بھی مجھ پر اس انداز میں نہیں پڑی جس کی میں متوقع تھی۔“

شاہ زیب نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی اس بات کا تو وہ پہلے ہی قائل تھا کہ تعلیم یافتہ ہے اور اپنی بات ڈھنگ سے کہنا جانتی ہے اور اس نے جس انداز میں شاہ زیب سے اپنے وجود کے خول کو توڑنے کے لیے کہا تھا اس نے اسے دہشت زدہ بھی کر دیا تھا، وہ بھلا اس کی اس کیفیت کو کیسے سنبھال سکتا تھا۔ یہاں پھر وہی الفاظ شروع ہو گئے تھے۔ دفعتاً شاہ زیب نے کچھ محسوس کیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا، اطراف میں درختوں سے چھننے والی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں لیکن ایک عجیب سی بدبو ان فضاؤں میں شامل ہوگئی تھی اور شاہ زیب نے اسے محسوس کیا تھا۔ شاید روزا نے بھی اس بدبو کو محسوس کر لیا اور گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ایک بدبو سی ہے یہاں۔“

”ہاں۔“

”کیا یہ سڑے ہوئے گوشت کی بدبو نہیں ہے؟“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“

''حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شاہ زیب کے ذہن میں بھی تجسس پیدا ہو گیا تھا چنانچہ وہ دونوں اس بدبو کا سراغ لگانے چل پڑے اور اس کے لیے انہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا۔ روزا ٹھٹک کر رک گئی۔ پھولوں کے کنج کے پاس دو سفید پاؤں مڑے تڑے نظر آ رہے تھے اور اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ وہ کوئی انسانی لاش ہے، جو کئی دن سے یہاں پڑی ہوئی ہے اور یہ بدبو اسی لاش کی ہے۔''

''ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں، کیا خیال ہے واپس چلیں؟''

''ہونا تو یہی چاہیے، لیکن کیا اس سلسلے میں اپنے فرائض پورے نہیں کرو گی۔''

روزا نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور پھر شرمندہ سی ہو کر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھولوں کے کنج کے پاس تھے، کنج بہت زیادہ گھنے نہیں تھے۔ لاش کو ان میں ٹھونس دیا گیا تھا، لیکن اسے بخوبی دیکھا جا سکتا تھا اس میں سے بدبو بے شک اٹھ رہی تھی لیکن لاش کا چہرہ بھیانک نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی لڑکی کی لاش تھی۔ شاہ زیب نے اسے دیکھا اور یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی انتہائی گرم شئے بے دھیانی میں اپنے حلق سے نیچے اتار لی ہو اور وہ سینہ، دل، پھیپھڑے اور کلیجہ جلاتی ہوئی معدے تک پہنچ رہی ہو، کچھ ایسی ہی عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کے اندر کیونکہ وہ چہرہ، وہ چہرہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

شاہ زیب اس چہرے کو چھوڑ کر بہت دور بھاگ آیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ سارے جہاں کا درد میرے ہی جگر میں کیوں ہو۔ لیکن یہاں اسٹاک ہوم میں شہزادہ یوجین کے اس محل کے پاس مظلوم سیسل کی لاش کہاں سے آ گئی.....

ہاں یہ سیسل ہی تھی، جس کے سینے میں انتقام کا سمندر موجزن تھا اور جو اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی، جس کے لیے اس نے شاہ زیب کی مدد طلب کی تھی۔

شاہ زیب نے اسے بغور دیکھا، سیسل کے بدن پر چاقوؤں کے لاتعداد نشانات تھے اور یہی نشانات اس کی موت کا سبب بنے تھے۔ روزا سہمی ہوئی نگاہوں سے اس لاش کو دیکھ رہی تھی، پھر اس نے انہی نگاہوں سے شاہ زیب کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی ''مظلوم لڑکی کئی دن پہلے قتل کی گئی ہے لیکن ہمیں یہاں سے ہٹ جانا چاہیے تم موقع کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے، بعض اوقات زیادہ انسانیت بھی گلے پڑ جاتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے روزا، لیکن کیا اس لاش کو اس طرح بے گور و کفن چھوڑ دیا جائے۔''

''اسے زمین کی گہرائیوں میں دفن کر کے تم صرف اپنے ضمیر کو تسکین دے سکتے ہو۔ اس سے زیادہ اب میں یا تم کیا کر سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ کسی پبلک کال بوتھ سے پولیس کو ٹیلی فون کر دو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرتی ہوں، پولیس خود اسے سنبھال لے گی۔''

شاہ زیب نے متاسفانہ انداز میں گردن ہلائی۔ بیچاری روزا کو کیا پتا تھا کہ وہ خود بھی اس سلسلے میں تھوڑا سا مجرم ہے، سیسل کو اگر اس کے بھائی کے قاتلوں کے سلسلے میں وہ کوئی مدد نہیں دے سکتا تھا تو کم از کم اسے تسلیاں دے کر اس کا یہ جنون تو ختم کر سکتا تھا کہ وہ کسی باقاعدہ گروہ سے انتقام لینے کا ارادہ ترک کر دے۔ ہو سکتا تھا کہ شاہ زیب کے محبت بھرے انداز سے اس کے خیالات میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتیں۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے اسی جنون کا شکار ہوئی تھی۔ ایک بے بس لڑکی کر بھی کیا سکتی تھی۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور وہ دونوں ہی چونک کر پلٹے۔

پولیس کی وردی میں ملبوس چند افراد ان دونوں کے عقب میں پہنچ گئے تھے، ان میں سے ایک بھاری بدن کے بڑی بڑی مونچھوں والے شخص نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''لاش اور تم دونوں، واہ کب قتل کیا تھا اسے۔ کیا تلاش کرنے آئے تھے اس کے پاس؟''

''او دیکھیے جناب! ہم دونوں تو میرا مطلب ہے یہ صرف سیاح ہیں اور ہم یہاں شہزادہ یوجین کا محل دیکھنے آئے تھے۔ ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہوئی بُو نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا اور ہم یہاں نکل آئے۔ معاف کیجیے گا ہمارا اس لاش

سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہم پولیس کو اطلاع دینے کا ہی فیصلہ کر رہے تھے۔"

"خوب..اتفاق کی بات ہے کہ پولیس خود ہی تمہاری خدمت کے لیے یہاں پہنچ گئی۔ چلو آ جاؤ"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب، میں ہوٹل شاز کی ملازم ڈرائیور ہوں اور آج سارا دن اپنے مہمان کو اسٹاک ہوم کی سیر کراتی رہی ہوں، آپ ہوٹل کو رنگ کر کے....."

"بے بی یہ ساری باتیں پولیس با آسانی معلوم کرلے گی، فی الحال تم ہماری مدد کرو اور ہمارے ساتھ چلو۔ تم لوگ لاش کا بندوبست کرو۔" پولیس آفیسر نے اپنے ساتھ موجود لوگوں سے کہا۔

روزا بری طرح گھبرا گئی تھی۔ اس سے اس کی گاڑی کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا کہ ہوٹل کی گاڑی وہاں موجود ہے۔ تب پولیس آفیسر نے اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم میڈم کے ساتھ ہوٹل کی گاڑی میں پہنچو، میں ان صاحب کو لیے جا رہا ہوں۔"

چند ساعتوں کے لیے تو شاہ زیب کے بھی اوسان خطا ہو گئے تھے، لیکن اس کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا ظاہر ہے سیسل کو اس نے قتل نہیں کیا تھا اور پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اگر حالات نے کوئی غلط صورت اختیار بھی کی اب وہ اتنا لاوارث بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑا۔

پولیس کی بڑی وین میں اسے بٹھا دیا گیا، روزا کو وہ لوگ ہوٹل کی گاڑی میں لا رہے تھے۔ پولیس آفیسر شاہ زیب کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا اور دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا، پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم غالباً انڈین ہو۔"

شاہ زیب نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا "جی نہیں، میرا تعلق پاکستان سے ہے۔"

"اوہ اوہ سمجھ گیا، ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔" پولیس آفیسر بولا۔

"کیا مطلب... جو کچھ سمجھ گئے ہو مجھے بھی سمجھانے کی کوشش کرو۔" شاہ زیب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے جناب، پولیس اسٹیشن پہنچ کر سب کچھ آپ کی سمجھ میں آ جائے گا اور ہمیں زحمت کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔"

شاہ زیب نے تلخ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے کہ پولیس کی ڈیوٹی ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔"

پولیس افسر اس بات کو شاید نہیں سمجھ سکا تھا لیکن شاہ زیب نے بھی اپنے جملے کی وضاحت نہیں کی۔

تھوڑی دیر کے بعد پولیس وین غالباً اس عمارت میں داخل ہو گئی جو پولیس اسٹیشن کی عمارت تھی، پولیس آفیسر نے شاہ زیب سے نیچے اترنے کے لیے کہا، مسلح پولیس مین وین کے اردگرد کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہ عمارت پولیس اسٹیشن کی عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ شاہ زیب کو اندر چلنے کا اشارہ کیا گیا۔ شاہ زیب نے اندر جانے میں کوئی تعرض نہیں کیا تھا، وہ اسے لے کر عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ کہیں کوئی دفتر نہیں تھا، ایک رہائشی عمارت محسوس ہوتی تھی۔ وہ لوگ اسے لے کر عمارت کے انتہائی گوشے میں پہنچے اور پھر اسے ایک کمرے میں چلنے کے لیے کہا گیا۔

کمرہ اندر سے خالی تھا، اس سے قبل کہ وہ چونک کر پلٹتا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا اور شاہ زیب احمقوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔

یہ کیسی پولیس تھی جس نے اسے اپنا پرائیویٹ قیدی بنا لیا تھا۔ غصے کے عالم میں اس نے بار بار دروازہ پیٹا لیکن کوئی جواب نہ ملا اور اب ذہن کے گوشے سے یہ آواز ابھر رہی تھی کہ معاملہ پولیس کا نہیں ہے، بلکہ یقیناً کوئی گھپلا ہوا ہے۔

کمرے میں قالین کے علاوہ کچھ نہیں تھا، کوئی فرنیچر یا کوئی ڈیکوریشن پیس ٹائپ کی چیز کا یہاں کوئی وجود نہیں تھا، اسے حیرت ہو رہی تھی کہ پولیس کی وردی میں یہ کون لوگ تھے جو دھڑلے سے کام کر رہے ہیں اور پھر سب سے حیرت ناک بات یہ تھی انہوں نے شاہ زیب کو کیوں پکڑ لیا، یہ کیا چکر ہے۔ بے شمار سوالات تھے جن میں سر کھپانا حماقت تھی کیونکہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے قالین پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں، ذہن کو پھر

آزاد چھوڑ دیا۔ کیا فائدہ جتنا وقت سکون سے گزرا تھا اس کی یاد ہی کافی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئے ہنگامے کیا ہوتے ہیں۔ اندازہ تو یہی تھا کہ یہ لوگ وہی ہیں جو سیزارو کے قاتل تھے اور اس کے بعد انہوں نے اس کی بہن کو بھی ہلاک کر دیا، لیکن شاہ زیب کی گرفتاری خود اس کے اپنے لیے نا قابل فہم تھی۔

پھر اسے روزا کا خیال آیا، ہوٹل کی یہ پڑھی لکھی ڈرائیور اب اپنی ساری منطق بھول جائے گی۔ نئی نسل کے المیے کے بارے میں اس نے بڑی عالمانہ گفتگو کی تھی اب اس کی علیت جرم کی اس دنیا کے سلسلے میں کیا کہتی ہے، یہ سوال میں اس سے ضرور کروں گا۔ شاہ زیب نے سوچا، لیکن وہ اس کے ساتھ یہاں نہیں پہنچی حالانکہ اسے شاہ زیب کے ساتھ ہی یہاں لایا گیا تھا۔ اس بات کے امکانات بھی تھے کہ اسے الگ رکھا گیا ہو۔ یہاں آ جاتی تو کم از کم تنہائی ہی ختم ہو جاتی اور اس سے اس موضوع پر بھی تھوڑی سی بحث ہو جاتی۔

جانے کتنے گھنٹے شاہ زیب کو اس قید خانے میں گزارنے پڑے اس کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑی مونچھوں والے نے اس سے باہر آنے کے لیے کہا، باہر رات ہو چکی تھی، مدہم مدہم روشنیاں جل رہی تھیں وہ شاہ زیب کو ساتھ لیے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہو گیا جو تیز روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

کمرے کے درمیان نصف دائرے کی شکل کی ایک خوبصورت میز لگی ہوئی تھی جس کے پیچھے تین کرسیوں پر تین شاندار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کا چہرہ جارج واشنگٹن سے ملتا جلتا تھا، دوسرا فرنچ کٹ داڑھی، بڑی بڑی گھنی مونچھوں اور خوبصورت چشمے کے ساتھ پروقار شخصیت کا مالک نظر آ رہا تھا۔ تیسرا ایک ستے ہوئے چہرے کے ساتھ کسی قدر سخت گیر طبیعت کا مالک شخص تھا۔ تینوں نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھا، سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی ان کی نگاہوں میں اجنبیت نہیں تھی بلکہ وہ شاہ زیب کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ اس کی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ شاہ زیب ان کے اس ردعمل پر چونکا تھا۔

تو کیا میرا نیا ہم شکل سامنے آنے والا ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

''اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم ہی کنور شمشیر سنگھ ہو۔'' ایک آدمی نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ڈیئر، میرا نام تو ستیہ جیت ہے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''بکواس کرتے ہو۔ ہمیں دھوکہ دیتے ہو کنور، تمہارے بہت سے کارنامے سنے ہیں، لیکن پہلی بار ہمارے جال میں پھنسے ہو۔ جو کھیل تم کھیل رہے ہو کنور، اس کے نتائج پر تم نے غور نہیں کیا، وہ سب کچھ تمہارے بس کی بات نہیں ہے جس کے لیے تم میدان عمل میں آئے ہو، کیا سمجھے؟''

''اب تو یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا مسٹر کہ میں کیا ہوں، اور جو کھیل میں کھیل رہا ہوں۔ اس کے کیا نتائج ہوں گے، لیکن ایک پیشگوئی بلکہ حقیقت میں بیا ئیے دیتا ہوں۔ تم لوگ مجھے کسی تھیٹر کے مسخرے معلوم ہوتے ہو اور کسی جاسوسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہے ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے بارے میں کچھ کہنا میرے اپنے لیے توہین آمیز ہے۔''

خشک چہرے والے نے گہری نگاہوں سے اپنے قریب بیٹھے دونوں آدمیوں کو دیکھا اور پھر نرم لہجے میں بولا۔

''سیزارو سے تمہارا کیا تعلق تھا۔ تمہیں اس بات پر اعتراض تو نہیں ہے کہ ہم تمہیں کنور شمشیر سنگھ کے نام سے پکار رہے ہیں۔''

''جس طرح تم نے مجھے دھوکہ دے کر یہاں بلایا ہے۔ اس سے میں تمہاری ذہنیت کے بارے میں اندازہ لگا چکا ہوں۔ اب اگر تم مجھے سکندر اعظم بھی کہہ دو تو میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا نام صرف شاہ زیب ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''خوب.. گویا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم کنور شمشیر سنگھ ہو؟''

''میرے انکار کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر تم مجھے کنور شمشیر سنگھ سمجھتے ہو تو وہی سہی، لیکن اس کے فوائد ضرور بتا دو مجھے۔ اگر کچھ نقصانات ہوں تو مجھے شاہ زیب ہی رہنے دیا جائے۔''

''سیزاروکی کہانی سناؤ، اس نے تمہاری مدد سے کیا کیا کر لیا تھا اور تمہارے ساتھ مزید کتنے افراد ہیں جو تمہارے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں۔''

''دنیا کی آبادی میں سے صرف ان لوگوں کو نکال دو جو یہاں اس عمارت میں تمہارے ساتھی ہیں، باقی سب میرے ساتھ ہیں۔ مقابلہ کر سکو گے ان سے؟''

''بہت خود اعتمادی ہے تمہارے اندر کنور، لیکن اس کے نتائج بہتر نہیں ہوں گے۔ جو کچھ ہمیں حاصل کرنا ہے، وہ ہمارا ہی رہے گا۔ تم اپنے دوست سیزارو کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ اور وہ چوہیا جو بڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی بالآخر اپنی رفتار کا شکار ہوگئی۔ کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ پہلے تمہیں سیزارو کے ساتھ دیکھا گیا اور اس کے بعد اس کی بہن تمہارے ساتھ دیکھی گئی۔۔؟''

''ہاں۔۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ ''اگر تم لوگوں نے واقعی سیزارو کو میرے ساتھ دیکھا ہے تو میں بھلا انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ اور اس کے بعد اس کی بہن بھی کچھ عرصے مجھ سے منسلک رہی۔ لیکن اب حقیقتوں کی طرف آ جاؤ۔ نہ تو سیزارو سے میرا کوئی تعلق تھا۔ اور نہ ہی اس کی بہن سیسل سے۔ البتہ سیسل نے سیزارو کی موت کے بعد ایک کہانی ضرور سنائی تھی جس کا تعلق سیزارو ہی سے تھا، لیکن وہ خود بھی اس کہانی سے پوری طرح واقف نہیں تھی اور اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اس کے بھائی کے قاتلوں سے انتقام لینے کے سلسلے میں میں اس کی مدد کروں۔ لیکن میں صرف ایک سیاح ہوں میرے دوستو! جس طرح چاہو میرے بارے میں معلومات حاصل کر لو، بغرض سیاحت دنیا گردی کو نکلا ہوں اور اس سے زیادہ اور میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ باقی اپنے طور پر تمہارا جو دل چاہے فیصلہ کر لو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''خوبصورت الفاظ کو لفافے میں رکھ کر تم ہمیں بیوقوف بنانا چاہتے ہو کنور شمشیر سنگھ۔ تمہارے بارے میں جس قدر معلومات ہمیں حاصل ہیں شاید تمہارے ماں باپ کو بھی نہ ہوں، اس لیے فضول باتوں سے گریز کرو، پہلے یہ تسلیم کرو کہ تم کنور شمشیر سنگھ ہو۔ ہمارے تمہارے درمیان گفتگو اس کے بعد ہوگی۔''

''اور پہلے تم یہ تسلیم کرو کہ تم بین الاقوامی گدھے ہو اور یہ جو شکلیں بنائے بیٹھے ہو ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارے دماغوں میں بھوسہ بھرا ہوا ہے اور تم کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہو۔'' شاہ زیب کا خیال تھا کہ اس کے یہ الفاظ انہیں مشتعل کر دیں گے، لیکن وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے، پھر فرنچ کٹ، ڈاڑھی والے نے شاہ زیب کے عقب میں کھڑے ہوئے لمبی مونچھوں والے شخص سے کہا۔

''جاؤ اسے لے آؤ۔'' اس نے گردن خم کی اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ شاہ زیب نے یہاں کسی قسم کا کوئی ہنگامہ مناسب نہیں سمجھا تھا، چنانچہ اس نے کہا۔

''اگر تم مجھے کنور شمشیر سنگھ سمجھتے ہو تو کم از کم یہ بداخلاقی تمہیں زیب نہیں دیتی کہ تم تینوں بیٹھے ہوئے ہو اور میں کھڑا ہوا ہوں۔''

''سامنے کرسی پر بیٹھ سکتے ہو کنور، تم بہت چالاک اور شاطر قسم کے آدمی ہو۔ لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ جن لوگوں کے چنگل میں تم پھنسے ہو وہ تم سے کہیں آگے کی چیز ہیں۔ اگر تمہارے ساتھ دس ہزار افراد کا گروہ ہے، تب بھی وہ ہمارے سامنے بے بس ہی رہے گا۔''

شاہ زیب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کرسی پر جا بیٹھا، پھر بڑی مونچھوں والا شخص جس شخصیت کو لے کر اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر شاہ زیب کے دل میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

دنیا کے جن علاقوں میں وہ سیاحت کر چکا تھا۔ جس قدر حسین لڑکیاں اس کے نزدیک آئی تھیں اور ان کی جو جو شخصیتیں تھیں وہ بے مثال تھیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی شاہ زیب کے ذہن یا دل کی گہرائیوں میں وہ ہلچل نہ پیدا کر سکی تھی جو اس لڑکی کو دیکھ کر ایک دم اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی۔

بلند و بالا قد، انتہائی حسین سنگ مرمر جیسی تراش کا بدن، لمبے لمبے بال جو پنڈلیوں تک آتے تھے، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی ستواں ناک، انتہائی حسین تراش کے ابھرے ابھرے ہونٹ، صراحی دار گردن غرض کہ ہر شئے یوں محسوس

ہوتا تھا جیسے اپنی جگہ مکمل ہو اور عورت کی ایک مکمل تصویر، اگر افسانوی نقطہ نگاہ سے حسن کے معیار پر رکھی جاتی تو وہ اس شکل میں موجود تھی۔

ساڑی میں ملبوس، چہرے سے مشرقیت جھلکتی ہوئی، لیکن آنکھوں میں ذہانت کی جھلک، نجانے کون تھی یہ، بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قیدی ہو، لیکن چال کی تمکنت بتاتی تھی کہ رسی جل گئی ہے پر بل نہیں گئے۔ وہ ٹھہری ٹھہری سی چال چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور تیکھی نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔

''کوروتی، ہم نے تم سے کہا تھا نا کہ بالآخر کنور شمشیر۔ سنگھ بھی ایک نہ ایک دن ہمارے چنگل میں آجائے گا۔ دیکھو لو.. ہم نے اپنے قول کی تصدیق کر دی ہے۔ کنور شمشیر سنگھ تمہارے سامنے موجود ہے''

آنے والی کی نگاہیں شاہ زیب جانب اٹھ گئیں، ایک لمحے تک ان نگاہوں میں سپاٹ سی کیفیت رہی اور پھر اس کے ہونٹ سرگوشی کے انداز میں مسکرائے اور ان سے آواز نکلی'' کنور تم۔''

''بیڑہ غرق۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ آ گئی پھر وہی مصیبت۔ شاہ زیب نے لڑکی کے الفاظ کی تردید کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا، وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شاہ زیب کے نزدیک پہنچ گئی اور پھر اس نے اسی انداز میں کہا،

''تو تم بھی ان نے چنگل میں پھنس گئے کنور۔''

''اللہ کی مرضی بی بی، میں آج تک کچھ کر سکا ہوں جواب کروں گا۔'' شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''مجھے یہ توقع نہیں تھی، تم پر تو بہت انحصار تھا۔''

''ہاں ہاں، بے شک دنیا کے بے شمار لوگ مجھ پر نجانے کیا کیا انحصار کر لیتے ہیں، تم بھی کر لو۔ ایک بات دماغ میں رکھنا، جو کچھ انہیں ملا ہے اس سے الگ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ بہر حال بھائیو! میں کنور شمشیر سنگھ ہوں۔ باپ کا نام اس میں شامل نہیں کروں گا کیونکہ وہ گالی بن جائے گا۔ اب بولو کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

بھاری بھرکم شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی، اس نے کہا۔

''فی الحال میں اتنا ہی بتانا چاہتا تھا کہ اب تم دونوں یکجا ہو کر میرے لیے کام کرو گے۔ پیٹر انہیں احترام کے ساتھ ان کی کمین گاہ میں چھوڑ آؤ۔''

پیٹر شاہ زیب اور کوروتی کو لے کر باہر نکل آیا۔ اس بار جس کمرے میں ان دونوں کو قید کیا گیا یہ وہ جگہ نہیں تھی جس میں شاہ زیب کو پہلے رکھا گیا تھا۔ شاید یہ کوروتی کا پہلا قید خانہ ہو۔ یہاں دو حسین بستر بچھے ہوئے تھے۔ فرش پر انتہائی قیمتی قالین تھا، ایک جانب صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا، دوسری طرف ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ باتھ روم ملحقہ تھا، گویا کسی چھوٹے سے خاندان کے لیے یہ قید خانہ انتہائی مناسب تھا۔ کوروتی اندر داخل ہونے کے بعد آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی صوفے کی طرف بڑھ گئی اور پھر پروقار انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ہندوستان کے باشندے ہو؟''

''جی نہیں پاکستانی ہوں۔'' شاہ زیب نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''پھر بھی ہم میں سے ہی ہو۔''

''ہم میں سے کیا مراد، کیا اب میں آپ کے خیال میں کنور شمشیر سنگھ نہیں ہوں؟''

شاہ زیب نے تیکھی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس مسکراہٹ میں اتنا حسن، اتنی دلکشی تھی کہ شاہ زیب کے دل سے سارا غبار نکل گیا اور جی چاہا کہ نہ صرف ہمیشہ کے لیے کنور شمشیر سنگھ بن جائے بلکہ اپنی خدمات کوروتی کو پیش کر دے اور ان سے کہے کہ بس اب دنیا سے بچا کر اپنے ہی قدموں میں بسیرا کرنے دیجیے۔

وہ بدستور مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ ''تم جو کوئی بھی ہو میں نہیں جانتی کہ تمہارا تعلق کہاں سے ہے اور تم ان لوگوں کے جال میں کیسے آ پھنسے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کنور شمشیر سنگھ نہیں ہو۔ کنور شمشیر سے میری

صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ اب اس وقت جبکہ میں اپنے آپ کو دشمنوں کے درمیان تنہا پاتی ہوں، اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا میرے پاس کہ میں ان لوگوں کی خواہش کے مطابق تمہیں کنور شمشیر سنگھ کہہ دوں۔ کم از کم ایک ساتھی تو ملے، عارضی ہی سہی، لیکن ڈوبتے لوگ تنکے کا سہارا بھی پسند کرتے ہیں۔ میں اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہو گئی ہوں اور اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ کسی بھی ایرے غیرے کو میں اپنا ساتھی بنانے کی کوشش کروں۔"

"تو محترمہ، یہی ایرا غیرا آپ کو کیوں مل گیا تھا۔" شاہ زیب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"دیکھو، نہ میں تمہیں خود گرفتار کر کے یہاں لائی ہوں نہ جان بوجھ کر تمہارے پاس پہنچی تھی۔ تم جو کوئی بھی ہو ہوسکتا ہے تمہیں یہاں سے رہائی نصیب ہو جائے، اگر کر سکو تو میرے لیے تھوڑا سا کام کر دینا، اس کے بدلے کا تصور میرے ذہن میں نہیں ہے کہ ایک ایسی بے دست و پا لڑکی جس کا کوئی سہارا نہ ہو، کچھ بھی کر سکتی ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ تو ہوگا، اگر تم چاہو گے تو میں بعد میں اس بات سے انکار کر دوں گی کہ تم کنور شمشیر نہیں ہو، لیکن اس وقت کچھ دیر میرے ساتھ گزار لو۔ میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔" اس کی آواز میں حسرت سی پیدا ہوگئی تھی۔

شاہ زیب اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا یہ تو کرنا ہی تھا۔ کم از کم پہلی بار ایک ایسی شخصیت ملی تھی جس نے شاہ زیب کو وہ ماننے سے انکار کر دیا تھا جو دوسرے سمجھتے تھے۔ یعنی اس کے خدوخال اس بار کچھ لوگوں کو دھوکہ دینے کا باعث ضرور بنے تھے، لیکن جس شخصیت سے اس کی شناخت کرائی گئی تھی اس نے کہا تھا کہ شاہ زیب وہ نہیں ہے، یہ بات ذرا باعث اطمینان تھی اور شاہ زیب دی گریٹ، جن کے سپرد دنیا میں آنے کے بعد یہ ذمے داری عائد کی گئی تھی کہ وہ کبھی ہٹلر کے دست راست بن جائیں، کبھی کچھ اور کبھی کچھ بن جائیں۔

"کوروتی، آپ ہیں کیا چیز، اس بات کا اعتراف تو آپ کر چکی ہیں کہ آپ نے مجھے صرف ایک ساتھی کی حیثیت سے کنور تسلیم کیا ہے اور آپ کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میری شخصیت بلکہ قومیت ہی بدل جائے۔"

"ہاں میں اپنا مفہوم تم پر واضح کر چکی ہوں۔ اب دیکھو نا، میں خود تمہیں یہاں نہیں لائی، لیکن مجھے ایک موقع ملا تو میں اسے ہاتھ سے کیوں گنواؤں۔ ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ ان لوگوں نے آخر تمہیں کنور شمشیر سنگھ کے دھوکے میں کیسے پکڑا، اگر پسند کرو تو یہ بات بتا دو۔ میں اسے تمہارا تعاون تصور کروں گی۔"

"سیزارو نامی ایک شخص میرے لیے مصیبتوں کا باعث بنا ہے۔" شاہ زیب نے کہا۔

لڑکی بری طرح چونک پڑی، اس کی آنکھوں کے بدلے ہوئے انداز اور اس کی چونکنے کی کیفیت کو شاہ زیب نے بخوبی محسوس کیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"سیزارو کو تم کیسے جانتے تھے؟"

"کیا تم بھی سیزارو سے واقف ہو؟"

"ہاں وہ بہت اچھا انسان میری وجہ سے موت کا شکار ہوا، صرف میری وجہ سے۔"

"خوب خوب... اس کا مطلب ہے کہ اب تم مجھے اس کی کہانی بھی سناؤ گی۔"

"اگر تم پسند کرو۔ ویسے میں تمہیں اپنی کہانی سنانا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں میں نے۔ دیکھو ان لوگوں نے تمہیں اٹھا کر کنور شمشیر سنگھ کے دھوکے میں پکڑا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہارے خدوخال کسی حد تک کنور شمشیر سنگھ سے ملتے ہیں، لیکن یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کنور شمشیر سنگھ نہیں ہو، بعد میں ان لوگوں کو بھی اس کا علم ہو جائے گا اور اس کے بعد ممکن ہے یہ تمہیں چھوڑ دیں۔ یہاں سے جاؤ میرے دوست تو ایک کام کر دینا میرا، جس کے لیے میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ کام ایسا نہیں ہوگا کہ تمہارے لیے ناممکن ہو، لیکن ممکن ہے میری زندگی بچ جائے۔"

"کیا تم سیزارو کی بہن کو بھی جانتی ہو؟"

"جانتی نہیں ہوں، سیزاروکی زبانی ہی میں نے اس کا نام سنا تھا، سیزارو کہتا تھا کہ اس کی ایک ہی بہن ہے اور زندگی بنانے کا جو تصور اس کے ذہن میں ہے، وہ صرف سیسل کی وجہ سے ہے، وہ چاہتا تھا کہ سیسل کو زندگی کی ساری آسائشیں فراہم کردے، لیکن بدنصیب بھائی، بہن کے لیے یہ نہ کرسکا اور ان درندوں کا شکار ہوگیا، کاش ایسا نہ ہوتا..."

"مس کوروتی، اب ایسا کوئی معاملہ نہیں رہا۔ وہ بہن بھی اپنے بھائی کے پاس پہنچ گئی ہے۔" شاہ زیب نے کہا اور کوروتی ایک بار پھر چونک پڑی، اس کی آنکھوں میں دکھ کے تاثرات نظر آئے اور پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا واقعی سیسل بھی..... سیسل.."

"ہاں ان لوگوں نے مجھے اس کی لاش کے پاس ہی پایا تھا اور وہاں پولیس والوں کے بھیس میں انہوں نے مجھے گرفتار کیا؟"

"ہاں میں یہ جانتی ہوں وہ باقاعدہ جرائم پیشہ ہیں اور شاید ہر طرح کے جرائم کرلیتے ہیں۔ اکثر ان میں سے کچھ کو پولیس کے لباس میں دیکھا ہے جبکہ پولیس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اب تو اس کہانی میں مجھے دلچسپی محسوس ہورہی ہے مس کوروتی۔ چلیے ٹھیک ہے اگر تقدیر ہمیں اس طرح یکجا کررہی ہے اور آپ کے لیے مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہے تو پہلی بار، زندگی میں پہلی بار آپ کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ ہوں۔ سیزارو سے میری ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوئی تھی۔ وہ چند روز میرے ساتھ رہا اور اس کی وجہ سے ایک بار پہلے بھی ایک مصیبت میں پھنسا۔ پھر سیزارو مارا گیا اور اس کی بہن سیسل مجھے ملی۔ اس نے اپنے بھائی کے قاتلوں کے خلاف میری مدد حاصل کرنا چاہی۔ لیکن مس کوروتی میں ایک آوارہ گرد ہوں اور ہنگاموں سے بچنا چاہتا ہوں۔ میں بھلا سیسل کی کیا مدد کرسکتا تھا، چنانچہ میں یہاں آگیا اور میں نے ایسے ہی سیر وتفریح کے دوران سیسل کی لاش شہزادہ یوجین کے محل کے پاس جھاڑیوں میں پڑی ہوئی پائی کیونکہ میں اسے پہچانتا تھا اس لیے فطری طور پر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوگئے، لیکن اس سے قبل کہ میں اس لاش کے سلسلے میں کوئی کارروائی کرتا ان لوگوں نے مجھے پولیس والوں کی حیثیت سے پکڑ لیا اور اس کے بعد یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں کنور شمشیر سنگھ ہوں یا نہیں۔ میں نے انکار کردیا تو اس کی تصدیق کے لیے انہوں نے آپ کو طلب کرلیا۔"

کوروتی گردن ہلانے لگی تھی، اس کے گھٹاؤں جیسے سیاہ بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پر آپڑے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے آدھا چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہو۔ حسن وجمال میں یکتا اس حسین لڑکی نے واقعی دلوں پر حکمرانی کرنے کے تمام انتظامات اپنے اندر سمو رکھے تھے۔ وہ غم زدہ انداز میں گردن جھکائے رہی اور چند لمحوں کے بعد اس کی حسین آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر شاہ زیب کو ایک عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا تھا۔ وہ دلسوزی سے آگے بڑھا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوروتی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"شاہ زیب نام بتایا تھا تم نے اپنا؟"

"ہاں۔" شاہ زیب نے گردن ہلائی۔

"یقین کرو شاہ زیب، میری ذات میں ایک ایسی تشنگی ہے جو شاید کبھی کسی انسان کی ذات میں نہیں رہی ہوگی۔ تم جن حالات سے بھی گزرو، زندگی تمہیں جو کچھ بھی بنائے کم از کم اپنے آپ سے تو واقف ہوتے ہو۔ کوئی تم سے تمہارے بارے میں پوچھے تو اتنا تو کہہ سکتے ہو تم کہ تمہارا خاندان یہ تھا والدین یہ تھے، تمہارا ماضی کچھ اس طرح تھا...... اس طرح انسان اپنی شناخت کراسکتا ہے، لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کون ہوں تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ لوگ مجھے کوروتی کہتے ہیں میں کوروتی ہوں۔ اگر میرا کوئی اور نام لیا جائے تو میں اس کی تردید نہیں کرسکتی اس لیے کہ میں خود اپنی ذات میں ناقابل شناخت ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ میں کون ہوں، وہ لوگ جو ہوش سنبھالنے کے بعد میری نگاہوں کے سامنے رہے۔ بالآخر یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں وہ نہیں ہوں جواب تک تھی۔ سمجھے شاہ زیب، میں وہ نہیں ہوں جواب تک تھی اور وہ بھی نہیں ہوں جو آئندہ رہوں گی۔ تمہیں میرے الفاظ الجھے ہوئے محسوس ہوں گے لیکن میری ساری زندگی ہی الجھے ہوئے دھاگوں کے ایک انبار کی مانند ہے جس کا کوئی سرا کہیں سے نہیں ملتا۔ میں اپنی شناخت بھی چاہتی ہوں، جن

آنکھوں سے جینے والے دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھ پر نجانے کیا کیا قیامتیں ٹوٹتی رہی ہیں۔ میں سب کچھ ہونے کے باوجود اتنی افسردہ ہوں شاہ زیب کہ شاید میرا دل اندر سے نکل گیا ہو اور اگر کوئی میرے سینے کو چیر کر دیکھے تو دل کی جگہ اسے ایک گلا ہوا خون کا لوتھڑا نظر آئے گا جس پر اتنی ضربیں پڑی ہیں کہ وہ اپنی اصل شکل ہی کھو بیٹھا ہے۔ میں اپنے الفاظ کا مفہوم سمجھانے کے لیے نجانے کیا کیا کہہ رہی ہوں۔ بس تم ایک غمزدہ لڑکی کے بارے میں جو بھی تعین کر سکتے ہو وہ میری ذات کے ساتھ کر لو۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ سنو سنو کم از کم میری داستان سن لو، میرا دل ہلکا کر دو اور اس کے بعد چاہو تو مجھ پر لعنت بھیج کر چلے جانا۔ میں اپنی تقدیر کی سیاہی اپنے ہاتھ سے نہیں دھو سکتی۔''

اس کی آواز رندھ گئی اس بار شاہ زیب نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''کوروتی.. براہ کرم خود کو سنبھالو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ حالات کیسے ہی ہوں، میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔''

کوروتی نے اپنا خوبصورت سر شاہ زیب کے بازو سے لگا دیا۔ وہ شاہ زیب کے بازو سے سر لگائے روتی رہی، پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میرا تعلق کہاں سے ہے یہ تو نہیں جانتی، لیکن میں نے جب ہوش سنبھالا تو ہندوستان کے ایک چھوٹے سے قصبے سکھی پور میں خود کو پایا تھا۔''

شاہ زیب نے خود کو ایک نئی کہانی کے لیے تیار کر لیا کہانیاں جو اس کا مقدر تھیں۔ کہیں سے بھی کسی سے بھی ایک کہانی ضرور سننے کو ملتی تھی اور اس کے بعد.....

اس کے بعد کوئی کھیل شروع ہو جاتا تھا بہرحال کوروتی بدستور سسکیاں بھرتے ہوئے اپنی داستان غم سنا رہی تھی۔

''سکھی پور میں اس قصبے کے سب سے بڑے آدمی بھرت چند کی حویلی میں رہتی تھی۔ جس کا تعلق روپ چند کے خاندان سے تھا، میں اسے پتا جی کہتی تھی۔ بچپن کے حالات کیا تھے، کب میں بھرت چند کے گھر میں آئی بالکل نہیں جانتی تھی۔ جس طرح بچے گھروں میں رہتے ہیں اسی طرح میں بھی اس کے گھر میں رہتی تھی۔ بھرت چند کی زمینیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر شخص اسے جھک کر سلام کرتا تھا، مگر وہ میرا غلام تھا۔ ہاں شاہ زیب باپ اپنی بیٹی کا غلام۔ میں بچی تھی، شرارتیں کرنا چاہتی تھی، شرارتیں کرتی تھی اور دیکھتی کہ شرارتیں کرنے پر دوسری لڑکیوں کے ماتا پتا انہیں برا بھلا کہتے ہیں اور مارتے ہیں، ڈانٹتے ہیں، لیکن میری ہر شرارت پر وہ لوگ نہ صرف بے بس ہو کر رہ جاتے تھے بلکہ ایسے ڈرے ڈرے انداز میں مجھے سمجھاتے جیسے اگر میں ناراض ہو گئی تو ان کی تقدیر کا سورج غروب ہو جائے گا۔ اس صورت حال سے میں ایک ذہنی مریضہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ نوجوانی کی عمروں کو چھونے لگی تھی، لیکن کبھی کبھی اپنی وہ حیثیت نہ پا سکی جو ماں باپ کی نگاہوں میں اولاد کی ہوتی ہے۔ میں نے ایک دن کملا کو پیٹ ڈالا۔ غصے کے عالم میں وہ پہلی بار میرا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تو مجھے ایسا سرور آیا شاہ زیب کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اچانک ان لوگوں نے مجھے انسان مان لیا ہو، لیکن دور سے کملا کی ماں نے اس کی یہ بدتمیزی دیکھ لی اور پھر اس کی جوتیوں سے ایسی پٹائی ہوئی کہ میں خود بھی کسی کو نہ روک سکی۔ وہ یہی کہتی رہی کہ غلطی دیدی کی تھی، لیکن میری غلطی کبھی غلطی نہیں ہوتی تھی، اس صورت حال پر اب میں غور کرنے لگی تھی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جاتا ہے کہ میں اپنے آپ کو حویلی میں اجنبی سمجھوں۔

تجی بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھے ہر طرح کا سکھ دیا تھا، لیکن وہ محبت، وہ اپنائیت نہیں دی تھی جو ماتا پتا کے دلوں میں ہوتی ہے، بلکہ ہر شخص میری عزت کرتا تھا۔

ایک رات کچھ نامعلوم لوگوں نے حویلی پر گولیوں کی بارش کر دی، پہلے تو ہمارے چند ملازم مارے گئے، مگر اس کے بعد بھرت چند بندوق لے کر ان لوگوں کے مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ اس کے آدمیوں نے تھوڑی ہی دیر میں جنگ کا پانسا پلٹ دیا اور نہ صرف حملہ آوروں کو مار مار کر بھگا دیا بلکہ ایک شخص کو بھی اٹھا لایا جو گوری چمڑی والا ایک غیر ملکی تھا۔ بھرت چند اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اس وقت بے ہوش تھا، کافی دیر بعد اسے ہوش آیا تو بھرت چند نے کڑک کر اس سے سوال جواب کرنے لگا۔

''کون ہو تم اور میری حویلی پر حملہ کیوں کیا گیا تھا؟''

"تُو جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور تیری حویلی پر حملہ کیوں کیا گیا تھا۔" غیر ملکی نے جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا، تجھے بتانا ہوگا۔"

"بیوقوف آدمی، ڈینئل مارکو کو بھول گیا؟" میں نے محسوس کیا کہ اس نام پر بھرت چند کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ ڈینئل مارکو کون تھا اور بھرت چند سے اس کا کیا تعلق تھا۔ ظاہر ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ بھرت چند اس زخمی سے مختلف سوالات کرتا رہا اور زخمی اسے جواب دیتا رہا، اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر اس نے پستول نکالا اور سفید فام کے سر کا نشانہ لے کر دو گولیاں داغ دیں۔ سفید فام کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔ میں نے بھرت چند کی یہ درندگی پہلی بار دیکھی تھی، سفید فام کی لاش کو خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔ لوگ بھرت چند سے طرح طرح کے سوالات کرنے آئے مگر اس نے سختی سے ان سب کو منع کر کے بھگا دیا۔

دوسری رات اس نے اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو خاموشی سے وہاں سے کہیں اور بھیج دیا، یہ بات مجھے صبح ہی پتا چلی۔ بھرت چند مجھے اس بارے میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا لیکن مجھے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا، پھر اگلی رات میرے لیے بھی اس حویلی میں آخری رات ثابت ہوئی۔ بھرت چند نے تین گھوڑوں کا بندوبست کیا۔ ایک گھوڑے پر ساز و سامان لدا ہوا تھا اور باقی دو میرے اور اس کے لئے۔ آدھی رات کو بھرت چند میرے کمرے میں آیا اور آہستگی سے بولا۔

"کوروتی بیٹے، ہم لوگ چل رہے ہیں۔"

"کہاں پتا جی؟"

"چلو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ منہ ہاتھ دھو لو گھوڑے تیار ہیں۔"

میں گھڑ سواری کی شوقین تھی۔ حویلی کے اصطبل میں چار گھوڑے تھے جو کبھی کبھی میرے استعمال میں آجاتے تھے۔ گھوڑے کے سفر کا سن کر میں خوش ہوگئی اور اس کے بعد میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا اور یوں ہم انتہائی خاموشی سے سکھی پور سے نکل گئے۔

رات بھر یہ سفر جاری رہا۔ ہم جنگلوں اور چٹانوں میں بھٹکتے رہے۔ راجپوتانہ کے پہاڑی علاقے سرخ چٹانوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے تھے۔ صبح کا سورج نکلا تو ہم نے اپنے آپ کو ایک خوبصورت جنگل میں پایا۔ یہاں کا موسم سکھی پور اور اس کے قریبی علاقوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی رچی ہوئی تھی، چاروں طرف بکھرے ہوئے پہاڑوں اور ان کے گرد اگے ہوئے درختوں کو دیکھ کر میں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ بھرت چند کسی غار کی تلاش میں تھا۔ بالآخر اسے ایسا غار مل گیا جو اس کے خیال میں مناسب تھا، چنانچہ ہم نے وہیں پڑاؤ کا فیصلہ کر لیا۔ رات کو جب ہم سونے کے لیے لیٹے تو میں نے نرم آواز میں بھرت چند کو مخاطب کیا۔

"کیا اب بھی نہیں بتاؤ گے پتا جی کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

جواب میں بھرت چند عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو کوروتی؟"

"پتا جی۔"

"تو بیٹی یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر تمہارا پتا تم سے کہے کہ اس بارے میں کوئی سوال نہ کرو تو تم خاموش ہو جاؤ گی۔"

"خاموش تو میں ہو جاؤں گی، لیکن ایک بات آپ بھی سمجھئے کہ میرے دل میں ہمیشہ سے آپ کے لیے ایک احساس رہا ہے کہ میں آپ لوگوں کے درمیان اجنبی اجنبی ہوں۔ مجھے اس کی وجہ نہیں بتائیں گے۔"

بھرت چند پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا اس کے چہرے پر مختلف رنگ آ جا رہے تھے۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے کچھ ایسی باتیں میں تمہیں بتائے دیتا ہوں جو اس وقت ضروری بھی ہیں۔" وہ ذرا دیر کو جیسے سانس لینے کے لیے رکا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم برا مت ماننا اور نہ ہی دل چھوٹا کرنا، یہ انکشاف تمہارے لیے عجیب ہوگا لیکن سچ یہ ہے کہ تم میری بیٹی نہیں ہو۔

ہم سب تمہارے غلام ہیں۔ ہمارے سپرد صرف تمہاری پرورش کی گئی تھی۔''

میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آج اس سلوک کی وجہ مجھے معلوم ہوگئی تھی جو میرے ساتھ کیا جاتا تھا، لیکن یہ بات غم ناک بھی تھی کہ میں اپنوں میں نہیں ہوں۔

''میرے ماتا پتا کون ہیں؟'' میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''افسوس! میں بھی یہ نہیں جانتا، مجھے تو تم تنہا ایک جگہ ملی تھیں، تمہارے پاس ایسا ساز و سامان تھا جس سے یہ پتا چلتا تھا کہ تم کسی بہت بڑی آدمی کی بیٹی ہو۔ میں تمہیں اٹھالایا اور پھر میں نے تمہاری اپنی بیٹیوں ہی کی طرح پرورش کی، بلکہ خدمت کی۔ میں نے سب سے کہہ دیا کہ کوروتی کو کسی راجکماری کی طرح رکھا جائے، مگر اب برا وقت آگیا ہے۔''

''کیوں، اب کیا ہوگیا ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''کچھ ایسے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں جو تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ..وہ میرے بھی دشمن ہیں اور تمہارے بھی۔ تم اس جنگ کو بھول گئیں جو حویلی میں ہوئی تھی۔ وہ تمہیں اغواء کرنے آئے تھے، تمہارے سامنے ہی اس سفید فام نے کسی ڈینئل مارکو کا نام لیا تھا۔ وہی تمہارا اصل دشمن ہے۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آجائیں۔ میں تمہاری حفاظت کرنے کی کوشش کروں گا، لیکن تم اگر ڈینئل مارکو کے ہاتھ لگ جاؤ تو احتیاط سے اس سے معلوم کرنا کہ وہ تمہیں کیوں اغواء کرنا چاہتا ہے؟''

میں رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، لیکن اب نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بھرت چند تو کروٹ بدل کر سوگیا، لیکن میں روتی رہی اور انگاروں پر لوٹتی رہی، جب دوپہر بھی گزر گئی تو میں نے اسے جگانے کی کوشش کی، مجھے بھوک لگ رہی تھی، لیکن میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو ڈر کر ہاتھ ہٹالیا، وہ تیز بخار میں مبتلا تھا، غالباً سفر کی تھکن نے اسے نڈھال کردیا۔ میں نے اسے جگا کر پانی پلایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میں بیمار ہوگیا ہوں، مگر تم چنتا نہ کرو۔ کچھ کھایا پیا تم نے؟''

''نہیں۔''

''کچھ کھالو، میں تو بیماری کی وجہ سے کچھ کھانہ سکوں گا، ایک گلاس پانی اور پلادو مجھے۔''

میں نے اسے پانی دیا، لیکن خود بھی کچھ نہیں کھایا۔ وہ میری خوشامد کرتا رہا، مگر میں نے اس کی ایک نہ مانی، میں یہ جاننے پر مصر تھی کہ میں کون ہوں اور وہ یہ بتانے پر تیار نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھرت چند کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ وہ اب نیم غشی کی کیفیت میں تھا، جب مجھے بہت زیادہ بھوک لگی تو میں نے کچھ کھاپی لیا، لیکن اس سے میں نے اور کوئی گفتگو نہیں کی۔

دوسرے دن صبح دس بجے اس نے پھر پانی مانگا، میں نے اسے پانی پلایا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور نڈھال لہجے میں بولا۔

''کوروتی میری حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے، میں مرنا نہیں چاہتا کیونکہ ابھی مجھے تیرے لیے بہت کچھ کرنا ہے، لیکن اگر مجھے کچھ ہوجائے تو جس طرح بھی بن پڑے تو یہاں سے دھونا نواس روانہ ہوجانا، وہاں ویریندر سنگھ کی حویلی تلاش کرنے میں تجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اسے بس اتنا بتادینا کہ تو بھرت چند کی بیٹی ہے اور تیرا نام کوروتی ہے۔'' میں نے نام ذہن نشین کرلیا لیکن اس تصور ہی سے مجھے خوف آرہا تھا کہ میں اس جنگل اس ویرانے میں تنہا رہ جاؤں گی، لیکن کیا کرسکتی تھی؟

دوپہر کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے کہ اچانک باہر سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں ابھریں اور بھرت چند کے جسم میں جیسے بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ وہ اب تک بری طرح نڈھال نظر آرہا تھا، لیکن اس وقت اس نے پھرتی سے بندوق اٹھائی اور غار کے دہانے کے قریب آکر بیٹھ گیا، دوسرے گھوڑوں کو دیکھ کر وہ گھوڑے بھی ہنہنائے تھے جو ہمارے تھے اور ابھی تک اس غار کے عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ غالباً ان کی ہنہناہٹ نے دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کردیا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپیں تیز رفتاری سے غار کے قریب آنے لگیں۔ چند لمحے وہ غار میں بیٹھا رہا، پھر اسے نجانے کیا سوجھی کہ

غار سے باہر نکل گیا، لیکن دہانے پر آکر اس نے مجھ سے کہا کہ میں باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ ذرا دیر بعد میں نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں جو کافی دیر تک آتی رہیں اور پھر بند ہو گئیں۔ میں خاموشی سے سانس روکے غار میں ہی بیٹھی تھی کہ دفعتہ کسی نے اندر جھانک کر کہا۔

''لڑکی باہر نکل آؤ اور اطمینان رکھو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا، لیکن اگر تم نے ہتھیار استعمال کرنے کی کوشش کی تو تمہیں اسی جگہ ختم کر دیا جائے گا۔''

زبان اور لہجہ ہندوستانی ہی تھا۔ میں تھوڑی دیر سوچتی رہی اور پھر باہر نکل آئی۔ باہر پانچ آدمی تھے، جن میں سے صرف ایک ہندوستانی تھا۔ بھرت چند کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو ہندوستانی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔

''بھرت چند کو تلاش کر رہی ہو۔ وہ خیریت سے ہے اور آگے جا چکا ہے۔''

''کہاں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس کی حالت خراب تھی، ہم نے اسے گھوڑے پر بٹھا کر شہر بھجوا دیا ہے تاکہ ڈاکٹر اس کا علاج کر سکیں۔'' اس مقامی ہندوستانی نے کہا۔

چاروں انگریز بھوکی نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے وہ نوجوان تھے اور چہروں ہی سے خطرناک نظر آتے تھے۔ نجانے کیوں مجھے ان کی مسکراہٹیں بہت مکروہ محسوس ہوئیں۔ میں نے ہندوستانی کی طرف دیکھا وہ ان سے مختلف نظر آتا تھا۔ میرا وہ گھوڑا جس پر میں یہاں تک آئی تھی اسی کے قبضے میں تھا جبکہ اس کا اپنا گھوڑا تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔

''سوچو مت، جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کرو۔''

''میں بابا کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''تم سے کہا ناکہ بابا کو اس کی بیماری کی وجہ سے آگے لے جایا جا چکا ہے، پریشان کیوں ہو؟ یہاں سے تم بھی انہی کے پاس جاؤ گی۔''

میں چند لمحے سوچتی رہی۔ ان کی نگاہوں میں نہ آتی تو یقیناً ان کے ساتھ جانا پسند نہ کرتی، لیکن بھرت چند موجود نہیں تھا اور میں بے بس ہو چکی تھی، چنانچہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ہی چلوں۔''

ہمارا سفر تین گھنٹے جاری رہا، ہم ایک جگہ رکے تو ہندوستانی میرے قریب آگیا۔ غالباً وہ میری حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا تو اس نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک سمت اشارہ کیا۔ پہلے تو میں اس کا مقصد نہ سمجھ سکی، لیکن پھر میری نگاہیں اسی طرف اٹھ گئیں۔

ایک درخت کے پاس میں نے جو منظر دیکھا وہ میرے لیے انتہائی دہشت ناک تھا۔ ایک شخص درخت کے تنوں میں کیلوں سے گڑا ہوا تھا، اس کی گردن سینے پر جھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں پھیلا کر ان میں کیلیں جڑ دی گئی تھیں، یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور میں گھوڑے سے نیچے آ رہی۔ انگریز چونک کر میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس درخت کی جانب چل پڑی، درخت کے ساتھ کیلوں میں گڑا ہوا شخص بھرت چند تھا۔ اسے نہایت درندگی کے ساتھ زندہ درخت کے ساتھ جڑ دیا گیا تھا۔ میرے حلق سے مشینی انداز میں چیخیں نکلنے لگیں اور پھر میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

ہوش آیا تو خود کو انتہائی خوبصورت کمرے میں پایا۔ میرے بدن کے نیچے بڑی آرام دہ مسہری تھی، لیکن میں تنہا تھی، میں اٹھ کر دروازے کے پاس پہنچ گئی اور اسے زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ ذرا دیر کے بعد ایک ادھیڑ عمر ہندوستانی عورت نے دروازہ کھولا جس کے پیچھے کچھ مرد بھی کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' عورت نے کرخت لہجے میں کہا۔

''میں... میں کہاں ہوں۔ میں باہر آنا چاہتی ہوں۔''

''نہیں... تمہیں اندر ہی رہنا ہے۔ بیکار باتوں سے پرہیز کرو۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو یہ چاروں وحشی کتے تمہیں

بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے۔ جاؤ..اندر جاؤ، ان کے سامنے آنے کی کوشش مت کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔"
عورت نے کچھ ایسے انداز میں یہ جملے کہے تھے کہ میں خوفزدہ ہوگئی اور واپس اندر آ کر مسہری پر جا لیٹی میری آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دوبارہ آہٹیں ہوئیں۔ اس بار کچھ نئے لوگ اندر داخل ہوئے۔ ایک بوڑھا آدمی جس کے بال بالکل سفید تھے۔ وہ انگریز نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ گٹھے ہوئے سر کا مالک ایک اور شخص تھا جو دھوتی اور کرتا پہنے ہوئے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگائے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی چھڑی دبی ہوئی تھی۔ پیچھے کچھ اور لوگ آئے جو دروازے کے قریب ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں مجھے گھورتے ہوئے میرے پاس آ گئے تھے، دھوتی والے شخص نے کہا۔
"کوروتی ہوش میں آ گئیں؟"
"دیکھو تم لوگ مجھے چھوڑ دو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا، کیوں اس طرح مجھے یہاں لے آئے ہو۔ کیا دشمنی ہے تمہاری مجھ سے۔ میں کون ہوں اور میری ذات سے تمہیں کیا نقصان پہنچا ہے؟"
"فکر مت کرو کوروتی، یہاں تم آرام سے ہو اور ہم تمہیں یہی کہنے آئے تھے کہ کسی قسم کی فکر نہ کرنا۔ تم سے کچھ باتیں پوچھنی تھیں۔ اگر تمہارا دماغ صحیح ہو تو ان باتوں کا جواب دے دو، ہوسکتا ہے تمہاری جان بچ جائے، ورنہ نقصان بھی اٹھا سکتی ہو۔"
"بھالکسل... بھالکسل...." انگریز نے اردو میں کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس ہندوستانی شخص کو دیکھا اور بولی۔
"کیا پوچھنا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"
"بھرت چند کے بارے میں۔"
"اسے تو تم نے مار دیا۔"
"اسے مرنا ہی تھا لڑکی، لیکن اگر تم اس طرح مرنا نہیں چاہتیں تو یہ بتاؤ کہ بھرت چند نے مرنے سے پہلے تم سے کچھ کہا تھا؟"
"صرف اتنا کہ کچھ لوگ ان کے دشمن ہو گئے ہیں اور وہ مجھے بچانا چاہتے تھے اور یہ بھی کہ وہ میرے باپ نہیں تھے۔ میں کسی اور کی اولاد ہوں، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کس کی....."
"لڑکی ذہن پر زور دے کر بھرت چند کی تمام حرکتوں کی تفصیل بتاؤ۔ کوئی ایسی چیز ہے تمہارے پاس جو بھرت چند نے اپنے قبضے میں کر لی ہو یا جس کے بارے میں اس نے کبھی اشارتاً کہا ہو کہ اس سے تمہاری شناخت ہوسکتی ہے؟"
"کاش! ایسی کوئی چیز ہوتی۔" میں نے غمزدہ لہجے میں کہا اور ہندوستانی انگریز کی طرف دیکھنے لگا، تب انگریز نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔
"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں... میں ساری زندگی انتظار کر سکتا ہوں ویریندر سنگھ..."
میں بری طرح چونک پڑی، ویریندر سنگھ کا نام ہی تو لیا تھا بھرت چند نے، لیکن اس نے تو یہ کہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو میں دھونا نوا جا کر ویریندر سنگھ کے پاس پناہ لوں، کیا یہی شخص ویریندر سنگھ ہے؟"
"چلیے مسٹر ڈینئل میرا خیال ہے یہ ہمیں کچھ نہیں بتا سکے گی۔" ویریندر سنگھ نے کہا تو میں بھونچکا رہ گئی، دونوں نام ہی میرے لیے شناسا نکلے تھے۔ اس وقت تو وہ چلے گئے لیکن اگلی صبح دونوں مکار پھر میرے پاس موجود تھے، اس بار وہ دونوں تنہا ہی تھے۔ بڑے اطمینان سے آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈینئل مارکو نے جیب سے پائپ نکال کر دانتوں میں دبا لیا اور اسے سلگانے لگا۔ ویریندر سنگھ بولا۔
"کوروتی! آپ نے صورت حال کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی یادداشت استعمال کر کے ہمارے سوالات کے جوابات دے دیں، بچپن سے کوئی ایسی شے جو آپ کے لیے محفوظ رکھی گئی ہو یا جس کا تذکرہ بھرت چند نے آپ سے اس انداز میں کیا ہو کہ یہ آپ کی زندگی کا کوئی اہم راز ہے۔ اگر آپ اس کی نشاندہی کر دیتی ہیں تو یوں سمجھ لیجیے

کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ہر کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کو جیون گزارنے کی آزادی ہوگی۔ جس کے ساتھ جی چاہے رہیں۔ ہمیں آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی، بلکہ یہی نہیں آپ کو جیون گزارنے کے لیے ایک اچھا گھر اور بہت سی دولت دے دی جائے گی تاکہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو، ورنہ آپ اسی قید خانے میں اپنی بقیایا زندگی گزار دیں گی۔''

میں نفرت بھری نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ ڈینئل چہرے سے مکار نظر آتا تھا، کمبخت بوڑھا تھا لیکن ایسی شاندار صحت کا مالک کہ سفید بال مصنوعی معلوم ہوتے تھے۔ وہ پائپ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا اور بظاہر خود کو ان تمام باتوں سے لاتعلق ظاہر کر رہا تھا۔ میں نے ویریندر سنگھ کا چہرہ دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ ''ایک بات مجھے بھی بتا دیجیے چاچاجی۔ کیا یہ دھونا نواس ہے؟''

ویریندر سنگھ نے کسی قدر چونک کر مجھے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا ''ہاں دھونا نواس ہی ہے، مگر اس سے تمہیں کیا واسطہ؟''

''یہی تو پریشانی کی سب سے بڑی بات ہے ویریندر سنگھ جی، اگر یہ دھونا نواس ہے اور آپ ویریندر سنگھ تو پھر بابا نے مجھے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر وہ ان غاروں میں مر جائیں تو میں کسی طرح کوشش کر کے دھونا نواس پہنچ جاؤں اور آپ کے پاس پناہ لے لوں۔ ایسا کیوں کہا تھا انہوں نے۔ مجھے دشمنوں کے منہ میں کیوں پھینکنا چاہا تھا؟'' میں نے سوال کیا اور ویریندر سنگھ ہنس دیا پھر بولا۔

''اگر اس نے یہ کہا تھا تو پھر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی عمر کے آخری وقت میں وہ پاگل ہو گیا تھا، ورنہ ہوش کے عالم میں یہ کبھی نہ کہتا۔''

''چلیں... یہ تو بتا دیں کہ میں کون ہوں۔ اس کے بعد جو سلوک چاہیں میرے ساتھ کریں؟''

''تو تو سونے کی چڑیا ہے بلکہ ہما ہے کہ جس کے سر پر بیٹھ جائے اس کی زندگی بن جائے''

بوڑھے ڈینئل کا مکروہ قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا ''ویریندر سنگھ تم بہت ہی مسخرہ ہائے۔''

ویریندر سنگھ ہنستے ہوئے مجھے دیکھتا رہا۔

''سمجھ گئی تُو کہ تو کون ہے.... ہاں اب میرے سوال کا جواب دے ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''تو پھر ویریندر سنگھ! میرا بابا تو شاید آخری وقت میں پاگل ہو گیا تھا مگر تم ساری زندگی پاگل رہوگے۔ ایسی کوئی چیز میرے علم میں نہیں ہے اگر ہوتی بھی تو تمہیں کبھی نہ بتاتی، لیکن ایک بات سن کر تمہیں خوشی ہوگی کہ میں اپنی دھن کی پکی ہوں، تم لوگ جو سلوک چاہو میرے ساتھ کر سکتے ہو۔ لیکن کسی بات میں مجھے جھکا نہیں سکتے۔ مرنا ہر شخص کے بس میں ہوتا ہے اگر تم نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو میں جان دے دوں گی۔''

ڈینئل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چھالو ویریندر سنگھ! یہ لڑکی ابھی ٹھیک نہیں ہوگا۔'' اور اس کے ان الفاظ پر ویریندر سنگھ ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا تھا۔ جب وہ چلے گئے تو میں سوچنے لگی کہ ایسی کون سی چیز ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے میرے پاس رہی ہو اور مجھے اس کی حفاظت کے لیے کہا گیا ہو، صرف ایک چیز ہمیشہ سے میرے پاس تھی، سونے کا وہ زیور، جو اس وقت بھی میرے گلے میں تھا۔ ایک بار بابا نے کہا تھا کہ یہ میری جنم کنڈلی ہے اور جنم کنڈلی ہمیشہ ساتھ رکھنی چاہیے اور یہی جنم کنڈلی میری گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ٹٹول کر اسے دیکھا اور سوچنے لگی کہ کیا یہی جنم کنڈلی ان لوگوں کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے۔ بہر طور میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ شے جنم کنڈلی ہے یا نہیں، لیکن میں اسے کسی کو بھی نہیں دوں گی۔

پورا دن گزر گیا، کھانے پینے کا بندوبست کر دیا جاتا تھا اور میں تھوڑا بہت زہر مار بھی کر لیتی تھی کیونکہ بچپن ہی سے مجھ میں بھوک کی برداشت نہیں تھی، سارے غم تکلیفیں اپنی جگہ۔ شام کو ویریندر سنگھ دوبارہ میرے کمرے میں آیا، اس بار ڈینئل اس کے ہمراہ نہیں تھا۔ اس کے چہرے میں بھی کچھ تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بے اختیار مجھ پر جھپٹا... میں سمجھ نہیں سکی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے لیکن ویریندر سنگھ نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میری بچی! میری بیٹی، اپنے چاچا کو اتنا مجبور سمجھ کہ اس کے بعد مجبوریوں کا تصور ختم ہو جائے تُو میری اولاد کی طرح ہے، جو کچھ میں نے تجھ سے کہا، مجھے معاف کر دینا کہ، اگر میں یہ سب کچھ نہ کروں تو یوں سمجھ لے کہ میرا خاندان تک ختم ہو جائے۔ میں تیرے پاس زیادہ وقت نہیں رہ سکتا، صرف ایک بات بتائے دیتا ہوں کہ اگر تیرے علم میں کچھ ہے بھی تو انہیں ایک لفظ نہ بتانا، بلکہ معصومیت سے یہی ظاہر کرتی رہنا کہ تجھے کچھ نہیں معلوم۔ ایک خاص بات اور سن لے... کنور شمشیر سنگھ تیرا دوست ہے۔ شاید تُو نے بھی بھرت چند کے منہ سے جگاور سنگھ کا نام سنا ہو، شمشیر سنگھ اسی کا بیٹا ہے۔ جگاور سنگھ نے مرتے وقت اسے وصیت کی تھی کہ ساری زندگی تیری سیوا میں بسر کر دے، وہ جہاں اور جس حالت میں بھی تیرے سامنے آئے دوسروں کے سامنے اس کا اظہار مت کرنا، اس نے تیری ہی وجہ سے ڈینئل کی نوکری اختیار کی ہے، اسے اپنے دل کا راز بتا دینا، وہ تیرا سب سے بڑا محافظ ہے۔"

میں حیرت سے ویریندر سنگھ کی صورت دیکھتی رہی، اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتی باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور ویریندر سنگھ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اگلے دن ڈینئل پھر میرے پاس آیا، وہ بھی تنہا تھا، وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا تھا۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں لندن لیے جا رہا ہوں، تم اطمینان رکھو۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جن لوگوں سے میری دشمنی ہے ان تک تمہارے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ مجھ سے تعاون کرنا، ورنہ میں نہ سہی کچھ اور لوگ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا، میری بستی، میرے لوگ مجھ سے چھوٹ رہے تھے، نجانے میری تقدیر میں کیا لکھا تھا۔

پھر مجھے لندن تک کا سفر کرنا پڑا اور اس سفر میں وہ نوجوان میرے ساتھ تھا جس کا نام کنور شمشیر سنگھ بتایا گیا تھا۔ ہم لوگ بحری جہاز سے سفر کر کے کئی مقامات پر اترے اور بالآخر لندن پہنچ گئے۔ لندن پہنچ کر مجھے انگریزی زبان سکھائی جانے لگی۔ رہائش کے لیے معقول بندوبست کیا گیا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ کنور شمشیر سنگھ میرا محافظ تھا۔ ویریندر سنگھ کے بیان کے برعکس اس نے آج تک مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، البتہ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی اور چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا کنور شمشیر سنگھ سنجیدہ چہرہ لیے ہوئے میرے پاس پہنچ گیا۔

"کوروتی جی! آج پہلی بار مجھے موقع ملا ہے کہ میں آپ سے کچھ ذاتی باتیں بھی کر لوں۔ چند جملے کہنا چاہتا ہوں، میں آپ کے دشمنوں میں ضرور شامل ہوں، لیکن آپ کا واحد دوست ہوں۔ پتا جی نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں آپ کو اپنا جیون سونپ دوں اور آپ ہی کے لیے مر جاؤں۔ میں آپ کو پوری تفصیل تو نہیں بتا سکتا، بس اتنا کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتیں تو اپنی حفاظت کا بندوبست ضرور رکھیے گا، کوئی ایسی بات جو آپ کے ذہن میں ہو انہیں نہ بتایئے ورنہ اس کے بعد آپ کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں رہے گی۔"

"ویریندر سنگھ نے بھی مجھے یہی کہا تھا میں اتنی عاجز آ چکی ہوں اپنی زندگی سے کہ اب اگر مجھے موت بھی آ جائے تو مجھے چنتا نہیں۔"

"نہیں کماری جی، آپ کو مرنا نہیں ہے، بہت سے کام ہیں آپ کے سپرد، آپ کا جیون اپنا نہیں ہے، بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کے لیے جی رہے ہیں، اس لیے اپنا خیال رکھیے گا۔"

وہ واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ میں نے اسے عقب سے پکڑ لیا۔ "کیا تم بھی مجھے نہیں بتاؤ گے کہ میں کون ہوں اور میرے جیون کا کیا راز ہے؟"

"بھگوان کی سوگند! یہ میں بھی نہیں جانتا، کہیں کسی جگہ اس راز کا کوئی مرکز ضرور ہے، یہ لوگ آپ سے جو کچھ پوچھتے رہے ہیں اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہو گا۔"

"ٹھیک ہے، تم یہ زیور لے جاؤ۔ اس کے تعویذ میں میری جنم کنڈلی ہے۔ اگر تم معلوم کر سکتے ہو تو اس کاغذ کے ذریعے کوئی معلومات حاصل کر لینا، پتا چل جائے تو مجھے بھی بتا دینا اور اگر اس میں سے کچھ نہ نکلے تو اسے پھینک دینا۔ مجھے زیوروں سے دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے اپنی جنم کنڈلی اتار کر اسے دے دی اور کنور شمشیر سنگھ نے اسے چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

"اگر اس میں کچھ بھی نہیں ہے دیوی جی! تو اس میں آپ کا اعتماد چھپا ہوا ہے۔ چنتا نہ کریں، یہ میرے پاس آپ کی امانت ہے۔ اگر اس سے مجھے کچھ معلوم ہو گیا تو میں آپ کو بھی خبردار کر دوں گا اور اگر کچھ پتا نہ چلا تو آپ کی یہ امانت حفاظت سے آپ کے پاس پہنچا دی جائے گی"

شمشیر سنگھ باہر نکلا، لیکن اس کے بعد بھاگ دوڑ اور گولیاں چلنے کی آوازیں فضا میں ابھریں۔ میں وحشت زدہ ہو گئی۔ کچھ لوگ میرے کمرے کے دروازے سے بھی ٹکرائے تھے، انہوں نے دروازہ کھول کر اندر بھی جھانکا تھا، تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص اندر آیا اور اس نے خونخوار نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "چالاک لڑکی! تو نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا۔ کیا وہ زیور تو ہمارے حوالے نہیں کر سکتی تھی؟"

مجھے شدید حیرت ہوئی کہ ان لوگوں کو میری اور شمشیر سنگھ کی گفتگو کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا، لیکن بعد میں صورت حال پتا چل گئی۔ میرے کمرے میں ایسے خفیہ آلات لگا دیے گئے تھے جو میری آوازوں کو ریکارڈ کر کے دوسری جگہ منتقل کر دیتے تھے، مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ کنور شمشیر سنگھ چند لوگوں کو زخمی کر کے میری جنم کنڈلی لے کر نکل گیا ہے، اس کے بعد سے میں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ ڈینئل سے میری دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی، لیکن میں بہت سے شہروں میں لے جائی گئی۔ اب مجھ سے اس راز کے بارے میں بھی نہیں پوچھا جاتا، صرف مجھے قید رکھا جاتا ہے۔ یزاروکی کہانی بھی اسی درمیان میں شامل ہوئی تھی، وہ بھی میرے نگرانوں میں سے تھا۔ لیکن اسے مجھ پر ترس آ گیا، میں نے اسے اپنی کہانی سنائی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ کنور شمشیر سنگھ کو تلاش کرے گا۔ لیکن وہ اس سلسلے میں ناکام رہا اور فرار ہو گیا اور اب تم نے مجھے سیسل کی کہانی بھی سنائی ہے، بہر طور میں کسی کے لیے کیا غم کروں، میں آج تک خود اپنے بارے میں کچھ نہیں جان سکی۔ کیا قصہ ہے اور کون میرا اپنا ہے۔ شاہ زیب میں وہ بدنصیب لڑکی ہوں جسے اپنے ماں باپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ تمہیں یہ کنور شمشیر سنگھ کے دھوکے میں پکڑ لائے ہیں۔ تمہارے خدوخال اور جسامت اس سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اگر تمہیں ڈینئل کے سامنے پیش کیا گیا تو ظاہر ہے وہ اس بات کی تصدیق کر دے گا کہ تم کنور شمشیر سنگھ نہیں ہو اور اس کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں افسردہ ہوں کہ تم میری وجہ سے مصیبت میں پھنسے۔ اپنے آپ کو کنور شمشیر سنگھ تسلیم نہ کرو۔ کسی نہ کسی وقت اس کی تصدیق ہو جائے گی۔" کوروتی خاموش ہو گئی تھی۔ پھر شاید وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

شاہ زیب نے اس کی طرف دیکھا، عجیب حسن تھا، چہرے سے گویا گلاب کے رنگ حاصل ہوتے تھے، اتنی متناسب اور حسین لڑکی بلاشبہ اس سے پہلے شاہ زیب کی نگاہوں سے نہیں گزری تھی، شاہ زیب نے اس سے وعدہ کر لیا کہ رہا ہونے کے بعد بھی وہ اسے نہیں بھولے گا، کوروتی جواب میں خاموش ہی رہی تھی۔

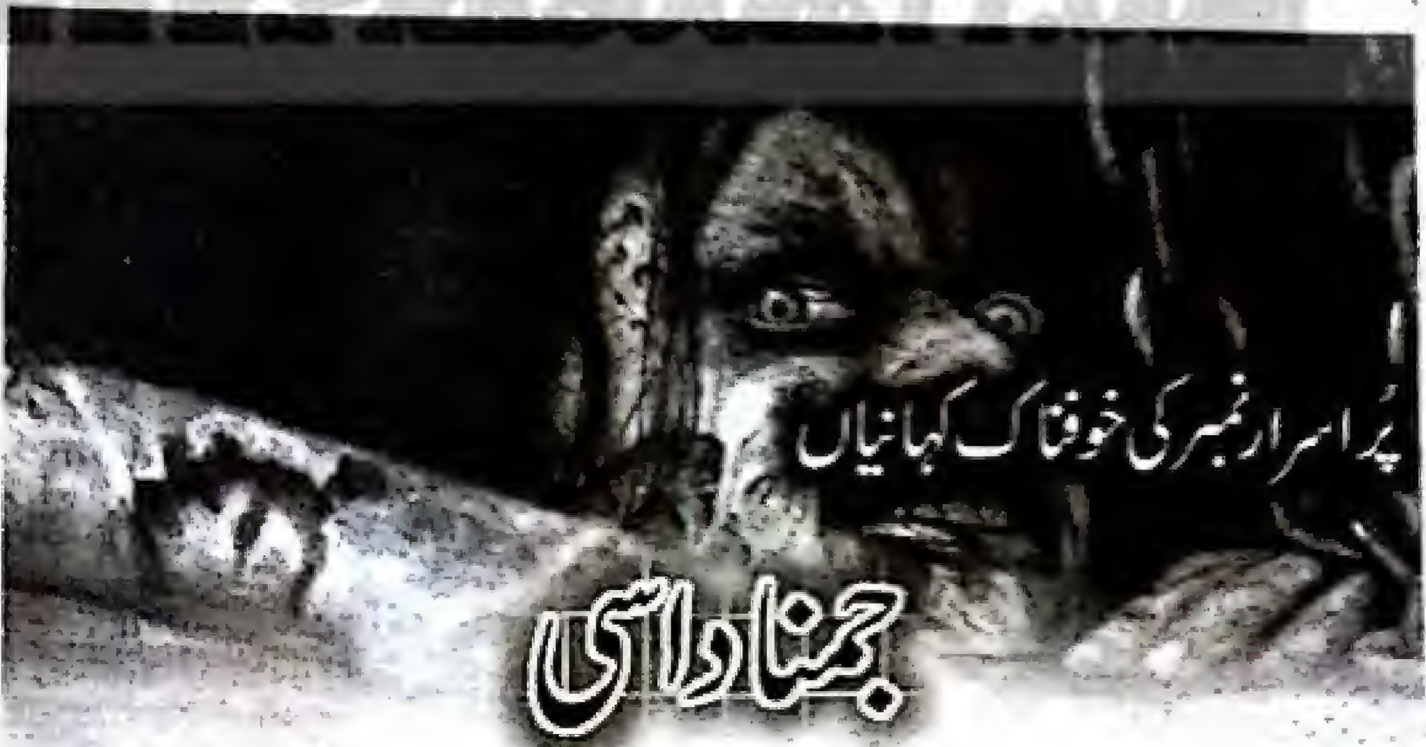
کافی دیر کے بعد چند لوگ شاہ زیب کو بلانے کے لیے آئے اور اسے اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلی بار شاہ زیب کی بات چیت ان لوگوں سے ہوئی تھی۔ وہاں اس وقت صرف دو افراد تھے۔ ایک بھاری بدن اور گنجے سر کا آدمی تھا اور دوسرا ایک بوڑھا تھا جس کے ہونٹوں میں پائپ دبا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے اندازہ لگایا کہ یہ ڈینئل ہی تھا بڑی بڑی آنکھوں میں ایک شاطرانہ چمک تھی۔ شاہ زیب کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور سامنے رکھی ہوئی کرسی پر اسے بیٹھنے کی پیشکش کی۔



"ہیلو مسٹر شاہ زیب۔" اس نے بھاری لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لیے شاہ زیب بوکھلا کر رہ گیا۔ تاہم اس نے خود کو سنبھال لیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس شخص نے شاہ زیب کو اس کے نام سے کیسے مخاطب کیا ہے۔

زندگی کے پیچیدہ راستوں میں ہم اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے، شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہو گی......؟

جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔



جمنا داسی

صدف آصف



میں اپنے دوست کشور کے پُر زور اصرار کالج کی چھٹیوں میں اس کے گاؤں راجن پور جانے کو تیار ہوا۔ اس کو سرپرائز دینے کے خیال سے جانے کی کوئی اطلاع بھی نہیں بھیجی۔ اس وقت موبائل فون عام نہ تھے بلکہ لینڈ لائن نمبر بھی خاص خاص لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔ ایک دوسرے سے رابطے کے لیے خط اور ٹیلی گرام کا استعمال عام

تھا میں نے کشور لال کو خط چر سے بھی اپنے جانے کی کوئی خبر نہ دی اور ایسے ہی اس کے گاؤں راجن پور روانہ ہو گیا۔

ریل میں بیٹھ کر ایک طویل سفر کے بعد جیسے ہی اس کے بتائے ہوئے اسٹیشن پر اترا تھکن سے میرا برا حال تھا۔ ایک زوردار انگڑائی لے کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ گاڑی لیٹ ہو جانے کی وجہ سے چلنے میں کافی تاخیر ہو گئی۔ ٹرین جب یہاں پہنچی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔

یہ ایک پرانا چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ زردی مائل بلبوں کی روشنی ہر طرف پھیلے اندھیرے کو کم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ کشور نے جو پتا دیا تھا، وہ قدرے معقول دکھائی دینے والے شخص کو پڑھ کر سنایا اور اس سے راستہ پوچھا۔ اس شخص نے جس طرح سے راستہ سمجھایا، اس کے حساب سے تو کشور لال کا مکان اسٹیشن کے بہت قریب واقع تھا۔

میں نے ادھر ادھر نگاہیں گھما کر سواری کے لیے جائزہ لیا، مگر وہاں اکا دکا مقامی لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہ دیا۔ سواری کا انتظار کرنے کی جگہ میں نے پیدل چلنے میں ہی عافیت جانی۔ سامان کے نام پر چھوٹا سا ایک بیگ کاندھے پر لٹکا ہوا تھا، یوں کچی سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اب درختوں کے جھنڈ شروع ہو گئے، فضا میں ایک غیر مانوس سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی میرا دل ایک دم کانپ اٹھا۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھ کر اوپر دیکھا تو۔ اچانک کہیں سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا، اس نے میرے سر پر اپنا پنجہ بڑی زور سے مارا، میں نے ہاتھ سے اسے دور بھگایا۔ وہ کالا سا، بدہیت پرندہ ایک خوفناک آواز نکال کر آسمان کی طرف اڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ مجھے زوردار چکر آیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا، گیلے اور چپچپے پن کا احساس ہوا تو ٹارچ جلائی، دھیمی روشنی میں انگلیاں چیک کی تو پتا چلا سر سے خون بہہ رہا ہے۔ جیب سے رومال نکال کر سر پر باندھا۔ دوبارہ سفر شروع کیا۔ یوں بنا اطلاع کے یہاں آنے پر اب میں پچھتا رہا تھا۔ مگر کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔

مجھے چلتے ہوئے کافی دیر ہو گئی مگر راستہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک خوف کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی، مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں راستہ بھول چکا ہوں، اب سر پکڑ کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ بھوک اور نیند سے برا حال ہو رہا تھا۔ بیگ میں سے ایک بسکٹ کا پیکٹ نکال کر کھایا، تھرماس میں سے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ ویران علاقے کا جائزہ لیا۔۔ مجھے دور ہلکی ہلکی روشنی سی دکھائی دی۔۔ دل کو تھوڑا سکون میسر آیا۔ میں تیز تیز قدموں سے اس طرف چل پڑا۔

گھپ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے مجھے چرر چرر کی آواز آئی۔ میں ایک دم ڈر گیا، لگا کوئی پیچھا کر رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ جھینگروں کی آواز سے ماحول مزید خوف ناک ہو رہا تھا۔

چرر چرر کی آواز پر مڑ کر دوبارہ دیکھا۔ غور کرنے پر سمجھ میں آیا، ارے یہ تو میرے جوتوں کی آواز ہے جو زمین پر گرے سوکھے پتوں کے پیروں تلے آنے سے پیدا ہو رہی ہے۔

کافی دیر چلنے کے بعد میں روشنی کے قریب پہنچ گیا، جب وہاں جا کر غور کیا تو میرا پورا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا قبرستان تھا، جہاں غیر معمولی سی ٹھنڈک اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ ٹوٹا ہوا تھا، قبریں متروک ہو چکی تھیں۔ کونے میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ یہ روشنی اس کے دروازے پر لٹکی لالٹین سے نکل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے قبرستان کی فضاء مزید پر اسرار ہو گئی۔

میں شش و پنج میں کھڑا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، اچانک ایک زوردار آواز سے جھونپڑی کا دروازہ کھلا، میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

ایک بے انتہا خوبصورت، کم عمر لڑکی، سفید ساری میں ملبوس اپنے لمبے کالے کھلے بالوں کے ساتھ مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

”ت......تم......کون ہو“ میرا حلق خشک ہو گیا۔

”شاہد بابو۔۔۔ گھبرائیں......نہیں......میں یہاں کی رکھوالن ہوں“ اس کی مترنم آواز مسحور کر دینے والی تھی۔

”تمہیں۔۔۔ میرا نام کیسے پتا چلا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں۔ جمنا داسی ہوں۔ تمہارے بارے میں سب جانتی ہوں۔“ اس نے بالوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

میں وہیں رکھی ایک اینٹ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اس

وقت میرے دل کی رفتار بہت تیز تھی، یہاں تک کہ مجھے اپنی دھڑکن بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

''اچھا! یہ بتاؤ...... تمہیں اس اندھیرے میں تنہا رہتے ہوئے خوف نہیں آتا؟'' میں نے اس کا امتحان لینے کا سوچا۔

''تنہائی تو انسان کی سدا کی ساتھی ہے، ماں کے پیٹ سے قبر کے اندھیرے تک منش تنہا ہی رہتا ہے، پھر کاہے کا ڈر'' وہ دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی۔ اس وقت اچانک جمنا کے خوبصورت چہرے کے تاثرات اتنے پراسرار ہوگئے کہ میں نے ایک جھرجھری سی لی۔

وہ ایک دم اٹھی اور سرہلاتی ہوئی جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔

''پہلے تم بھوجن کرلو...... میں جانتی ہوں بہت بھوکے ہو...... پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں'' وہ مٹی کے ایک پیالے میں سفید دودھ کا شربت، اور چنگیر میں کچھ جنگلی پھل لے کر لوٹی اور بے تکلفی سے گویا ہوئی۔

''اچھا...... تم میرے دوست کشور لال کے گھر کا پتا سمجھا دو گی۔ میں دراصل راستہ بھٹک گیا ہوں۔ میں نے مزیدار شربت ایک سانس میں پینے کے بعد امرود کے جیسے ذائقے والے پھل کو کترتے ہوئے اس سے مدد مانگنے کا سوچا۔

''بتا دو دوں گی...... مگر ایک شرط وہ اپنے گلابی پیروں کے ناخن سے کچی مٹی کریدتے ہوئے بولی۔

''تمہیں ایک رات میرا مہمان بن کر رہنا پڑے گا...... وعدہ کرتی ہوں بھور ہوتے ہی تمہیں پگڈنڈی تک پہنچا دوں گی۔ اصل میں کشور لال راجن پور میں رہتا ہے، جبکہ تم بھٹک کر ہمارے گاؤں گنگا پور میں آگئے ہو'' اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔

مرتا...... کیا نہ کرتا...... میں نے حامی بھرلی۔ ویسے بھی شربت میں جانے بھنگ گھوٹ کر ملائی گئی تھی یا کوئی اور نشیلی دوا کہ مجھ پر ایک سرور سا طاری ہوگیا۔

''رات بہت طویل ہے۔ ایسا کرو تم اپنی آپ بیتی سناؤ'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ کوئی بات ہی نہیں؟۔ اس کی ہرنیوں جیسی حسین آنکھوں میں ایک دم اداسی چھا گئی۔

''چلو۔۔۔ کوئی جگ بیتی ہی سنا دو'' میں نے تھوڑی دیر ناگوار خاموشی کو برداشت کیا، پھر گویا ہوا۔

''یہ ٹھیک ہے۔ میں تمہیں گنگا پور کی ایک مشہور پریم کہانی سناتی ہوں۔ اس طرح یہ کالی رات بھی کٹ جائے گی'' جمنا نے مجھے دلنشین مسکراہٹ سے نوازا۔ تو میں سرہلا کر ہمہ تن گوش ہوگیا۔

بہت سال پہلے کی بات ہے ہمارے گاؤں میں ایک بڑے جاہ وجلال کے مالک ٹھاکر رنجیت رائے کا راج چلتا تھا۔ گاؤں میں اس کی بہت بڑی حویلی تھی۔ جس میں وہ اور اس کا خاندان رہتا تھا، ان لوگوں کی کا پورے علاقے میں حکومت تھی۔ اتنا رعب و دبدبہ تھا کہ کوئی ان سے نگاہیں ملا کر بات نہیں کرسکتا تھا۔ سمجھو یہاں کوئی پرندہ بھی ان کی مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتا تھا۔

ٹھاکر رنجیت رائے جتنا نرم اور رحم دل تھے ان کا بڑا بیٹا اجیت رائے اتنا ہی زیادہ بے رحم اور سنگ دل تھا۔ وہ گاؤں میں رہنے والے غریبوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا۔ باپ منع بھی کرتا مگر وہ ایک سرکش گھوڑا تھا، جو کسی کے قابو میں نہ آتا۔ رنجیت رائے کا ایک چھوٹا بیٹا، سربجیت رائے بھی تھا، جو اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس کے مزاج میں نرمی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ایک فنکار تھا، اس کی بانسری کی لے پر گاؤں کی ہر کنواری لڑکی کا دل اٹکتا تھا۔ مگر وہ اپنے منشی کی بیٹی داسی کو من ہی من میں پریم کرتا تھا۔

ایک دن گاؤں کی شادی میں سنگی ساتھیوں کے کہنے پر اس نے بانسری پر ایسی دھن بجائی کہ سارے عش عش کر اٹھے۔ اس شادی میں داسی بھی شریک تھی۔ اس کا دل ایک دم سربجیت رائے کی طرف آپ ہی آپ کھنچنے لگا۔ وہ بھی اس کے پیار میں پاگل ہوگئی۔ اب دونوں دنیا سے چھپ چھپ کر درختوں کی جھنڈ میں ملنے لگے۔ داسی جانتی تھی کہ ان کا ملن آسان نہیں، پھر بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر سربجیت کا ہاتھ تھامے سپنوں کے رتھ میں بیٹھ گئی۔

ایک دن سربجیت کو بہت تیز بخار چڑھا، داسی کا دل اپنے محبوب کو دیکھنے کو بے قرار ہوا تھا۔ وہ بڑی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے کے بہانے حویلی پہنچ گئی۔ شومئی قسمت راستے میں اس کا ٹکراؤ، اجیت رائے سے ہوگیا۔ وہ اس

پکی کلی سی نار کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا، اس نے بڑھ کر داسی کی بانہہ تھام لی۔ داسی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے اجیت رائے سے جھٹک کر اپنی کلائی چھڑائی اور زمین پر تھوکتی ہوئی گھر لوٹ گئی۔

اجیت رائے اپنی کڑک دار مونچھوں کو بل دیتا، منشی کی بیٹی کی جرات پر حق دق رہ گیا۔ اس نے اپنے کارندے اس لڑکی کی جاسوسی پر لگا دیے۔

سربجیت رائے کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تو دوبارہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ داسی نے جان بوجھ کر سربجیت سے اس کے بھائی کی بدتمیزی کا ذکر نہیں کیا۔

ایک دن جاسوس نے ڈرتے ڈرتے داسی اور سربجیت کی پریم کتھا، اجیت رائے کو سنا دی، یہ سن کر وہ تو ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔

"جس لڑکی نے مجھے دیکھ کر تھوکا، اس کے لیے میرا چھوٹا بھائی پریم کی تان لگائے...... میں وہ ساز ہی توڑ ڈالوں گا، جس پر ان دونوں کی یہ پریم کتھا بج رہی ہے۔" اجیت نے زمین پر تھوکتے ہوئے سوچا۔

وہ ایک چودھویں کی رات تھی۔ چاروں اور چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ داسی کالی چادر اوڑھ کر اپنے محبوب سے ملنے درختوں کی جھنڈ میں پہنچ گئی۔ سربجیت پہلے ہی اس کے انتظار میں وہاں بیٹھا تھا۔ ابھی پیار کے متوالے اس جوڑے نے جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا کہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور سے زمین ہلنے لگی۔ یوں لگا جیسے زلزلہ سا آ گیا ہو۔ اس نے بھائی کو للکارا اور وہاں سے بھاگ جانے کو کہا، مگر سربجیت کی رگوں میں بھی وہی سرکش خون دوڑ رہا تھا جو اجیت رائے کی رگوں میں تھا۔ اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ داسی کو یوں تنہا چھوڑ کر منہ چھپا کر بھاگ جائے۔ اس نے انکار کر دیا اور داسی کو تسلی دی، جو اجیت اور اس کے گرگوں کے آ جانے سے لرز رہی تھی۔

"بھائی۔ آپ یہاں سے جاؤ" سربجیت نے چاقو نکال کر بڑے بھائی کو دکھایا اور حکم دیا۔ اس بات پر اجیت کا دماغ گھوم گیا، اس نے اسی چاقو سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی سربجیت کی ہتھیا کی، اس کے بعد داسی کا گلا کاٹ دیا۔ یوں دونوں پریم کرنے والے دنیا کی سفاکی کی نظر ہو گئے" جمنا نے کہانی ختم کی۔

"یہ تو ان لوگوں نے بڑا ظلم کیا" میں نے ایک آہ بھر کر کہا اچانک میری نگاہ داسی کی کی آنکھوں سے بہتے آنسو پر پڑی وہ اب سرخ خون بن کر ٹپک رہے تھے۔ میرے اندر خوف نے اپنا پنجہ گاڑا۔

"داسی تمہاری کون تھی" میں نے اپنا ذہن بٹانے کے لیے سوال کیا۔

"وہ...... میں...... ہی تو تھی......" جمنا نے اپنی گردن پر انگلی رکھ کر کہا، جہاں اب چاقو سے کٹنے کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ خون اس میں سے رس رس کر اس کی سفید ساڑی کو رنگین کر رہا تھا۔

"کیا بول رہی ہو...... پلیز مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے بھاگنے کا سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی پہلے والی حالت میں آ گئی۔

"ڈرو نہیں بابو! میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں تو صرف اپنے دشمنوں کے لیے خطرناک ہوں۔ اجیت رائے نے ہمارا انتم سنسکار کرنے کی جگہ ہمیں مارنے کے بعد یہاں زمین میں گاڑ دیا۔ تمہیں پتا ہے اس نے جب مجھے زمین میں دفنایا تو میں زندہ تھی۔ بس میں نے پرارتھنا کی کہ مجھے اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کی شکتی مل جائے۔ یہ قبریں دیکھ رہے ہو۔ میں نے بھی چن چن کر ان سب کو مارا۔ اور اپنے سربجیت کی موت کا بدلہ لے لیا۔ اب ان سب کو یہاں گاڑ کر خود ان کی رکھوالن بنی بیٹھی ہوں...... اب یہ ظالم سدا یہاں تڑپتے رہیں گے۔" جمنا داسی نے اتنا خوفناک قہقہہ لگایا، کہ میرا دل سکڑ نے لگا۔ آسمان پر بجلی کڑکنے لگی، ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میرا پاؤں پھسلا اور میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں پگڈنڈی کے پاس ایک پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہر طرف اجالا پھیل چکا تھا، پاس ہی میرا بیگ پڑا تھا۔

"اف توبہ کتنا۔ خوف ناک سپنا دیکھا" میں نے سر پر ہاتھ مار کر سوچا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک بیگ میں سے وہ ادھ کھایا، امرود جیسا پھل گرا جو مجھے جمنا داسی نے دیا تھا۔ میں آج تک سوچتا ہوں...... "وہ سب سپنا تھا یا سچ۔"

☆......☆......☆



خوفناک سائے

محمد خالد شاہان

تین سو سال قبر میں زندہ رہنے والے اُس پُر اسرار بچے کی کتھا،
جو اپنی ماں کا وعدہ پورا کرنے کے لیے زندہ رہا

میں صادق آباد سے بہاول پور جا رہا تھا۔ میرا دوست عثمان اور پرانا ملازم خان بابا بھی میرے ہمراہ تھے۔ خان بابا بہاول پور کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ہماری موٹر بہاول پور کے ایک قبرستان سے ہو کر گزری۔ قبرستان سڑک کی طرف تقریباً ایک فرلانگ تک چلا گیا تھا۔ شکستہ قبروں کے دردناک مناظر سے متاثر ہو کر میں دم بخود بیٹھا تھا۔

''مجھے ایک دفعہ اسی قبرستان میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔'' خان بابا نے یکا یک میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ عثمان کسی گہری سوچ میں تھا چونکنا ہو کر بولا۔

''کیا کہا بابا۔'' خان بابا کہنے لگا۔

''میں یہاں قریب ہی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ یہاں کسی زمانے میں شاہی قبرستان تھا۔ اس کے ایک سرے پر ایک فقیر رہتا تھا۔ گاؤں کے اکثر لڑکے اس سے کہانیاں سنتے۔ ایک دفعہ میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ شام کے بعد اس سے کہانیاں سننے چلا گیا کہانیاں سنتے ہمیں بہت دیر ہو گئی۔ میرے دوستوں نے تجویز دی کہ کیوں نہ رات یہیں بسر کی جائے۔ سردی شدید تھی۔ ہم لوگ نیچی چھت والی جھونپڑی میں لوئیوں میں دبکے ہوئے الاؤ کے قریب لیٹے ہوئے تھے۔ گوبر کے دھواں دھار ایندھن سے آنکھیں نہ کھلتی تھیں۔ گوبر کے تلخ دھوئیں سے نتھنوں میں ہلکی سی جلن محسوس ہونے لگی۔ میں لوئی میں منہ لپیٹ کر سو گیا۔ آدھی رات کو آنکھ کھلی تو ایک ایسی پُر ہول اور لرزہ خیز آواز سنائی دی کہ روح تک کانپ گئی۔ کوئی جاں بلب مریض کراہ رہا تھا یا کوئی جاندار دم توڑ رہا تھا۔ سکرات الموت کی آخری کھڑکھڑاہٹ بھی شاید اتنی خوفناک نہ ہو گی۔ یہ آواز قبرستان سے آ رہی تھی۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے ساتھیوں کو جگایا۔ سب کے سب اس لرزہ خیز آواز کو سن کر پہلے ہی دہلے ہوئے تھے۔ گوبر کا بدبودار ایندھن جل کر ختم ہو چکا تھا۔ گرمی کی آخری رمق بھی مفقود ہو چکی تھی۔ اس قبر نما تاریک جھونپڑی کے تعفن زدہ در و دیوار سے سردی پھوٹ رہی تھی۔ ہمارے دل سینوں میں بے چینی سے دھڑکنے لگے۔ گورکن کونے میں گرم بستر پر محو خواب تھا۔ ہم نے اسے بمشکل جگایا۔ وہ الاؤ روشن کر کے دیوار سے ٹیک لگا کر اطمینان سے حقے کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ خوفناک آواز برابر آ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا کہ یہ آواز کیسی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کی طرف بالکل خیال نہ کرو۔ ایسی آوازیں قبرستان سے آتی رہتی ہیں۔ یہ کسی گناہ گار روح کو عذاب ہو رہا ہے۔'' اس بات سے ہماری نیند غائب ہو گئی۔

ہم رات بھر الاؤ کے قریب سہمے ہوئے آگ تاپتے رہے۔ پو پھٹنے پر آواز بند ہو گئی۔ اجالا ہوتے ہی ہم سب وہاں سے بھاگ آئے۔ عثمان نے ایک پُر زور قہقہہ لگایا۔

''گورکن طبقہ بھی لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے کیسی کیسی روایتیں گھڑتا ہے۔ ایسے ویران مقامات پر رات کو اکثر بدروحیں آوارہ پھرتی رہتی ہیں۔ جن کی آواز سے یہ لوگ دوسرے کو ڈرا کر لطف اٹھاتے ہیں۔''

خان بابا وحدانیت کا معتقد تھا۔ اس نے مختلف دلیلیں پیش کر کے عثمان کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی رائے نہ بدلی۔ میں بھی خان بابا کا ہم خیال تھا اس لیے میں نے اس کی تائید کی۔ آخر کار یہ طے پایا کہ کل ہم لوگ بھی تجربے کے لیے اُس پرانے جھونپڑے میں رات بسر کریں گے۔

☆ ☆

دوسرے دن شام کے قریب ہم لوگ قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ قبرستان کا بوڑھا دوریش حیرت انگیز طور پر زندہ تھا۔ اس سے ہمیں اس قبرستان کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ ہم نے اسے انعام دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آج کی رات ہمیں اس کوٹھڑی میں جگہ دے اور خود کسی دوسری جگہ رات بسر کرے۔''

سائیں کے جانے کے بعد خان بابا نے کوٹھڑی صاف کی اور ایک طرف قدرے صاف جگہ پر ہمارے بستر لگا دیے۔

خزاں کا ناساز موسم تھا۔ ہوا میں بے کلی اور فضا میں ایک درد انگیز تھرتھراہٹ تھی۔ رات کی سنسان تاریکی میں درختوں کی برہنہ شاخوں سے رہ رہ کر ایک ہوک سی اٹھتی۔ دیے کی روشنی کوٹھڑی کی سیاہ دیواروں میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ ہم چپ چاپ دم سادھے بستروں میں پڑے رہے۔

آدھی رات کے قریب تمام دنیا بحر ظلمات میں غرقاب

ہو رہی تھی کہ یکا یک ایک خوفناک آواز نے ہمیں خوفزدہ کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرشتہ اجل کے پھنکارنے کی آواز ہے یا داروغہ جہنم کے ان کوڑوں کی جو کسی گنہگار روح پر برسائے جا رہے ہوں۔ خان بابا اور مجھ پر خوف و ہراس طاری تھا مگر عثمان پر بجائے خوف کے تعجب کا عنصر غالب تھا۔ وہ جھٹ سے اٹھا اور ٹارچ ہاتھ میں لے کر باہر نکل گیا۔ ہم نے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر اس کے پیچھے جانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور کونے سے قبریں کھودنے والی کدال لے کر دوبارہ باہر جانے لگا۔ ہم نے بڑے اصرار سے روکا لیکن وہ ضدی انسان راز کی تہہ تک پہنچنے پر تلا ہوا تھا۔ لاپروائی سے کہنے لگا۔

''میری فکر مت کرو۔ میں لاشوں کی صحبت میں بیٹھنے کا عادی ہوں۔'' میں نے کدال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تاہم اس کام کے لیے یہ وقت موزوں نہیں۔ صبح دیکھا جائے گا۔'' مگر وہ روکے نہ رکا۔ آخر خان بابا بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اب میرے لیے تنہا یہاں رہنا دشوار تھا سو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

ہوا خوفناک آواز کی سرسراہٹ کے ساتھ ناگوار گونج پیدا کر رہی تھی۔ خشک پتوں کی چرمرکی صدا پر روحوں کے چلنے پھرنے کا گمان ہوتا تھا۔ ایک ٹنڈ منڈ درخت کے سوکھے تنے کی کوکھ میں سوئے ہوئے گنجے سر والے گدھ روشنی پڑتے ہی لمبی لمبی گردنیں باہر نکال کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ٹارچ کی جھلملاتی روشنی میں ہمارے سائے لانبے اور ڈراؤنے ہو رہے تھے۔ سہمی ہوئی فضا میں قبریں خوف سے سکڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مُردے اپنی بے نور آنکھیں پھاڑ کر ہمیں قبروں سے گھور رہے ہیں۔ اور ابھی اپنے استخوانی ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیں گے۔ اس تکلیف دہ خیال کے زیر اثر میں بار بار اپنے سائے سے ڈر کر اچھلنے لگتا۔ مگر آفرین ہے عثمان پر...... وہ جانتا بھی نہ تھا کہ ڈر کس کو کہتے ہیں۔ بے کھٹکے قبروں کو روندتا ہوا ایک پرانی قبر پر جا کر کھڑا ہوا۔ اس قبر کا تعویز جو کبھی پختہ تھا۔ تڑخ کر پھٹ چکا تھا۔ اس پر بے حد کاہی اُگ رہی تھی۔ دائیں طرف ایک خزاں رسیدہ جھاڑی تھی۔ جس کی سوکھی ہوئی لمبی لمبی ٹہنیاں قبر پر پھیلی ہوئی تھیں۔

اُسے کیا پتا

نیندیں خراب کیں جس کے لیے اُسے کیا پتا
ساری زندگی جس کے نام کی اُسے کیا پتا
میں تو بے بس ہوں، مر جاؤں گا اُس کے لیے
پر وعدے کیے جس کے ساتھ اُسے کیا پتا
نگاہیں ترستی ہیں جس کے لیے اُسے کیا پتا
دل دھڑکتا ہے جس کے لیے اُسے کیا پتا
معلوم نہیں مجھ سے وہ کس بات پر خفا ہو گئی
خدا سے تنہائی میں معافیاں مانگتا ہوں اُسے کیا پتا
اب بس کاشف کیا دل کو دلاسا دینا
زندگی ختم ہوئی ہوئی جس کے لیے اُسے کیا پتا
کاشف عبید۔ بٹہ گرام

سرہانے کی طرف پتھر کی سل پر متوفی کا نام وغیرہ کندہ تھا۔ جو زنگ کی کثرت سے اس وقت نہ پڑھا گیا۔ یہ آواز اسی قبر سے آ رہی تھی۔

عثمان اسے کھودنے کی فکر کرنے لگا۔ بہت جلد اسے محسوس ہوا یہ قبر جو بظاہر پھٹ کر کھلی ہو رہی ہے۔ دراصل بہت مضبوط ہے۔ وہ جھاڑی کی سوکھی شاخیں ہٹا کر قبر کا کوئی کمزور حصہ تلاش کرنے لگا۔ یکا یک اس کا پاؤں جھاڑی کے قریب ایک گڑھے میں جا گرا۔

اس نے ٹارچ سے دیکھا تو یہ ایک سوراخ تھا۔ عثمان اس سوراخ کو تیزی سے کھودنے لگا۔ کدال کی ضرب پڑتے ہی وہ آواز آنا یکدم بند ہو گئی۔ مگر دھن کا پکا عثمان اپنے کام میں مصروف رہا۔ خان بابا ٹارچ لیے کھڑا تھا اور میں سوراخ سے نکلتی ہوئی مٹی کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پرے پھینک کر جگہ کو صاف کر رہا تھا۔

ایک گھنٹہ میں اس نے قبر دائیں طرف سے اکھیڑ کر رکھ دی۔ اس کے بعد اس نے پوری طاقت سے تعویذ کا خول اکھاڑ کر پرے دھکیل دیا۔ اب قبر ہمارے سامنے بالکل کھلی پڑی تھی۔

اُف اس دردناک نظارے نے ہمارے دل تڑپا دیے۔ قبر میں لاش کے قریب ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا تھا جو مُردے کے پستان چوس رہا تھا۔ قبر میں مردے کا تمام جسم

مٹی ہو رہا تھا مگر دونوں پستان تازہ دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ بچے کی شکل نہایت مکروہ تھی۔

بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکلی اور خان بابا بھی بہت بہت کہہ کر پیچھے ہٹا لیکن عثمان نے بچے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور کوٹھڑی میں لے آیا۔

دیے کی مسلسل روشنی سے گھبرا کر بچہ رونے لگا۔ اس کی بھیانک آواز کوٹھڑی کی دھندلی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ میں اور خان بابا اچک کر ایک کونے میں چلے گئے تھے۔ اُف یہ وہی آواز تھی جو قبر کی تہہ سے سنائی دیتی تھی۔ اس آواز میں اتنی کرختگی تھی کہ خدا کی پناہ! ایک ننھے منے بچے کی آواز کہیں نہ جا سکتی تھی۔

عثمان بھی پل بھر کے لیے بوکھلا گیا تھا پھر فوراً حواس درست کر کے بولا۔

”ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسے کچھ غذا دینی چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا۔ بڈھے کے طاقچے میں رکھے ہوئے مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں کوئی کھانے کی چیز تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک برتن میں اسے تھوڑا سا گھی مل گیا۔ جو اس نے بچے کو چٹایا اور بچے نے رونا بند کر دیا۔

ہم نے رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح سائیں کے آنے سے پیشتر ہی میں اور خان بابا قبرستان میں گئے اور رات کی کھودی ہوئی قبر کے تعویذ کا خول بدستور قبر پر رکھ کر مٹی سے بھر دیا جو رات کو وہاں سے نکالی گئی تھی۔ سرہانے کی طرف لگی ہوئی سل سے متوفیہ کا نام وغیرہ پڑھنا چاہا۔ حروف زنگ کی تہوں سے بالکل معدوم ہو چکے تھے۔ میں نے رومال پانی میں بھگو کر ان پر رگڑا آخر بڑی مشکل سے شمس النساء پڑھا گیا باقی حروف نہ پڑھے جاتے تھے۔ جب ہم لوگ واپس کوٹھڑی میں آئے تو عثمان بولا۔

”ہمیں سائیں کے آنے سے پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ سائیں کو اس بچے کی برآمدگی کے بارے میں مطلع کرنا اچھا نہیں ہے۔“

”میں نے کہا۔ چھپانے سے کیا فائدہ۔“ وہ بولا۔

”اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو یہ بات مشہور ہو جائے گی اور تمام دنیا اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے گی۔ اس طرح یہ بچہ مر جائے گا۔“ میں پھر بولا۔

”اس بچے کا پالنا خطرے سے خالی نہیں۔“

وہ بولا ”کیوں کیا تم نے بڑی بوڑھیوں سے بچپن میں کبھی نہیں سنا کہ کئی لوگوں کو قبرستان سے ایسے بچے دستیاب ہوئے جو حاملہ عورتوں کی میتوں نے قبروں میں جنے تھے۔“

میں نے کہا کہ یہ تو محض روایتیں ہوا کرتی ہیں، بھلا ایسی باتوں پر کوئی یقین کر سکتا ہے۔“

عثمان کہنے لگا۔ ”لیکن ایسی صورت میں جبکہ یہ روایت ہمارے سامنے عملی جامہ پہن چکی ہے قائل ہونا پڑے گا۔“

عثمان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں لاجواب ہو گیا۔ اس کے بعد عثمان بچے کو لے کر باہر نکل گیا۔ اور ہم سائیں کے آنے تک وہیں ٹھہرے۔

☆☆

عثمان نے اس بچے کا پالنا جتنا آسان سمجھ رکھا تھا اتنی ہی دشواریاں پیش آئیں۔ وہ بچہ خان بابا کے سپرد کیا مگر وہ بھی اس ذمہ داری کو نبھا نہ سکا اور آخر کار اسے ایک بے اولاد بیوہ کی گود میں دے دیا گیا۔

اس بچے کا نام فاروق رکھا گیا تھا۔ اس کے کفیل ہم لوگ تھے۔ وہ اس غریب بیوہ کی نگرانی میں پرورش پاتا رہا۔ چند ماہ کے اندر بچے کی شکل اتنی تبدیل ہو گئی کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ اس کے پچکے ہوئے گالوں کو گوشت سے پُر ہو کر حسین بنا دیا۔ اس پری زاد بچے کی بڑی بڑی اور لمبی آنکھیں خاص طور پر خوب صورت اور چمکیلی تھیں۔ مجھے اور خان بابا کو بہ نسبت عثمان کے اس بچے سے زیادہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ یہ بچہ حیرت انگیز طور پر نشوونما پا رہا تھا۔ بچے کے دماغ میں پیدائشی نقص تھا۔

دو برس کا ہوا تو غریب بیوہ کو شکایت رہنے لگی کہ بچہ نہایت تند مزاج ہے۔ جس گلاس سے وہ پانی پی لے وہ اس میں خود پانی نہیں پیتا اور اسے اپنے برابر بیٹھنے نہیں دیتا۔“

چار سال کا ہوا تھا کہ وہ بیوہ فوت ہو گئی۔ اب اسے دوبارہ خان بابا کے پاس لایا گیا۔ گھر لانے پر ہمیں اس کی عادات واطوار کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ جس طرح اس کی ہستی پُر اسرار تھی اسی طرح اس کی عادات واطوار بھی نرالی تھیں۔ وہ بھڑکیلے کپڑوں کا شائق اور عطریات کا عاشق تھا۔ جب تک دسترخوان پر بہت سے کھانے نہ ہوں وہ خوش نہ ہوتا۔ وہ قدرتاً حاضر جواب تھا۔ اس کی طبیعت میں فیاضی اس

درجہ تھی کہ جب کوئی بھنگی بھی اسے سلام کرتا تو اسے گھر کی چیزیں اٹھا کر انعام میں دے دیتا۔ اس کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہم اسے صدر جنگ کہنے لگے۔

فاروق کو ہم نے اس کے پراسرار حالات سے بالکل ناواقف رکھا تھا اور اس سے اس کے متعلق کسی قسم کا ذکر نہ کرتے تھے۔

☆☆

انہی ایام کی ایک رات کو خان بابا میرے پاس بوکھلایا ہوا آیا اور گھبرائی آواز میں کہنے لگا۔

"آقا فاروق کو کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔" میں گھبراہٹ میں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا فاروق کے کمرے میں آ گیا۔ فاروق کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر یکایک خان کی چیخ سن کر رک گیا۔ خان بابا نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

اُف دیوار پر فاروق کے دو سائے پڑ رہے تھے۔ دیر تک اس کی یہی حالت رہی پھر یکدم ایک سایا غائب ہو گیا اور فاروق بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ صبح میں نے عثمان سے جا کر اس وقت کا ذکر کیا۔ اسے بھی بڑا تعجب ہوا۔

ہم کئی دن سے اس واقعہ پر غور کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ یہ واقعہ ہفتے کی رات کا تھا۔ دوسرے ہفتے کی رات کو دفعتاً اس کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ اس کے سائے دو ہو گئے۔ اور وہ کمرے میں گھومنے لگا اس کے بعد فاروق کی ہر ہفتے کی رات یہ حالت ہونے لگی۔ ہم نے بہتر سے بہتر علاج معالجے کرائے، عاملوں کی طرف رجوع کیا، دم جھاڑے، ٹونے وغیرہ کیے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

☆☆

ایک دن عثمان میرے پاس آیا اس نے مجھے عجیب خبر سنائی وہ کہنے لگا کہ شہر کے مشہور رئیس انور علی کو آسیب ہو گیا ہے۔ اور ہفتے کی رات کو اس کے دو سائے ہو جاتے ہیں اور وہ پاگل پنے میں لکڑی کے صندوق سے ٹکریں مار مار کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

اس خبر نے مجھے مزید حیرت میں ڈال دیا۔ ہم دونوں اسی دن انور صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ عثمان سے ان کی پرانی صاحب سلامت تھی۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملے مگر ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ دیر تک ان کی بیماری کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ عثمان نے فاروق کا ذکر بھی شروع کر دیا اور اُس کی تمام داستان انہیں کہہ سنائی۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے کہا۔

"رئیس صاحب! میں وہ صندوق دیکھنا چاہتا ہوں جس سے ٹکریں مار مار کر آپ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔"

"آپ شوق سے دیکھ سکتے ہیں۔" انور صاحب بولے۔ اس میں پرانے زمانے کی چند تحریروں اور اسلحے کے علاوہ کچھ نہیں۔

انور صاحب ہمیں گھر کے اندرونی حصہ میں لے گئے جہاں ایک پرانی طرز کے دالان نما کمرے کے کونے میں لکڑی کا بہت بڑا پرانا صندوق رکھا تھا جس پر قدیم ساخت کا سرخ چمکیلا روغن کیا گیا تھا اور جا بجا پیتل کے بڑے بڑے پھول اور پتریاں جڑی ہوئی تھیں۔

انور صاحب نے صندوق کھولا۔ اس کے پہلے دو خانوں میں ان کے آباؤ اجداد کا سپہ گری کا ساز و سامان اور وردیاں رکھی تھیں اور نچلے خانے میں پرانی دستاویزیں اور دوسرے کاغذات بھرے تھے۔ ہم دیر تک ان کاغذات کا معائنہ کرتے رہے لیکن ہمیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دی جو ان واقعات پر روشنی ڈال سکتی۔ آخر انور صاحب صندوق بند کرنے کو تھے کہ اوپر کے خانے میں مجھے ایک زردوز طلادانی نظر آئی۔ میں نے اسے اٹھا کر کھولا۔ اس میں دو خط ایسے دستیاب ہوئے جو کبھی حنائی رنگ کے کاغذ پر لکھے گئے تھے مگر اب خاکستر ہو رہے تھے۔ خط کی طرز تحریر زنانہ تھی۔ ایک خط کا مضمون یہ تھا۔

میری غمگسار بہن سکھ ورشا دیوی۔

تسلیم!

میں آپ کے اشارے کے مطابق راکھی لے کر دیوان تک کل راج جی کے پاس گئی۔ انہوں نے جس ہمدردی اور جاں نثاری کا ثبوت دیا وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ وہ جتنے بہادر ہیں اتنے رحم دل بھی ہیں۔ انہوں نے جان پر کھیل کر مجھے اپنے پتی سے ملایا۔ آہ پتی دیو کی حالت دیکھ کر غم سے میرا دل پھٹ گیا۔ وہ بالکل پہچانے ہی نہیں جاتے تھے۔ ان کی شہزادگی فقیری میں تبدیل ہو رہی ہے۔ ان کی صحت بھی

نہایت خراب ہے۔ بھلا شاہی محلات میں عیش و عشرت کے خوگر شہزادے کو قلعہ گوالیار کے تنگ و تاریک تہہ خانے کی ہوا کیسے راس آتی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے سنہرے خوابوں کی یہ دل شکن تعبیر ہوگی کہ میں پتی دیوتا کو بجائے تخت نشین ہونے کے خاک نشین دیکھوں۔ کاش ہمارے دن پھر بدل جائیں، مگر نہیں یہ خیال عبث ہے۔ بھائی کی سنگ دلی پر ان کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ اب وہ ملک گیری کی ہوس میں انسانی خون بہانے سے سخت کبیدہ خاطر ہیں۔ اب ان کے دل میں صرف یہ آرزو ہے کہ ان کا لاشا بجائے تہہ خانوں میں سڑنے کے ان کے آباؤ اجداد کی لاشوں کے پاس دفن ہو۔ میں اس وصیت کو پورا کرنے کا مقدس اگنی کنڈ پر قسم اٹھا کر ان سے عہد کر چکی ہوں۔ اب اس قسم کی ادائیگی مجھ پر فرض ہے۔ اگر میری عمر نے وفا نہ کی تو شہزادہ مراد کا بچہ، جو میرے پیٹ میں ہے میری قسم پوری کرے گا۔

فقط پر بھاوتی عرف شمس النہار بیگم"

شمس النہار کا نام پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اس قبر پر لکھا ہوا نام یاد آ گیا جس سے فاروق برآمد ہوا تھا۔

میں نے بیتابی سے دوسرا خط اٹھایا۔ اس میں لکھا تھا

ہمدم و ہمراز سکھ در شاد یوی!

موت مجھ سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ وقت کی تند ہوا میرا چراغ ہستی گل کرنے کے درپے ہے۔ میں ابھی تک اس کا سختی سے مقابلہ کر رہی ہوں۔ مجھے بچے کا انتظار ہے تاکہ میں اسے خیر و برکت دے کر دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ آہ اُس کے پیدا ہونے کا وقت بہت دور ہے۔ موت کہاں تک مجھ سے رعایت کرے گی۔ کیا یہ بچہ میرے ساتھ ہی قبر میں جائے گا اور اس طرح ایک ہستی تلف ہو جائے گی، جس پر ایک مظلوم شہزادے کی وصیت اور ایک راجپوتانی کی قسم کا دارومدار تھا۔ نہیں میرا بچہ نہیں مر سکتا۔ جب تک میری قسم پوری نہ ہو۔ خواہ میری روح کو سخت سے سخت عذاب ہی کیوں نہ بھگتنا پڑے۔ میری قوت ارادی اسے زندہ رکھے گی اور اس سے یہ قسم جبراً پوری کرائے گی۔"

ان عجیب و غریب خطوط نے میرے جسم میں لرزہ ڈال دیا۔ میں نے وہ خط عثمان اور انور صاحب کو پڑھ کر سنائے۔

"کیا فاروق وہی بچہ ہے۔" میں نے حیرت و استعجاب سے کہا۔ عثمان نے زوردار لفظوں میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"یہ قطعاً ناممکن ہے۔ آپ کچھ تو خیال کریں۔ یہ خط آج سے تین سو سال پہلے شہزادہ مراد کی بیگم نے لکھا تھا۔ تین سو سال تک اس بچے کا قبر میں زندہ رہنا، پھر ایک نو زائیدہ بچے کی صورت میں قبر سے نکلنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کسی مردے کا جی اٹھنا۔"

"یہ بات کسی روحانی طاقت یا قوت ارادی سے کچھ بعید نہیں۔" انور صاحب نے کہا۔ "اول تو قبر میں بچہ ہونا ہی کیا کم حیرت انگیز ہے جو آپ اس امر سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں ممکن اور ناممکن کا سوال ہی فضول ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ وہی آسیب زدہ بچہ ہے جو اس خط کی راقمہ نے قبر میں جنا۔ اب تک وہ کسی غیر مرئی قوت کے تحت زندہ ہے۔ آپ مانیں یہ نا مانیں اسی بیگم کی روح ان خطوط کو حاصل کرنے کے لیے مجھے تکلیف دیا کرتی ہے۔"

عثمان لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا تاہم ہماری تشویش بڑھتی گئی اور ہم اس شش و پنج میں گھر چلے آئے۔

☆☆

دن گزرتے گئے۔ فاروق کو اس سائے کی تکلیف بدستور تھی اور اب اس کی افسردگی حد سے بڑھ چکی تھی۔

ایک دن رئیس صاحب کو دیکھنے آئے تو وہ بہت خوش تھے۔ جب سے وہ خط ان کے گھر سے نکلے پھر بھی انہیں سائے نے نا ستایا تھا۔ وہ دیر تک فاروق سے باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن انور صاحب نے مجھے اور عثمان کو بلا بھیجا اور کہنے لگے۔ "میں دعوے سے کہتا ہوں کہ فاروق وہی پر اسرار بچہ ہے، جس کا ذکر شہزادہ مراد کی بیگم نے اس خط میں کیا تھا اور اس لڑکے کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی روح بیدار ہے اور کسی پراسرار دنیا میں اس قسم کی ادائیگی کا اقرار کر چکی ہے۔" عثمان کہنے لگا۔

"اتنی صدیوں کے بعد ایک گمنام لاش کی جستجو کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔" رئیس صاحب بولے "تمہیں قسم کی ادائیگی یا لاش سے غرض لڑکے کو صرف اس خیال سے وہاں سے لے جانا چاہیے کہ شاید اس سرزمین پر اس کے قدم پڑنے سے ایک بے چین روح کی تسکین ہو جائے اور وہ

اسے چھوڑ دے۔'' ان پے در پے انکشافات نے ہمیں پریشانی میں ڈال رکھا تھا اس لیے رئیس صاحب کے کہنے پر ہم فاروق کو سیر کے بہانے گوالیار لے گئے۔

☆......☆......☆

گوالیار پہنچ کر دوسرے دن ہم قلعہ دیکھنے گئے۔ زمانہ قدیم کی صنعت و عجائبات دیکھے جہاں شاہی محلات تھے وہاں ایک مضبوط قسم کا بوڑھا جاٹ چوکیدار ہمیں ملا جو سر پر بڑا سا منڈاسا باندھے کھڑا تھا۔ اس کی چھدری داڑھی چڑھی ہوئی تھی اور گھنے ابروؤں کے نیچے گول گول چمکتی ہوئی آنکھوں سے سخت گیری جھلک رہی تھی۔ یہ شخص بالکل گنوار تھا۔ اس نے ایک خاص انداز سے تن کر ہمیں سلام کیا پھر ہاتھ سے ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے ہولیا۔ وہ کئی ایک زینے اور بھول بھلیاں طے کرتا ہوا ہمیں ایک وسیع صحن میں لے گیا جس کے اردگرد بڑے بڑے فراخ دالان، مورتی نما ستونوں پر کھڑے تھے۔ ویران محل کے اداس درودیوار کی ایسے چرخ کی ہلاکت آفرینیوں کا گلہ زبان حال سے کر رہے تھے۔ بوڑھے چوکیدار نے اپنی پھٹی ہوئی جیب سے ایک زرد رنگ کا بوسیدہ کاغذ نکالا۔ اس کے بعد واپس لوٹا اور شان تحکم سے ہمارے آگے چلنے لگا گویا یہ عالیشان قلعہ اس کے باپ دادا کی ملکیت ہے۔ وہ بے شمار زینے اترتا، کئی تکونی ڈیوڑھیاں اور نیم چھت بخار چیاں عبور کرتا ہوا ہمیں ایک تہہ خانے میں لے گیا اور اس اندھیری گپھا میں ہم بہت گھبرائے مگر بوڑھے چوکیدار نے جھٹ برقی لیمپ روشن کر دیا۔ برقی لیمپ کی روشنی سے تہہ خانے کی تاریک و بد نما سنگی عمارت جگمگا اٹھی۔ اس تہہ خانے کی درمیانی گنبد نما چھت سنگین ستونوں پر کھڑی تھی۔ جن کی محرابوں کے دونوں طرف موٹے موٹے آہنی کڑے لٹک رہے تھے اور ستونوں کے پیچھے چاروں طرف ایک تاریک روش بنی ہوئی تھی۔ زینے کی تنگ جالیوں سے آنے والی ہوا کے پریشان جھونکے تہہ خانے کے قبر نما تنگ دروازے سے داخل ہو کر ایسی دردناک آواز پیدا کر رہے تھے جیسے کوئی بدقسمت اسیر سسکیاں لے کر رو رہا ہو۔ چوکیدار نے جھٹ زرد کاغذ جیب سے نکالا اور پڑھ کر کہنے لگا۔

''اس تہہ خانہ میں مجرموں کو تہ تیغ کیا جاتا تھا اور باغی ان آہنی کڑوں سے باندھ کر رکھے جاتے تھے۔'' ہم چوکیدار کی باتیں سن رہے تھے۔ اور فاروق پاگلوں کی طرح چکر لگانے میں مصروف تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کی تلاش میں ہے۔ کچھ دیر بعد وہ خاموشی سے ستون کی ٹیک لے کر سوچنے لگا پھر چوکیدار سے کہنے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کب سے یہاں ملازم ہو۔''

بوڑھے نے جیب سے زرد کاغذ نکال کر دیکھا اور جواب دیا ہمارا نام راموکا کا ہے۔ ہم پشت ہا پشت سے اس قلعہ کے محافظ ہیں۔'' بوڑھے کی زبان سے ایک ہی سانس میں شجرہ نسب سن کر ہمیں بے اختیار ہنسی آ گئی۔ فاروق بھی مسکرا دیا۔ اس پر بوڑھا چوکیدار فخر سے اکڑتا ہوا تہہ خانے سے نکلا اور پھر اس سے بھی نیچے جانے کے لیے زینے سے اترنے لگا۔ یہ زینے بہت تنگ و تاریک تھے مگر چوکیدار بجلی کے قمقمے روشن کرتا گیا اس لیے کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ اختتام پر تحت الثریٰ میں ایک اور مثمن تہہ خانہ تھا۔ جس کی ہوا نہایت کثیف اور نم آلود تھی۔ یہ کمرہ بلاشبہ ظلمات کا نمونہ تھا۔ گو بجلی روشن تھی مگر اندھیرا پوری طرح دور نہ ہوا تھا۔ ستونوں سے باہر والی روش کی دیوار سیاہی مائل دھندلی سی دکھائی دیتی تھی۔ ہم آگے تھے اور فاروق کسی گہری سوچ میں پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یہ تہہ خانہ بھی ہو بہو اوپر والے تہہ خانے کا نقشہ تھا، وہی ستونوں پر جھکی ہوئی گنبد نما چھت، وہی محرابوں میں لٹکتے ہوئے آہنی کڑے اسی طرح کی روش البتہ یہاں ایک چیز کا اضافہ تھا۔ تہہ خانے کے عین درمیان کوئی چار پانچ فٹ گہرا حوض بنا ہوا تھا۔ چوکیدار زرد کاغذ دیکھ کر کہنے لگا۔

''صاحبان یہ وہ تہہ خانہ ہے جہاں اورنگ زیب بادشاہ نے اپنے بھائی شہزادہ مراد کو قید کر رکھا تھا۔ اس حوض کو اگنی کنڈ کہتے ہیں۔'' جونہی بوڑھے کی زبان سے یہ الفاظ نکلے فاروق ہمیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور بے تحاشا چیخ مار کر اس حوض میں کود گیا اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

''آہ یہ وہی جگہ ہے اور یہی اگنی کنڈ ہے۔ جہاں خواب میں، میں نے ایک عورت کو قسم اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' بہت دیر تک وہ اس تہہ خانے میں دیوانہ وار پھرتا رہا آخر کار بڑی مشکل سے اسے سمجھا بجھا کر ہم ڈیرے پر واپس لائے۔

☆......☆......☆

قلعے میں گئے ہمیں تین دن گزر چکے تھے۔ ہفتے کی رات تھی۔ یکایک خان بابا نے ہمیں جگا کر اطلاع دی کہ فاروق غائب ہے۔ اس خبر سے ہمیں سخت تشویش ہوگئی۔ خطرہ تھا کہ وہ کسی نئی مصیبت کا شکار نہ ہوجائے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ ضرور قلعے کی طرف گیا ہوگا چنانچہ ہم لوگ اس وقت تیز رفتاری سے اس کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔

☆☆

قلعے کی گیٹ کے قریب ہمیں ایک سایا دکھائی دیا یہ فاروق تھا جو اندھا دھند قلعے کے صدر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ عثمان کی رائے تھی کہ اس کے کسی کام میں دخل نہ دیا جائے اور چپ چاپ اس کا تعاقب کر کے دیکھیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر ہمیں انتہائی تعجب ہوا کیونکہ قلعے کے صدر دروزاے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ فاروق اس کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہوگیا۔ ہم بھی دبے پاؤں دروازے کے قریب گئے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک عجیب نظارہ دکھائی دیا۔ بوڑھا چوکیدار ہاتھ میں زرد کاغذ پکڑے دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ دیوار پر اس کے دو سائے پڑ رہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح ان سایوں سے باتیں کر رہا تھا۔ چاند اس وقت پوری تابانی سے روشنی کے فوارے اچھال رہا تھا اور سامنے فلک شکوہ پہاڑی قلعہ تھا۔ اس پہاڑی قلعہ پر چڑھتی ہوئی اونچی اور پیچیدہ سڑک شفاف کرنوں کی نورانی چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ فاروق سڑک پر دیوانہ وار دوڑتا جا رہا تھا۔ رات کے بھیانک سکوت میں وہ خوفناک کھنڈوں اور تاریک کھائیوں کی طرف جھک کر مدہوشی میں کھوئے ہوئے بے تابانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دو رویہ چٹانوں کی بلند فصیلوں کے درمیان پہنچ کر وہ مہاتما جین کی طویل القامت مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ یکایک ایک بگولہ اٹھا جو کالی گھاٹیوں، مہیب دراڑوں اور ویران کھنڈروں سے دردناک آواز پیدا کرتا ہوا چٹانوں سے ٹکرانے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جین کی عظیم الہیبت مورتی جس کے پاؤں تحت الثریٰ میں اور سر آسمان کو چھو رہا تھا، کانپ رہی ہے۔ اس کی گیان دھیان میں مگن اور آسمانی اسرار سے واقف آنکھیں اس پر گڑی ہیں۔ اس کے مقدس لبوں کو جنبش ہو رہی ہے عین اسی وقت ایک تاریک ابر نے چاند کے منہ پر نقاب ڈال دی۔

فاروق پھر آگے بڑھا اب اس کی حالت پُرسکون تھی۔ اور وہ ہماری موجودگی سے آگاہ ہو چکا تھا۔ زینے پر چڑھ کر اب وہ محلات کی طرف بڑھا۔ محلات تک پہنچ کر وہ زمین دوز تہہ خانے میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس تہہ خانے میں داخل ہوتے ہی وہی پراسرار سایا سامنے کی دیوار پر نمودار ہوگیا۔ مگر اب وہ فاروق کے سائے کے قریب نہ تھا بلکہ ذرا فاصلے پر تھا۔ سایا اس انداز سے متحرک تھا جیسے فاروق کی کوششوں پر جوش و مسرت سے کانپ رہا ہو۔ فاروق اگنی کنڈ کے قریب جا رکا۔ ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں آپ لوگوں کو اس مقدس اگنی کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ مجھے بتاؤ میں کس کا بیٹا ہوں۔"

سنسان رات کے وحشت ناک سناٹے اور خوفناک تہہ خانے کی پُر ہول فضا میں کئی صدیوں کی ایک ننھی روح اپنا سیاہ فوٹو سامنے والی دھندلی دیوار پر کھینچ رہی تھی، ہم اس واقعہ کو نہ چھپا سکے اگر ہم غلط بیانی سے کام لیتے تو شاید یہ عکس ہم پر جھپٹ پڑتا۔ محرابوں میں سے ستونوں کے بھدے سائے کہنہ دیواروں پر اس طرح پڑنے لگے جیسے آہنی کڑوں کے ساتھ انسانی دھڑ لٹک رہے ہوں۔ ہم نے کانپتے ہوئے اس کے قبر سے برآمد ہونے کے علاوہ پرانی تحریروں کے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا۔ جو وہ نہایت متانت سے سنتا رہا۔ جب ہم یہ ذکر کر چکے تو وہ چوکنا ہو کر کہنے لگا۔

"آپ نے بھی کچھ سنا۔" ہم نے تو نفی میں جواب دیا مگر خان بابا تھراتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں نے سنا ہے۔ ابھی یہ بات اس کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ یکایک ایک دل ہلا دینے والی ڈراؤنی آواز سنائی دی۔ ہمارا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُف خدا کی پناہ! یہ آواز ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی جو ایک تاریک کونے سے سنائی دے رہی تھی۔ میری روح کھنچ کر آنکھوں میں آگئی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اس کونے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ البتہ وہ دلخراش کھڑکھڑاہٹ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بدستور سنائی دیتی رہی۔ فاروق بالکل بے خوف وہراس اس دیوار سے

کان لگا کر اس آواز کو سن رہا تھا۔ آخر کار اس نے کہا ضرور اس جگہ کہیں میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں۔"

دیوار کے پیچھے ٹھوس پہاڑ تھا۔ اس نے دریچہ نما ڈیوڑھی کی طرف جو دیوار کا تھوڑا سا حصہ خالی تھا جا کر دیکھنا شروع کیا۔ اس کی جگہ برقی روشنی صاف طور پر نہ پڑتی تھی۔ اس لیے بہت دقت پیش آئی۔ آخر بڑی مشکل سے اسے دیوار میں ایک چھوٹے سے دروازے کی ڈاٹ نظر آئی جو بعد میں پتھروں سے چن دی گئی تھی۔ اس ڈاٹ کا درمیانی حصہ بجا کر دیکھنے سے کھوکھلا معلوم ہوتا تھا۔

فاروق نے خان بابا کی مدد سے پتھریلی دیوار کھودنا شروع کی اور گھنٹا بھر کی لگاتار کوشش سے ایک پتھریلی اینٹ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد وہ اس سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اینٹوں کو زور سے زور سے اکھاڑنے لگا اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ یہاں کسی زمانے میں ایک الماری بنی ہوئی تھی جس کے دروازہ ڈیوڑھی میں تھا۔ جب دیوار میں کافی سوراخ ہو گیا تو ہم بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگے اور مسلسل محنت کے بعد ہم نے وہ ڈاٹ پوری کھول کے رکھ دی۔

یہ ایک الماری کا خانہ تھا جس میں انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ فاروق اس ڈھانچے کے قریب دوزانو بیٹھ کر دعا کرنے لگا۔ ہم بھی اس کے ساتھ دعا میں شامل تھے۔ گویا یہ ایک بدنصیب تاجدار کی نمازِ جنازہ تھی۔ جو تین صدیوں کے بعد چار آدمیوں نے پاتال کی گہرائیوں میں نہایت بے سروسامانی سے ادا کی۔ دعا کے بعد وہ ہڈیوں کو بوسہ دے کر اٹھا اور گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔

"اب ان مقدس ہڈیوں کو یہاں سے کس طرح لے جائیں۔" خان بابا نے اپنا کمبل زمین پر پھیلا دیا جس میں سب ہڈیاں اکٹھی کر کے باندھ لی گئیں۔

ہم تہہ خانے سے نکل کر بسرعت تمام نیچے صدر دروازے کے قریب پہنچ گئے بوڑھا چوکیدار ابھی تک اسی طرح سایوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم چپ چاپ باہر نکل آئے۔

..........☆☆..........

اس واقعہ کے بعد دوسرے دن ہم پھر ایک دفعہ وہاں آئے کیونکہ اس فقیر کی مدد سے ان ہڈیوں کو وہاں سے ٹھکانے لگانا آسان تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

رات کے وقت جب کہ آسمان تاریک بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں سے محو آرام شاہی خاندان کی روحیں اپنے ایک فرد کی آمد کے انتظار میں چشم شوق وا کیے پرانی قبروں سے جھانک رہی ہیں۔

ہم ان ہڈیوں کو کفن میں باندھ کر وہاں لے گئے۔ بوڑھا فقیر اور خان بابا ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے قبرستان میں گڑھا کھود رکھا تھا، جہاں اس گمنام تاجدار کی پامال شدہ ہڈیوں کو دبا دیا گیا۔

فاروق نے اپنی ماں کی شکستہ قبر بھی دیکھی۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ بہت آزردہ ہوا۔ میں نے فوراً اس کی مرمت کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن شام تک مرمت ہو گئی۔

شام کے قریب ہم اسے واپس لائے تو فاروق بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے سلا دیا گیا مگر آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو فاروق بستر پر موجود نہ تھا۔ میں نے بدحواسی سے عثمان اور خان بابا کو جگایا اور اس کی تلاش شروع کی۔

رات سخت اندھیری تھی۔ آندھی کا غبار ہمارا راستہ روکنے کے درپے تھا اور درخت غیظ وغضب سے دوہرے ہو کر ہمیں پکڑنے کو دوڑ رہے تھے۔ ہم اس کی تلاش میں قبرستان کی طرف روانہ تھے۔ صبح تک ہم سرگرداں رہے۔

صبح کے وقت ایک جھاڑی کے قریب ہمیں فاروق کے پاؤں کا ایک بوٹ پڑا ملا۔ بوٹ کو دیکھ کر اس ہمیں کچھ تسلی ہوئی۔ خان بابا کہنے لگا۔

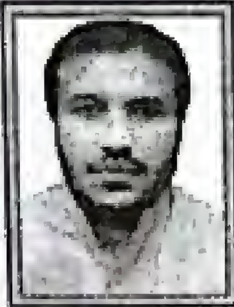
"وہ کہیں قریب دجوار میں ہی ہوگا اور ضرور اپنی ماں کی قبر پر آئے گا۔ یہاں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔"

اس کی ماں کی قبر دیکھ کر ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ اس نئی بنی ہوئی قبر کے عین درمیان ایک لمبی لکیر نمودار ہو رہی تھی گویا معلوم ہوتا تھا کہ قبر شق ہو کر دوبارہ مل رہی ہے۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ یکا یک میری نظر ایک عجیب چیز پر پڑی۔ انتہائی رنج وغم سے میری چیخیں نکل گئیں۔ سرہانے کے قریب قبر کی لکیر نما درز سے فاروق کے کوٹ کا کونا باہر لٹک رہا تھا۔

☆☆☆



وہ کہانی......



صفدر علی حیدری

پُراسرار کہانیاں لکھنے والے اُس مصنف کی اسرار بھری داستان، جسے ایک دن کہانی نے خود ہی ڈھونڈ لیا تھا





جون کی چلچلاتی دھوپ، دن گیارہ بجے کا وقت، سورج سوا نیزے پر، پیاس کی شدت سے بے جان جسم، آنا جانا راستہ، اور گم کردہ راہ کا مسافر ایسے عالم میں انجن کی آواز کیا ڈوبی گویا دل ہی ڈوب کر رہ گیا۔ یہ وہ آخری چیز تھی جو میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ آج صبح کس منحوس کی شکل دیکھی تھی کہ عموماً انسان سب سے پہلے اپنی صورت دیکھنے کا شرف حاصل کرتا ہے یہ الزام دن پر بھی دھرا نہیں جا سکتا کہ دن سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں، ہم ہی کسی کو مبارک اور کسی کو منحوس کہہ دیا کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں یہی خدشہ سر ابھار رہا تھا کہ اگر بائیک کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ لیکن ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔

میں بائیک سے اتر آیا اور بے چارگی کے عالم میں ارد گرد نگاہ دوڑائی حد نظر تک پھیلا ہوا بے آب و گیاہ علاقہ، بنجر اور جھاڑی زدہ میدان خودرو پودوں کی بہتات اور ریت کے بڑے ٹیلے۔ سڑک کے دونوں کناروں کو جنھوں نے کافی حد تک اپنے نیچے دبا لیا تھا۔ لگتا تھا وہ پوری سڑک نگل لینے پر آمادہ ہوں۔ یہ سولنگ بھی کسی نعمت سے کم نہ تھی جس پر سفر کرتے ہوئے یہاں تک آن پہنچا تھا۔ میری آنکھوں میں بے بسی اتر آئی۔ ایسے میں میری مدد کو بھی آتا تو کون؟ اب تو وہ ایک موہوم سی آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔

اس سارے عرصے میں مجھے ایک آدمی ملا تھا۔ جس کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھتے ہوئے زرخیز زمینوں کو بتدریج پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ کافی آگے نکلنے کے بعد جب علاقے کی ہیئت بدلی دیکھی تو دل ہی دل میں چونک اٹھا۔ راستہ بھول جانے کا خیال رہ رہ کر آنے لگا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور اس سے پہلے کچھ اور سوچتا بائیک نے جواب دے دیا۔ پیٹرول کا ختم ہو جانا کسی بڑی مصیبت سے ہرگز کم نہ تھا۔

''کاش پہلے ہی واپس پلٹ گیا ہوتا......'' لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ پیچھے ہٹنا اور آگے بڑھنا ایک برابر تھا۔ یہی سوچتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتا رہا تھا۔ اتنا آگے آ گیا تھا کہ واپسی کا خیال ہی دل دہلانے لگتا تھا۔

عجیب منظر تھا کچھ دیر قبل بائیک مجھے اٹھائے پھرتی تھی اور اب......

اب میں اسے کھینچے ان جانی راہوں پر گامزن تھا۔ پڑھنے والے اس کیفیت سے لطف لے رہوں گے۔ مگر میرا حال پتلا ہو گیا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اپنے وجود اور بائیک کو سنبھالے آگے کی سمت سفر کرتا رہا۔ اور

ایک ڈیڑھ کلومیٹر ہی فاصلہ طے کر پایا ہوں گا کہ برداشت جواب دے گئی اور حالت غیر ہونے لگی۔ میں نے بائیک پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور خود آگے بڑھ گیا۔ بائیک ایک دھماکے کے ساتھ ایک سولنگ کی جانب گر گئی۔ مجھے اس کی پرواہ ہی کب تھی؟ میں نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ہاتھوں نے یقیناً شکر کا کلمہ پڑھا ہوگا۔ سانس تیز چل رہی تھی اور کپڑے تو گویا جسم سے چپک کر رہ گئے تھے۔ میں سایہ دار جگہ کی تلاش میں تھا۔ جس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ مجبوراً دھوپ میں ہی رک کر سانس بحال کرنے لگا۔ اوسان کچھ بحال ہوئے تو



میں نے ایک بار پھر ارد گرد نگاہ دوڑائی...... اور پھر بے ساختہ اچھل پڑا۔

"ارے یہ کیا ہے۔" میرے منہ سے یہ الفاظ بے ساختہ نکلے تھے۔ مجھے ایسے منظر کی توقع شاید خواب میں بھی نہ تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں کسی سحرزدہ شخص کی طرح اس کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

میں ایک قلم کار ہوں۔ کہانیاں لکھنا میرا شوق ہے۔ جو واقعہ آج آپ کو سنانے لگا ہوں دس بارہ سال پہلے کا ہے۔ ان دنوں میں نے نیا نیا اس پُر خار وادی میں قدم رکھا تھا۔ رسالے والے کم ہی لفٹ کراتے تھے۔ کئی کئی ماہ کے حوصلہ شکن انتظار کے بعد کوئی ایک آدھ چھوٹی موٹی تحریر لگا کر احسان کر دیا کرتے تھے۔ انہی دنوں "پُراسرار کہانیوں" کا رواج سا چل پڑا۔ ہر رسالہ سال میں کئی ایک پراسرار نمبر لگانے لگا تھا۔ جس رسالے میں، میں لکھا کرتا تھا۔ انہوں نے بھی اوپر تلے کئی خاص نمبر لگائے۔ رسالے میں جگہ پانے کے لیے میں نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے گھر کے بڑے بوڑھوں کی سنائی ہوئی کئی ایک کہانیاں لکھ کر اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ انہیں نہ صرف خاص نمبر میں جگہ ملی بلکہ پذیرائی بھی ہاتھ آئی۔ میں اپنی اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔

پھر ایک دن ایڈیٹر صاحب کا خط ملا تو اسے پڑھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ خط واقعی مجھے لکھا گیا ہے۔ بار بار خط پڑھا اور بے یقینی سے اپنا نام دیکھا۔ ایڈیٹر صاحب نے تعریفی کلمات کے بعد مجھے آئندہ خاص نمبر کے لیے پراسرار کہانی لکھنے کی بطور خاص فرمائش کی تھی۔ کئی دن اسی خوشی میں گزر گئے۔ پھر ایک دن حسب فرمائش کہانی لکھنے کے لیے کاغذ قلم تھام کر بیٹھا تو یوں لگا مجھے جیسے سرے سے لکھنا ہی نہیں آتا۔ جو قصے کہانیاں سن رکھی تھیں۔ وہ پہلے ہی لکھ بھجوا چکا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ کہانی بھجوانے کی آخری تاریخ میں چند دن کا فاصلہ تھا۔ سوچ سوچ کر برا حال ہو گیا۔ لیکن مسئلہ جوں کا توں تھا۔

بالآخر میں نے من گھڑت کہانی لکھنے کا پلان بنا لیا۔ ویسے آپس کی بات ہے۔ میں جنوں بھوتوں کی کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا کبھی شائق نہیں رہا۔ رسالے میں جگہ بنانے کی مجبوری نہ ہوتی تو ایک کہانی بھی تحریر نہ کرتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میری شناخت ایک پر اسرار کہانیوں کے ماہر لکھاریوں کے طور پر بن رہی تھی۔ اور رسالوں میں جگہ پانے کی پرانی خواہش بڑی مشکل سے حقیقت کے روپ میں ڈھل رہی تھی۔ سو مجھے کچھ نہ کچھ تو آخر کرنا ہی تھا۔

چند دن اور گزر گئے بات پھر بھی نہ بنی۔ آخر اتوار کے دن میں نے گھر سے نکل کر تفریحی مقام پر جانے اور کہانی لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہر کے مضافات میں ایک خوبصورت باغ کا تذکرہ اکثر سنا کرتا تھا لیکن اس طرف جانے کا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا۔ سو اسی طرف جانے کی ٹھان لی۔

ایک دوست سے راستہ پوچھا۔ جیب میں کاغذوں کا پلندا ٹھونسا، بائیک پر سوار ہوا۔ اور یہ جا وہ جا......

☆......☆......☆

کوئی آدھے گھنٹے بعد بائیک روک کر پریشان کھڑا تھا۔ سنگل روڈ پر ایک درخت کچھ یوں گرا ہوا تھا کہ آگے بڑھنے کا راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔ درخت کا تنا تھا بھی خاصا موٹا ورنہ اس کے اوپر سے بائیک گزارنے کی کوشش کرتا۔ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کیا کروں کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

کوئی مقامی آدمی تھا، شاید اس نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کر دی کہ بائیں جانب جانے والی ایک سرنگ کے ذریعے لمبا چکر کاٹ کر میں پھر اس روڈ پر آ سکتا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ جب کافی آگے جانے کے بعد بھی سرنگ روڈ کی جانب جاتی دکھائی نہ دی تو میں پریشان ہو گیا۔ راستہ دیکھا بھالا ہوا ہوتا تو یہ بھی پریشانی نہ ہوتی ایسے میں پھر ایک فرشتے نے میری مدد کی۔ اس نے بتایا کہ اس طرف بارہ منٹ بعد یہ سرنگ روڈ سے جا ملے گی میں نے بائیک کو دوبارہ اسٹارٹ کیا اور پھر چل دیا

جوں جوں آگے بڑھا راستہ سنسان اور ویران ہوتا چلا گیا ۔اور پھر وہی کچھ ہوا جو پہلے بیان کر چکا ہوں۔

☆......☆......☆

میں سحر زدہ سا اس حویلی کی جانب بڑھتا چلا گیا جس کا وجود میرے لیے کسی معجزے سے ہرگز کم نہیں تھا۔ وہ پرانی سی سالخوردہ حویلی، چالیس قدم کے فاصلے پر سڑک کے دائیں جانب ایستادہ تھی۔ جانے آسمان سے اتری تھی یا زمین نے اگلی تھی۔ اس کا بڑا سا چوبی گیٹ پورا کھلا ہوا تھا۔ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برسوں کا بچھڑا کوئی عزیز دوست بانہیں کھولے میرے استقبال کے لیے کھڑا ہو۔ میں بے خطر گیٹ کی جانب بڑھ گیا حویلی میں داخل ہوتے ہی جو پہلا تاثر میرے ذہن میں ابھرا وہ یہی تھا کہ حویلی میں کوئی ذی روح نہیں بستا۔ شاید برسوں سے کسی آدم زاد نے اس میں قدم نہیں دھرے تھے صحن کے عین درمیان ایک فوارہ جو برسوں کا خشک پڑا تھا، صحن میں جھاڑ جھنکار، خشک پتے بکھرے ہوئے، کونے میں نیم کا ایک پرانا درخت، لان کے عین پیچھے ایک ہی قطار میں کندھے سے کندھا ملائے ہوئے بڑے بڑے کمرے، جن کے آگے ایک طویل برآمدہ اور عین درمیان میں برآمدے سے ذرا آگے ایک گول سا چبوترا، جس کے اوپر چھت بنی ہوئی تھی۔

میں نے ایک ہی نظر میں حویلی کا جائزہ لے لیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں یہاں پہلی بار نہیں آیا...... دل پر عجیب سی کیفیت طاری تھی جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ کمرے پلستر کیے ہوئے تھے۔ لیکن پینٹ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ سوکھے گھاس والے لان کو عبور کرتے ہوئے میں چبوترے میں جا پہنچا۔ گول سیڑھی (جس نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا) پر سے ہوتا ہوا میں چبوترے کے سایہ دار حصے میں جا کر رک گیا۔ پختہ اینٹوں سے بنے فرش پر بیٹھتے ہوئے مجھے دیر نہ لگی۔ ایک ستون سے ٹیک لگایا تو دل میں سکون کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ بالآخر میں نے دھوپ سے چھٹکارا پالیا تھا مجھے یہ ہوش ہی نہ رہا کہ مکان گھوم پھر کر دیکھوں۔ تھکا ہوا مسافر گوشہ عافیت پا کر سکون محسوس کر رہا تھا۔

کئی لمحے اسی کیفیت میں گزر گئے۔ مجھ پر غنودگی سے طاری ہونے لگی اور میری آنکھیں بے اختیار بند ہوتی چلی گئیں۔

☆......☆......☆

نا جانے کتنے لمحے بیت گئے۔ میں نے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اب جھنجھلاہٹ اور اکتاہٹ بھی جاتی رہی تھی۔ مجھے سکون کی طلب تھی، دماغ کو آزاد چھوڑا تو بے طرح قرار آیا۔ کافی دیر بعد جب تھکن دور ہوئی اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تو میں نے سر جھٹکتے ہوئے ذہن کو بیدار کیا اور جیب سے کاغذ نکال کر لکھنے کا ارادہ کیا۔ آخر کہانی بھی تو لکھنی تھی۔ پہلے ہی بھول بھلیوں میں آدھا دن گزر گیا تھا۔ باغ نہ سہی اور ویران حویلی ہی سہی۔ لیکن لکھوں بھی تو کیا لکھوں؟؟؟ یہ سوال تا حال اپنی جگہ برقرار تھا۔

کیوں نا اس ویران حویلی پر ہی کہانی لکھ ڈالوں۔“ یہ خیال آتے ہی میں اچھل پڑا۔

”ایک دن میں اپنے ایک دوست کو ملنے اس کے گاؤں گیا تو راستہ بھول کر ایک ویران حویلی میں جا نکلا۔ حویلی سنسان پڑی تھی۔ اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر ستا رہا تھا کہ مجھے اچانک ایک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔

”کیا آپ میری کہانی لکھیں گے؟“ تصور کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا اس مقام پر پہنچا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اور میں بے اختیار پاگلوں کی طرح ہنستا اور دہرا ہوتا چلا گیا۔ اپنی بے وقوفی پر اس قدر ہنسا کہ آنکھوں کے کنارے نمی سے بھیگ گئے۔ میری ہنسی ابھی رکنے بھی نا پائی تھی کہ ایک اور ہنسی میری ہنسی میں شامل ہوگئی۔ یہ ایک بھرپور نسوانی ہنسی تھی میں اچھل پڑا اور میری ہنسی کو بے ساختہ بریک سی لگ گئی۔

”یا اللہ کیا میرے کان بج رہے ہیں؟...... یا...... میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں۔“ میں حیرت زدہ سا اس نئی صورت حال پر غور کرنے لگا۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ ابھی میری نظریں بھٹک ہی رہی تھیں کہ اس نسوانی آواز نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

” تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ کوئی ناممکن بات ہے؟“ آواز بالکل واضح تھی میں نے آواز کی سمت دیکھا

تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

سفید کرنوں جیسا لباس زیب تن کیے وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور دکھائی دے رہی تھی۔ سب سے نمایاں چیز اس کا چہرہ تھا جس پر سجی روشن آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔

''کیا آج تک کوئی انسان نہیں دیکھا؟'' وہ ہنستے ہوئے گویا ہوئی تو مجھے جھٹکا سا لگا اور میری محویت کا بت پاش پاش ہو گیا۔ میں نے شرمندہ ہو کر نگاہیں جھکا لیں۔

''تو آخر کہانی نے خود تمہیں ڈھونڈ ہی نکالا۔''

اس کا لہجہ اتنا دلکش تھا کہ سماعتوں میں گویا رس سا ٹپکنے لگا۔ وہ خود بھی کیا کم دلکش تھی۔ میں اس کے ٹرانس میں آتا چلا گیا یوں لگتا تھا جیسے میں چپکے سے ماضی کے کسی عہد میں جا پہنچا ہوں۔ حواس پر صرف وہی چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے ماحول سے لاتعلق ہو گیا۔ اب صرف وہ ہی وہ تھی اور بس۔

☆......☆......☆

''میرا تعلق سندھ کے ایک گاؤں سے ہے۔ میرے گوٹھ کے قریب بڑا شہر حیدر آباد ہے۔ اتفاق کی بات دیکھیں کہ میں نے حیدر آباد اپنی زندگی میں صرف ایک بار دیکھا اور وہ بھی تب جب میں اپنے محبوب کے ساتھ رات کی تاریکی میں اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل آئی تھی۔ میرا کوئی بھائی نہ تھا، مجھ سے بڑی پانچ بہنیں تھیں میرے ہوش سنبھالتے، جوان ہوتے وہ بھی اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ میں ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ حیرت ہے وہ دونوں بیٹیوں پر جان دیتے تھے میں نے گھر میں کبھی ''بیٹے'' کے حوالے سے کوئی لڑائی ہوتے نہیں دیکھی ہمارے ہاں بھائیوں کا درجہ بہت بڑا ہوتا ہے لوگ بیٹے کی چاہ میں کئی کئی شادیاں رچاتے ہیں لیکن میرے باپ نے ایسا کچھ نہ کیا۔ شاید وہ میری ماں سے بے انتہا پیار کرتا تھا اب گھر میں میں اکیلی تھی تو میرا راج تھا۔ دونوں مجھے دیکھ کر جیتے تھے۔ میں اپنی دنیا میں مگن تھی کہ ایک دن میری ماں میری شادی کے خواب آنکھوں میں سجائے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ دنیا نے اپنی اصلیت دکھا دی۔ اس کی بد صورتی مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلاتی۔ جب جب ماں کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا آنسو بے ساختہ در آتے۔

چند دن تک سب نے ساتھ دیا پھر آس پڑوس کے لوگ بھی اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے اور تو اور میری بہنیں بھی چالیسویں کے بعد گھر کا راستہ بھول گئیں۔ آس پاس کے دیہاتوں میں ان کی شادیاں ہوئی تھیں ان کے بچے تھے اور ان کے گھر کی ذمہ داریاں، الگ، سو اپنی اپنی دنیا میں محو ہو گئیں۔

میرا باپ بیمار پڑ گیا۔ ہم دونوں بات بے بات اسے یاد کرتے اور آہیں بھرتے۔ بابا کی بیماری طول پکڑتی گئی۔ وہ بستر سے لگ گیا ہر وقت پڑا کھانستا رہتا ماں کی موت کا روگ اسے لے ڈوبا تھا۔

میرا رشتہ میرے ماموں کے ہاتھوں کب کا طے ہو چکا تھا۔ وہاں سے شادی کا تقاضا زور پکڑتا جا رہا تھا۔ لیکن نا جانے بابا کس سوچ میں تھے۔ جب جب وہ لوگ شادی کی تاریخ لینے آتے۔ وہ سر جھکا لیا کرتا اور کوئی جواب نہ دیتا۔ جانے کون سی بات اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ ایک دن رہا نہ گیا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

پھر بابا نے جو کہا اسے سن کر مجھ یوں لگا جیسے میری ماں آج اس دنیا سے رخصت ہوئی ہو۔ زخم پھر سے ہرا ہو گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرا رشتہ گھر والوں کی پسند کا نتیجا ہے لیکن میرا نام میرے منگیتر سے جڑے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ اس سے الگ ہونے کا تصور بھی مجھے اب محال لگتا تھا۔ لیکن مجبوری اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔

گاؤں کے سردار بیٹے کو اپنے نوجوانی کے لیے ایک خوبصورت اور جوان جسم کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے اس کی نظر انتخاب مجھ پر آن رکی۔

میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی لاڈلی تو تھی سو ڈٹ گئی۔ منہ سے کچھ نہ کہا لیکن غصے میں وہاں سے اٹھ گئی۔ کبھی کبھی میرا ماموں زاد سجان ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ ہمارے ہاں چونکہ پردے کا رواج ہے سو میں بھی اس سے پردہ کیا کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی نگاہیں نگاہوں کو ڈھونڈ ہی لیا کرتی ہیں۔ میں نے یہ بات اس تک پہنچائی تو وہ بھی غصے سے اکڑ گیا۔

اسے میری قلبی وابستگی کا خوب اندازہ تھا۔ اس نے نہ جانے مجھ پر کیا پڑھ کر پھونکا کہ میں اس کے ساتھ گھر

سے بھاگنے پر آمادہ ہوگئی۔
ضد اور کچی عمر سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ علاقے کے رسم و رواج بھی مجھے بغاوت سے روک نہ پائے۔ مجھے کاری ہونا منظور تھا، باندی ہونا ہرگز نہیں۔ پھر ایک رات میں نے گھر سے اپنے کپڑے اور زیورات اٹھائے اور سجاول کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی۔ راتوں رات ہم نے کئی ایک گاؤں پیچھے چھوڑ دیے۔ وہ نا جانے کس سے گھوڑا مانگ کر لے آیا تھا، جس نے ہماری مدد کی ورنہ ہمارا پکڑا جانا یقینی ہو جاتا۔
صبح ہونے سے پہلے پہلے ایک مسجد کے مولوی صاحب نے میرا نکاح پڑھا دیا۔ یہ بات ہمارے درمیان پہلے طے ہو چکی تھی کہ دن نکلنے سے قبل ہم نکاح کرلیں گے۔ سجاول نے بعد میں بتایا کہ اس نے پہلے ہی سے مولوی صاحب کو اس کام کے لیے آمادہ کرلیا تھا۔
ایک رات اور پورا دن ہم مولوی صاحب کے گھر میں رہے۔ مولوی صاحب کی بیوی بڑی اچھی عورت تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور دعاؤں میں رخصت کیا۔ رات ہی کو ہم حیدرآباد جا پہنچے۔
مضافاتی علاقے میں ہی سجاول نے گھوڑا ایک جگہ پر چھوڑ دیا۔ باقی کا سفر ہم نے پیدل طے کیا۔ راتوں رات ہی صادق آباد جانے والی بس پکڑ کر اس میں سوار ہوگئے۔
میں نے ٹوپی والا برقعہ پہن رکھا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سجاول نے خود کو چادر میں چھپا رکھا تھا۔ ہم بخیریت صادق آباد جا پہنچے۔ وہاں ایک ہوٹل میں دو دن رکے رہے۔
سجاول کے کہنے پر ہم نے ڈیرہ غازی خان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ صادق آباد چونکہ سندھ کے ساتھ واقع ہے اور پکڑے جانے کا خطرہ زیادہ تھا۔ سو ہم اس سے دور ہونے میں ہی اپنی عافیت جان رہے تھے۔
ڈیرہ غازی خان میں ہم نے عدالت کے ذریعے نکاح کا کاغذ حاصل کیا۔ دو تین دن ہوٹل میں رہنے کے بعد ہمارا خوف کم نہ ہوا تھا۔ قدم قدم اور سانس سانس پر دل کی دھڑکن میں تیزی در آتی تھی۔ ہمیں کسی دیہی علاقے کی تلاش تھی۔ جہاں ہم با آسانی روپوش رہ سکتے تھے۔ ایک دن پھرتے پھراتے اس حویلی میں آ نکلے یہ ویران اور سنسان حویلی ہمیں بہت پسند آئی، لگتا تھا خدا نے غیب سے ہمارے لیے مدد بھیجی تھی۔
سجاول کچھ کچھ گھبرایا ہوا تھا لیکن میں پوری طرح مطمئن تھی۔ میں نے ناظرہ قرآن مجید پڑھ رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ حویلی بھاری ہوئی بھی تو ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔
چند دن جنات نے خاصا تنگ کیا لیکن میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ آذانیں دیں، سورۃ بقرہ پڑھ کر حویلی کے ہر کونے میں پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ جنات کی حرکتیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ اب میں پُرسکون تھی اور سجاول بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ کئی ماہ کا راشن لے آیا تھا۔ سو ہم نے کئی ماہ روپوشی کے عالم میں گزار دیے۔ یہ حویلی ہماری کل کائنات تھی۔ باہر کی دنیا سے ہم لاتعلق تھے۔ دو پریمی پیار میں گم تھے اور وقت دھیرے دھیرے سرکتا چلا جا رہا تھا۔
پھر ایک دن ایک آدمی حویلی میں آن دھمکا۔ اس ادھیڑ عمر آدمی کو دیکھ کر نا جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے ہماری جنت میں کوئی سانپ گھس آیا ہو۔ لگتا تھا اس کا آنا کوئی نہ کوئی تباہی ضرور لائے گا۔
میں نے سجاول سے اس خدشے کا اظہار کیا تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ پہلی ہی نظر میں وہ کوئی ہندو جوگی لگا۔
اس نے جانے کیا جادو کیا کہ میرا شوہر اس کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ ایک ساتھ وقت گزارنے لگے تھے۔ حویلی کے ایک کونے میں بیٹھے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے۔ میری بے چینی کسی طور کم ہونے میں نہ تھی۔ میں عورت تھی جو مرد کی نظریں با آسانی پہچان لیتی ہے۔ میں نے اس کی بے قرار آنکھوں میں ہوس کی مکروہ چمک دیکھ لی تھی۔ لیکن سجاول کو نا جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے ہر خدشے کو ہنسی میں اڑانے لگا تھا۔
ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ وہ ایک عمل کے لیے تین دن مصروف رہے گا اور گھر بھی نہیں آئے گا۔‘‘
میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ میرا وہم حقیقت بن کر منہ چڑا رہا تھا۔ اس مردود کی باتوں میں آ کر وہ کالے جادو سیکھنے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ ایسے میں میری باتیں بھلا اس پر کیا اثر

کرتیں۔اس پر تو کسی اور کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور پھر میری ہر کوشش بے کار گئی۔وہ تین دن کے لیے رخصت ہو گیا۔

کاش میں اسے کسی طور روک پاتی۔بے بسی سے میری آنکھیں چھلک پڑیں۔جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے میں اسے آخری بار دیکھ رہی ہوں۔وہ لوٹ کر آئے گا تو سب کچھ ویسا نہیں رہے گا۔جیسا وہ چھوڑ کے جا رہا تھا۔جاتے جاتے اس نے بڑے یقین سے کہا۔

''اب اس عمل کے بعد دنیا کی کوئی طاقت ہمیں دور نہیں کر پائے گی۔خوف کا دور ختم ہوا۔اب لوگ ہم سے ڈریں گے اور ہم اس جنت میں سکون کی نیند سوئیں گے۔''

پہلی رات سکون سے گزری تو میرا وہم کچھ کم ہوا لیکن دل کی گہرائیوں میں چھپا خوف کسی پل چین نہ لینے دیتا تھا۔میں نے گھر کے کاموں میں خود کو مصروف کر لیا آخر پہاڑ جیسا وقت بھی تو کسی بہانے کاٹنا ہی تھا۔سچ ہے مصیبت میں وقت کٹتا نہیں، کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

دوسرے دن عصر کے وقت وہ جوگی حویلی آن پہنچا۔میں نے اسے چارپائی پر بٹھایا اور روٹی لانے کے لیے واپس مڑ گئی دل کی دھڑکن وجود میں زلزلہ پیدا کر رہی تھی خود کو نارمل رکھنے کے لیے مجھے بڑی دشواری پیش آ رہی تھی میں سپاٹ چہرہ لیے کھانا اٹھا کر اس کی جانب بڑھ گئی۔دل کی دھڑکنیں کنپٹی پر ٹھوکریں مار رہی تھیں میں جے جے قدم اٹھائے اس کے سامنے جا پہنچی۔کوشش کے باوجود میرے ہاتھ کپکپا اٹھے۔

جانے کیا تھا اس کی آنکھوں میں کہ یک بارگی میرا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔کھانا رکھ کر جانے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔میں سمجھ گئی قیامت کی گھڑی آن پہنچی ہے۔میں نے ہاتھ چھڑایا اور اس سے دور ہو گئی۔

واپس مڑی تو میرے ہاتھ میں چھری تھی۔چھری دیکھ کر بجائے گھبرانے کے وہ قہقہہ لگانے لگا۔اس کو میری حرکت بڑی بچکانہ سی لگی تھی شاید۔پھر اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہو اور میرے وجود پر فالج گر گیا ہو۔میں نے خدا کو یاد کرتے ہوئے چھری بلند کی اور پوری قوت سے اپنے پیٹ میں دے ماری۔

میرے منہ سے چیخ اور پیٹ سے خون کا فوارہ ایک ساتھ نکلا۔میں نے جان پر کھیل کر اسے ناکام کر دیا تھا۔

اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہو۔آخری سانس لیتے ہوئے مجھ پر ایسا سکون طاری تھا جو ناقابل بیان ہے۔

میرے مرنے کے بعد سجاول غم و غصے میں پاگل ہو گیا۔وہ پاگلوں کی طرح آج بھی جوگی کو اور مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔نہ میں اس کے ہاتھ آتی ہوں نہ جوگی۔''

☆......☆......☆

''کہو کیسی لگی؟'' اس کی آواز نے مجھے ہوش کی وادی میں لا پھینکا۔

''بڑی المناک داستان ہے۔مجھے اس کے ایک ایک حرف پر پورا یقین ہے۔'' میں نے سر جھٹکتے ہوئے دکھی ہو کر کہا۔

''میں نے کہانی کا نہیں پوچھا۔میں تو اس ملاقات کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔میری داستاں پر تمہیں کیوں یقین نہیں آئے گا۔میری کہانی تمہارے لیے نئی تھوڑی ہے۔تم تو بہت پہلے سے اس کے بارے میں جانتے ہو۔'' اس کا لہجہ بڑا پُراسرار سا لگا اور میں سچ میں اچھل پڑا میرے تصور کی دنیا روشن دن کی طرح مجھ پر واضح ہوتی چلی گئی۔

اب پتا چلا کہ مجھے عجیب طرح کی بے چینی کیوں محسوس ہو رہی تھی۔کیوں یہ لگ رہا تھا کہ میرے لیے نئی نہیں ہے۔

''اُف میرے خدا! یہ کہانی تو مختلف ٹکڑوں میں برسوں سے میں خواب میں دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔''

یعنی کہ تم وہی ہو......تم وہی ہو......میرے خوابوں میں بار بار آنے والی۔وہی لڑکی جس کی داستان، درجنوں بار میرے تصور پر دستک دیا کرتی تھی۔میرے خوابوں میں در آتی تھی۔

میں نے اٹک اٹک کر جملے مکمل کیے تو اس نے مسکرا کر اس بات کی تاکید کی۔

''تو کیا میں خوابوں کے جہاں میں جا پہنچا ہوں۔وہ

بھی جاگتے ہوئے یا...... یا میرا تصور ایک تصویر بن کر میرے سامنے تھا مختلف خیالات میرے ذہن میں چکرانے لگے تھے۔ لیکن میں بظاہر آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کیے ہوئے ہمہ تن گوش تھا۔

''تمہیں کہانی کی تلاش تھی۔ اور مجھے ایک کہانی کار کی...... ہم دونوں کی ضرورت ایک دوسرے کے وجود سے جڑی ہوئی تھی۔ میں خود یہ چاہتی تھی کہ میری کہانی دنیا کے سامنے آئے میں بتانا چاہتی تھی کہ گھر سے نکل بھاگ جانے والی لڑکیوں کے ساتھ زمانہ کیا سلوک کرتا ہے میں تو پھر بھی خوش نصیب تھی کہ میں نے عزت بچا لی۔ اور پھر خدا نے بھی مجھے معاف کر دیا۔

''میرا یہی عمل میری بخشش کا وسیلہ بن گیا۔''

''اور...... سجاول...... اس کا کیا بنا؟...... اس کی منزل اب کیا ہے......؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں اس کی بھی توبہ قبول ہو گئی ہے۔ اس نے بھی میرے بعد بہت دکھ دیکھے ہیں۔ اس نے دنیا میں رہ کر ہی اپنی سزا پائی۔ بہت جلد وہ میرے قریب ہوگا...... ہو سکتا ہے یہاں سے جاتے ہوئے تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے۔''

''مگر...... میں گھر کیسے جاؤں گا؟ میری بائیک نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ پیٹرول بھی ختم ہو گیا ہے۔'' میں نے بے چارگی سے کہا تو وہ ہنس دی۔

''کچھ نہیں ہوا تمہاری بائیک کو جاؤ تمہاری دنیا تمہاری منتظر ہے۔ میری کہانی ضرور لکھنا...... یہ تم پر قرض ہے......'' اچانک منظر بدل گیا۔

☆......☆......☆

منظر بدلا تو میں نے خود کو دیوار سے ٹیک لگائے آرام کرتے ہوئے پایا۔ کاغذ اور قلم ساتھ ہی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بے یقینی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا مگر کسی ذی روح کا وجود نہ تھا۔ وہ نادیدہ ہستی ایک بار پھر گم ہو چکی تھی۔ میں بے اختیار اٹھا اور گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ گیٹ کے بالکل قریب ہی میری بائیک اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ میں نے کک لگائی تو فوراً اسٹارٹ ہو گئی۔

میں حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ایک مجہول صورت آدمی دور گرا ہوا دکھائی دیا۔ آواز اس کے گرنے کی مجھ تک پہنچی تھی شاید۔ میں بھاگ کر اس کی جانب گیا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اچانک اس نے طویل سانس کی اور اٹک اٹک کر کلمہ طیبہ پڑھنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرے بازوؤں میں دم دے دیا۔

میں اسے پہچان گیا تھا۔ وہ سجاول تھا جس کی شکل میں درجنوں بار خواب میں دیکھ چکا تھا۔ میں اٹھا اور بے اختیار حویلی کی جانب دیکھنے لگا دو۔ نورانی وجود گیٹ کے درمیان کھڑے تھے۔

میری آنکھیں برسنے لگیں۔ دو پری بالا آخر ایک ہو گئے۔ ان دونوں کے چہرے کھلے کھلے تھے۔ آنکھیں بھیگی بھیگی۔

پڑھنے والوں کے لیے کہانی ختم ہوئی۔ لیکن میری کہانی ختم نہ ہوئی نہ تلاش۔ اس واقعے کو دس بارہ برس بیت چکے ہیں۔ میں آج بھی اس حقیقت کی تلاش میں ہوں، آج تک یہ جان نہیں پایا کہ یہ کہانی واقعی ایک حقیقت ہے یا میرے تصور کی کارستانی۔

کیا واقعی کہانی نے مجھے ڈھونڈ نکالا تھا لگتا ہے کہ میں اس سے ملا ضرور تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ درجنوں بار اس علاقے کا سفر کیا ہے۔ کہانی کی تلاش میں مارا مارا پھرا ہوں لیکن کسی حویلی کا وجود تک وہاں نہیں ملا۔ میں نے بارہا مقامی لوگوں سے بھی اس بارے میں بات کی ہے۔ وہ بھی کسی حویلی کی موجودگی کا اصرار نہیں کرتے۔ اتنے برس بعد بھی میری تلاش جاری ہے۔ اور میں اب تک یہ طے نہیں کر پایا یہ خواب ہے یا حقیقت۔

جب جب میں الجھ سا جاتا ہوں تو حویلی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہوں اور ناکام ہو کر لوٹ آتا ہوں کیا خبر اپنی زندگی میں اس کا سراغ پالوں۔ اس کہانی سے مجھے دلی انس سا ہو گیا ہے اور کیوں نا ہو یہ کہانی میری شناخت بن چکی ہے۔ لوگ مجھے اسی کہانی کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔ جب تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا، یہ کہانی میرے ارد گرد زندہ رہے گی...... اور تلاش کا سفر بھی جاری رہے گا، جو تا حال ناکام ہے۔

☆......☆......☆......☆



پازیب، جُھولا اور وہ......



حنا بشریٰ

کبھی کبھی خواب حقیقت کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔ اُس کے پُراسرار خواب بھی یکدم حقیقت میں بدل گئے تھے

اسلم بھائی سے گھر کی چابی لے کر میں اُس پرانے محلے میں چلا آیا، جہاں اب مجھے رہنا تھا۔ جہاں پر بیشتر مکانات پرانی طرز کے تھے۔ وہاں ترقی نے اپنے قدم کچھ خاص نہیں جمائے تھے۔ شاید اس کی وجہ مکینوں کی غربت اور پسماندگی تھی۔

میرا مطلوبہ مکان میری نظروں کے سامنے تھا۔ بڑا سا بوسیدہ گیٹ جس پر کبھی رنگ تھا، مگر زمانے کے پے در پے وار سہتے سہتے اب بے رنگ ہو چکا تھا۔ زنگ آلود تالا بڑی دقتوں کے بعد کھل گیا تھا۔ کیسے کھلا یہ الگ کہانی ہے۔ گیٹ کھول کر میں اندر داخل ہو گیا۔ گھر چونکہ عرصۂ دراز سے خالی تھا تو دیکھ بھال بھی نہ ہوئی تھی۔ اسلم بھائی کے مرحوم کزن جو لاوارث تھے اس لیے یہ مکان اسلم بھائی کو مل گیا۔ مگر اسلم بھائی نے کبھی بھی اُس مکان سے فائدہ نہیں اُٹھایا تھا۔

میری مجبوری کا سن کر اُنہوں نے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے بے حد اصرار کیا کہ وہ کرایہ لے لیں مگر اسلم بھائی بالکل نہ مانے تھے۔

گھر بے حد کشادہ تھا۔ چار بڑے بڑے کمرے جو بے حد ہوادار تھے۔ صفائی کے ساتھ ساتھ مرمت کا کام بھی کروانا تھا۔ کمروں سے آگے بڑا سا برآمدہ تھا۔ جہاں پر بڑا سا جنگلا لگا تھا۔ جنگلا ایک وسیع و عریض باغ میں کھلتا تھا۔ بے حد گھنے درخت، لمبی لمبی گھاس جس نے باغ کو باغ نہیں بلکہ جنگل بنا دیا تھا۔ یکایک میری نگاہ ایک منظر پر ٹھہر سی گئی تھی۔ وہ منظر میری نگاہوں کے لیے ہرگز نیا نہ تھا۔ میں اُسے حیرت سے دیکھتا جا رہا تھا۔ باغ کے آخری گوشے میں ایک کنواں تھا۔ جس کے قریب ہی درخت سے جُھولا بندھا تھا۔ میں نے اُس جُھولے کو دیکھا تو میرا ذہن مجھے یہ یقین دلانے لگا تھا کہ یہ منظر میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ باغ کے اطراف کی دیواریں بے حد کچی تھیں اور کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔

میں نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے تھے مگر جاتے جاتے جُھولے پر ایک گہری نظر ڈالنا نہیں بھولا تھا۔

☆ ☆

''تو تم جا رہے ہو۔'' میں اپنے کپڑے بیگ میں رکھ رہا تھا کہ آفرین کی آواز پر پلٹ کر دیکھا۔

''ہاں!'' میں مختصراً کہہ کر دوبارہ مصروف ہو چکا تھا۔

''ہادی تم ماما کو جانتے ہو، پھر بھی ایسا کر رہے ہو!'' آفرین شرمندگی سے بولی۔

''ڈونٹ وری تم ایسا کچھ نہ سوچو۔ میں مزید تائی جان کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔'' میں مزید بولا۔



کچھ دیر آفرین کی خاموشی محسوس کر کے میں خود ہی بولا تھا۔ ”دیکھو آفرین میں نے تائی جان کی نظروں میں ہمیشہ اپنے لیے حقارت دیکھی ہے۔ اُنہوں نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا۔ میں نے اُن کے سرد رویے کو ہمیشہ برداشت کیا ہے، مگر اب اور نہیں، میں تمہاری اور فیضی کی دوستی کی قدر کرتا ہوں مگر اب نہیں چاہتا کہ مزید تم دونوں میری وجہ سے آزمائش میں پڑو۔“ میں نے تفصیل سے بات مکمل کی تھی۔

”فری اِسے مت روکو، جانے دو۔“ فیضی اچانک ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”فیضی بھائی آپ ہی ہادی کو روکیں۔“ آفرین روہانسی ہو کر بولی۔

میں آفرین کی نظروں میں چُھپی محبت جانتا تھا مگر کبھی اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکا تھا۔ جانتا تھا کہ تائی جان ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گی اور میں آفرین کو کوئی اُمید نہیں دلانا چاہتا تھا۔

”فری اِسے جانے دو۔ ماما ایسا ہی چاہتی ہیں۔“ فیضی نے آفرین کو سمجھایا۔

”مگر ہادی تم رہو گے کہاں؟“ فیض کو اچانک خیال آیا تھا۔

وہ اسلم بھائی ہیں نا، اُنہوں نے مجھے اپنا مکان دیا ہے رہنے کے لیے۔“ میں نے آفس کولیگ اسلم بھائی کا ذکر کیا۔

”اچھا تو مکان تم نے دیکھ لیا ہے۔“ فیضی نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں دیکھ آیا ہوں، بس کچھ ضروری کام مکمل ہو جائے تو چلا جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ آفرین مایوس ہو کر چلی گئی تھی۔

”ہادی یار مجھے لگ رہا ہے کہ تُو ایک خاص مقصد کے تحت بھاگ رہا ہے۔“ فیضی نے مجھے شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب کون سا مقصد؟“ میں نے اُسے اُلجھی نظروں سے دیکھا۔

”یہی کہ کیا پتا تجھے وہاں پازیب والی مل جائے۔“ فیضی نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔ اُس کی بات سمجھ کر میں مسکرایا تھا۔

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے مسکراہٹ چُھپاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اوکے بیسٹ آف لک۔“ فیضی محبت سے گلے لگتے ہوئے بولا۔ میری آنکھیں اُس کے خلوص پر پُرنم ہو گئی تھیں۔

فیضی جا چکا تھا، مگر اُس کی بات پازیب والی پر میرا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں اُلجھتا چلا گیا تھا۔

☆......☆......

اُس وقت میری عمر تقریباً دس سال تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہوا اچانک چونک سا جاتا تھا۔ پازیب کی مدھر آواز میرے کانوں میں رس گھول دیتی تھی کہ جیسے گاؤں کی کوئی گوری پازیب پاؤں میں پہن کر میرے اِرد گرد ہی ہو۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا تھا، مگر پازیب والی کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ حیرت ناک بات تو یہ تھی کہ میرے ساتھ کھیلنے والے لڑکے اِس آواز سے بے نیاز رہتے تھے۔ جیسے وہ کوئی پازیب کی آواز سن نہیں رہے۔ رفتہ رفتہ میں اِس آواز کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ اب آواز آنے پر میں چونکتا نہیں تھا۔ بس دل میں ایک خوشی کا احساس کروٹ لے لیتا تھا۔

کبھی کبھی سوچتا تھا کہ کہیں یہ کسی کی شرارت نہ ہو۔ کوئی لڑکا مجھے ڈرانے کے لیے ایسا نہ کرتا ہو، مگر میں یہ کھوج لگانے میں بھی ناکام رہا تھا۔

ایک دن میں اپنے گھر کے صحن میں لگے جامن کے درخت کے نیچے کھیل رہا تھا۔ قریب ہی اماں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی کہ یکا یک میری کانوں میں پازیب کی آواز گونج اُٹھی تھی۔ میں نے چور نگاہوں سے اماں کو دیکھا تھا مگر اماں اپنے کام میں مصروف تھی۔ یعنی وہ کوئی آواز نہیں سن رہی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں بڑا ہوتا گیا، مگر پازیب کی آواز میرے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ میں اِس کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ جس وقت آواز نہ سنائی دیتی، میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا کہ پازیب والی کہاں ہے؟

فیضان میرا ہم عمر اور میرا تایا زاد تھا۔ تایا ساری عمر شہر میں رہے تھے۔ شادی بھی وہیں کی۔ تائی جان بے حد مغرور تھیں۔ وہ گاؤں آ کر مل جل کر رہنے کی قائل نہ

تھیں۔ وہ نہ خود آئیں اور بلکہ تایا کو بھی گاؤں میں نہ رہنے دیا مگر تایا اپنی مٹی سے محبت نہ بھولے تھے۔ اس لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ تایا کے ساتھ فیضان بھی ہوتا تھا۔ جس کے ساتھ میری بے حد دوستی تھی۔ اُس کو میں نے پازیب والی کا بتایا تھا۔ بس وہ دن تھا اور آج کا دن ہے، وہ پازیب والی کے حوالے سے مجھے چھیڑنا نہ بھولا تھا۔

فیضان کے علاوہ میں نے اِس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ جو بھی میری بات سنے گا وہ میری بات پر یقین نہیں کرے گا اور اگر کر بھی لے تو مذاق ضرور اُڑائے گا۔ ایسا ہی ایک دن میرے ساتھ فیضی نے کیا۔

میں اسکول کا کام کر رہا تھا کہ فیضی بھاگتا ہوا آیا تھا۔

''ہادی جلدی آؤ، میں نے تمہاری پازیب والی کو ابھی ابھی دیکھا ہے۔'' فیضی پھولتی سانسوں کے درمیان بولا۔ میں حیرت سے ابھی کچھ سوچتا کہ فیضی میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگا تھا۔ گھر کے باہر ایک مداری موجود تھا۔ جس کے پاس ایک بندریا چولی گھاگرا پہن کر رقص دکھانے میں مصروف تھی۔ اُس کے پیروں میں گھنگھرو ہونے کی وجہ سے چھن چھن کی آواز آرہی تھی۔ میرے دیکھنے پر فیضی ہنس ہنس کر لال ہوگیا تھا۔ میں نے چند لمحوں تک اُسے دیکھا تھا اور پھر روتے ہوئے بھاگ گیا۔ سارا دن میں اُس سے ناراض رہا تھا اور وہ مجھے سارا دن مختلف طریقوں سے مناتا رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اکثر یہ ہونے لگا تھا کہ مجھے اکثر خوابوں میں ایک لڑکی نظر آنے لگی تھی۔ جو جُھولے پر بیٹھی ہوتی تھی اور سفید کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھی۔ جس کے سفید آنچل میں اُس کا چہرہ چھپا ہوتا تھا۔ مگر لمبے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہے ہوتے تھے اور اس کے گورے پاؤں میں پازیب ہوتی تھی۔ مگر میں کبھی بھی اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ بس یہ ایک حقیقت ہے کہ میری زندگی میں پازیب کا بہت عمل دخل رہا ہے۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوا؟ میں بہت حیران ہوتا، مگر جواب آج تک معلوم نہ کر سکا ہوں۔

پازیب کی آواز کیوں سنائی دیتی تھی؟ وہ لڑکی کون تھی؟ مجھے کیوں وہ نظر آتی تھی؟ اُس کا چہرہ میں کبھی نہیں دیکھ سکا تھا، کیوں؟

یہ وہ سوال تھے جو ہمیشہ میرے لیے سوال ہی رہے تھے، جواب کبھی نہ بن سکے تھے۔

''اماں مجھے ایک پازیب لے دو نا۔'' میں نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ارے پگلے تُو کیا کرے گا۔ تُو کوئی لڑکی ہے؟'' اماں میری بات پر ہنستے ہوئے بولیں۔

میری دونوں چھوٹی بہنیں میری بات پر مسکرا رہی تھیں۔

''نہیں اماں میں پہنوں گا نہیں، اپنے پاس رکھوں گا۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہے اُس کی آواز۔'' میں نے نجمہ اور آسیہ کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ابھی بھی مسکرا رہی تھیں۔

''ارے میرے بچے جب تیری دُلہن آئے گی، تو اُس کے لیے پازیب بنواؤں گی۔ پھر تُو سن لیا کرنا آواز۔'' اماں نے لاڈ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اماں کی غیر متوقع بات پر شرما کر رہ گیا تھا۔ نجمہ اور آسیہ اب منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روک رہی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھ کر منہ چڑایا تھا۔

وقت گزرتا گیا، وہ میرے خوابوں میں آتی رہی اور مجھے اپنی پازیب کا دیوانہ بنائی رہی۔ میں ہمیشہ اُس کا چہرہ دیکھ نہ پاتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اُس کی خاموشی بڑی بھید بھری تھی۔ ہوا میں اُس کا لہراتا سفید آنچل بے حد خوبصورت لگتا تھا۔

نہ جانے وہ کون تھی؟

☆☆

میں کمرے میں داخل ہوا تو نجمہ اور آسیہ مجھے دیکھ کر کھی کھی کرنے لگی تھیں۔

''یہ تم دونوں کو کس بات پر ہنسی آرہی ہے۔'' میں نے اُن دونوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ مجھے ہنسا رہی ہے۔'' نجمہ نے آسیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی ہنسی روکی۔

''بھائی ہم آپ کی پازیب والی بات پر ہنس رہے ہیں۔'' آسیہ نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

''اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے اُنہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی آپ کو پازیب کیوں اچھی لگتی ہے؟" آسیہ نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہادی بیٹا ذرا بات تو سن لے میری۔" اماں کے پکارنے پر میری اُن دونوں سے جان چھوٹی تھی۔

زندگی میں ایک عجیب سا موڑ آ گیا تھا۔ اِک اَن دیکھی ہستی میری زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ نہ جانے یہ محبت تھی، لگاؤ تھا یا کوئی انوکھا سا احساس۔ بہر حال یہ طے تھا کہ میرے دل کے کسی گوشے میں پازیب کی چھم چھم کا راج تھا، جو میرے کانوں میں رس گھولتی تھی۔ یہ آواز میرے ساتھ ساتھ تھی، نہ جانے کب سے؟

☆......☆......

مجھے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ ابا کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام بھی کرتا تھا۔ مگر پڑھنے کا وقت نکال لیتا تھا۔ شعور و آگہی کی منازل طے کرتے ہوئے میں نے نوجوانی کی طرف قدم بڑھا دیے تھے کہ اچانک ابا ہمارا ساتھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔

گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ میں طارق چاچا جو ہمارے پُرانے ملازم تھے، اُن کے ساتھ زمینوں کا کام بھی کرتا تھا، مگر پڑھائی کو نہ چھوڑا تھا۔ اب میرا مقصد اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نجمہ اور آسیہ کی بہت اچھے طریقے سے شادیاں کرنا تھا۔ میں تندہی سے اپنی تعلیم میں جُت گیا۔

اِسی دوران تایا گھر آئے۔ وہ میرے تعلیمی شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ شہر لے گئے تا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں۔ تائی جان کے حقارت آمیز رویے کے باوجود میں نے تایا کے گھر رہنا گوارا کر لیا تھا۔ فیضان اور آفرین کی محبت اور تایا جان کی شفقت کے ساتھ میں نے اعلیٰ تعلیم کا خواب پورا کر لیا تھا اور اب جاب کی تلاش میں تھا تا کہ زیادہ سے زیادہ پیسے اماں کو بھیج سکوں۔

میں تایا جان کے دفتر میں کام نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اُن کے اِصرار پر میں نے یہ بھی قبول کر لیا۔ اُن کی فیکٹری میں اچھے عہدے پر فائز ہو گیا۔ تنخواہ بھی بہت اچھی تھی۔

بس میرے خوابوں کی تعبیر کا وقت قریب آ گیا تھا کہ تائی جان نے میری زندگی کی پُرسکون جھیل میں اضطراب کا پتھر پھینکا تھا۔

اُنہیں میرے یہاں پر رہنے میں اعتراض تو ہمیشہ سے ہی تھا، مگر اب فیکٹری میں جاب پر وہ سیخ پا ہو گئیں۔ وہ شاید یہ سمجھتی تھیں کہ میں اُن کے گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے آیا ہوں، حالانکہ ایسا کچھ نہ تھا۔ مگر اُنہیں کون سمجھاتا۔

اُنہوں نے مجھے مفت کی روٹیاں توڑنے کا طعنہ دے ڈالا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ تایا نے میرے اوپر احسانات کیے تھے مگر میں نے اپنا تعلیمی خرچ ہمیشہ خود اُٹھایا تھا۔ کبھی تایا سے مدد نہ مانگی تھی۔ اُنہوں نے بار ہا مجھے مجبور کیا کہ میں تعلیمی خرچ اُن سے لیا کروں مگر میری غیرت نے گوارا نہیں کیا تھا اور پھر میں اپنا خرچا اُٹھا سکتا تھا۔ زمینوں سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مگر تائی جان نے ہر بات کو نظر انداز کر کے مجھے ذلیل کر دیا تھا۔ نہ جانے اُن کو ہم سے کیا بیر تھا۔ اُن کی نفرت ہمیشہ میری سمجھ سے باہر رہی تھی۔ مگر اب میں اِس گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ آفرین اور فیضان کے علاوہ تایا جان نے بھی بہت روکا مگر میں اب نہیں رُک سکتا تھا۔

زندگی کے شب و روز جاری تھے، مگر وہ پازیب کی چھم چھم......اب بھی میرے ساتھ تھی۔ فیضان اب بھی ہنستا تھا گو کہ اب میں نے اُس سے ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا، مگر وہ اب بھی اتنی پُرانی بات بھولا نہیں تھا۔

مرمت اور صفائی کا کام ہو چکا تھا۔ سو میں اسلم بھائی کے مکان میں شفٹ ہو گیا۔ ایک بات بہت حیرت انگیز تھی کہ اِس گھر میں آتے ہی پازیب کی چھم چھم اور خوابوں میں اُس دوشیزہ کا نظر آنا دونوں بند ہو گئے تھے۔ میں اِس بات پر کافی حیران تھا۔ یہ وہ سلسلہ تھا جو ہمیشہ سے میرے ساتھ تھا۔ اب میں اِس کا عادی ہو گیا تھا، تو ایسا کیا ہوا کہ یہ سلسلہ اچانک ختم ہو گیا۔ بہر حال یہ سلسلہ میرے لیے اب بھی حیرت کا باعث تھا۔

☆......☆......

آج گھر میں میرا پہلا دن تھا۔ سامان میں پہلے ہی پہنچا چکا تھا۔ کچھ ضروری سامان خریدنا بھی پڑا تھا۔ خریداری کر کے میں گھر آ گیا تھا۔ گھر میں روشنی کا انتظام بھی ہو چکا تھا۔ اِس لیے گھر اب کافی بہتر لگ رہا تھا، مگر ایک گہری پُراسرار خاموشی ابھی بھی چھائی تھی۔ کچھ وقت

میرا سامان کو ترتیب دینے میں لگ گیا تھا۔
کام سے فارغ ہو کر میں فریش ہونے چلا گیا۔ بعد میں کھانا کھا کر چائے پیتے ہوئے میں گھر کے اطراف کا جائزہ لینے لگا تھا۔ اِردگرد کے مکین بے چارے مزدور پیشہ لوگ تھے۔ تھک ہار کے وہ سب سو چکے تھے۔ اِردگرد فضا میں خاموشی چھائی تھی۔ میرا دھیان پھر سے پازیب کی چھم چھم میں اُلجھ گیا تھا۔ میرے لبوں پر اِک نرم سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

سفید پازیب والے پاؤں میرے تصور میں جھلملا رہے تھے۔ سفید بُراق آنچل لہراتا ہوا میری نظروں کے سامنے تھا۔

انسان اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھتا ہے، کبھی بند آنکھوں سے اور کبھی جاگتی آنکھوں سے۔ مگر یہ خواب میں نے بند اور جاگتی دونوں آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ خواب، وہ پازیب میرے ساتھ ہر پل رہی تھی۔ اب اچانک سے وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا، میری تشویش تو لازمی تھی۔

☆......☆......

دروازے پر تیز دستک سے میری آنکھ کھل گئی۔ چھٹی کا دن تھا، میرا پروگرام کافی دیر تک سونے کا تھا۔ رات کو نیند بھی دیر سے آئی تھی، مگر یہ صبح نہ جانے کون تھا جو ذرا بھی ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
''کون ہو سکتا ہے اِس وقت؟'' سوچتے ہوئے میں سلیپر پاؤں میں ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
''تم۔'' دروازہ کھول کر سامنے والے کو دیکھ کر اچانک ہی میرے منہ سے نکلا۔
مجھے دیکھ کر تم یوں حیران ہو رہے ہو جیسے میں کوئی غیر انسانی مخلوق ہوں۔ اور اب راستہ بھی دو گے یا یونہی تم تم کرتے رہو گے۔'' فیضی ہاتھ میں ناشتے کا سامان لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔
''ارے سوری یار۔ آؤ اندر آجاؤ۔'' میں اُسے راستہ دیتے ہوئے شرمندگی سے بولا۔
''واہ بھئی واہ گھر تو کوئی پُرانا محل لگ رہا ہے۔'' فیضی گھر میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔
''ہاں پرانی طرز کا بنا ہوا مکان ہے۔'' میں اُس کی بات کے جواب میں بولا۔
''میں نے سوچا میرا یار اکیلا ہوگا۔ نئی نئی جگہ کہیں گھبرا نہ جائے اس لیے کوئی میری طرح بہادر ساتھ ہونا چاہیے۔ اِسی لیے صبح صبح ناشتہ لے کر پہنچ گیا تا کہ سارا دن تیرے ساتھ گزاروں۔'' فیضی نے ناشتا میز پر رکھتے ہوئے شیخی بگھارتے ہوئے کہا۔ میں اُس کی بات پر مسکرایا تھا۔
''ہاتھ منہ دھولو تا کہ ناشتا شروع کریں۔ میرے پیٹ میں تو چوہے کی بجائے گدھے دوڑ رہے ہیں۔'' فیضی مسخرے پن سے بولا۔
ناشتے کے بعد چائے پیتے ہوئے فیضی اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا۔
''اور فیضی آفرین کیسی ہے اور باقی سب گھر والے۔'' میں نے اچانک پوچھا۔
''اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہے۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے اور تمہارے جانے کے بعد تو راوی ماما کے کہنے پر چین لکھتا ہے۔'' فیضی مزاحیہ انداز میں بولا۔
''چلو شکر ہے میرے جانے کا کوئی تو فائدہ ہوا۔'' میں اُس کی بات پر مسکراتے ہوئے بولا۔
''فیضی اماں کو نہ بتانا کہ میں تمہارے کے گھر نہیں رہتا، خوامخواہ پریشان ہو جائیں گی۔'' مجھے اچانک خیال آیا۔
''جو حکم میرے سرکار کا۔'' فیضی جواباً بولا۔ ''ہادی کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔'' فیضی اچانک بولا تھا۔
''نہیں کسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، سارا دن تو آفس میں ہوتا ہوں۔ اِس لیے کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔'' میں اُس کے خیال پر محبت سے بولا۔
''اچھا مجھے یاد آیا وہ تیری پازیب والی کا کیا بنا؟'' فیضی بھولنے والا نہیں تھا۔
''معاف کردے یار، چھوڑ دے میری جان۔'' میں نے عاجزی سے بولتے ہوئے اُسے دیکھا۔ تو وہ قہقہہ لگانے لگا۔
میرے گھورنے پر اُس کا قہقہہ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔ اُس دن فیضی میرے پاس ہی رک گیا۔

☆......☆......

رات کو نہ جانے کس پہر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں

نے نیفی پر نگاہ ڈالی تھی، وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ کیا احساس تھا؟ جو میرے اردگرد تھا۔ مجھے لگا تھا کہ کوئی آہٹ ہوئی تھی۔ کوئی میرے پاس تھا۔ کون تھا؟ میرا ذہن اُلجھ سا گیا تھا۔

کمرے میں خنکی ہونے کے باوجود بھی گھٹن بڑھ گئی تھی۔ میں خاموشی سے باہر لان میں آ گیا، باہر کھلی فضاء میں گہرے سانس لے کر بہتر محسوس کر رہا تھا۔

ایک دم میرے قریب ہی آہٹ سی اُبھری تھی۔ میری نگاہ جھولے پر پڑی تھی۔ مجھے لگا کہ جھولا آگے پیچھے دھیرے دھیرے حرکت کر رہا ہے، جیسے اُس پر کوئی بیٹھا ہو۔ مجھے لگا کہ جیسے میرا وہم ہو مگر جھولا ہل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ خود بخود۔

جھولے پر دوبارہ نگاہ ڈالی تو جھولا اپنی جگہ ساکت تھا۔ یعنی کچھ دیر پہلے جو میں دیکھ رہا تھا وہ محض میرا وہم تھا۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

☆☆

گیٹ پر دستک ہوئی تھی۔ میں جو ابھی آفس سے آ کر کھانا کھانے لگا تھا کہ دستک پر باہر کی جانب بڑھ گیا۔

”اسلم بھائی آپ اندر آ جائیں۔“ میں نے اُنہیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔

”بس سوچا آج تم سے پوچھتا چلوں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“ اسلم بھائی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اندر آ گئے۔

”نہیں اسلم بھائی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔“ میں نے سادگی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”دراصل یہ گھر کافی سالوں سے خالی رہا ہے تو جانتے ہو تم کہ ایسی جگہوں کے بارے لوگ قیاس آرائیاں کرنے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے تم سے پوچھ رہا تھا۔ میرے مرحوم کزن کو یہ مکان دراصل ہندوستان کی تقسیم کے وقت کلیم میں ملا تھا۔ اُس سے پہلے یہاں جو لوگ رہتے تھے، وہ مکان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میرے کزن کو یہاں زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا اور اُن کی وفات ہو گئی۔ تب سے یہ مکان خالی تھا۔“ اسلم بھائی چائے پیتے ہوئے تفصیل سے بولے تھے۔

”اچھا میاں میں چلتا ہوں، پھر آؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور بتانا۔“ اسلم بھائی کہتے ہوئے چلے گئے۔ میں کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

کھڑکی سے باہر لان پر نظر ڈالی تھی۔ باہر نرم چمکیلی سی دھوپ پھیلی تھی۔ لان کے پچھلے حصے کی دیواریں بے حد خستہ تھیں جو گر رہی تھیں۔ کوئی جانور بھی گھاس چرتے چرتے اندر آ جاتا تھا۔ میں نے آفس کے مالی کو گھر بلایا تھا تاکہ لان کی صفائی ہو سکے۔ سو وہ یہ کام کر رہا تھا۔

رات کے وقت نہ جانے یہاں کیوں پُراسراریت سی چھا جاتی تھی۔ مجھے رات کو کتاب پڑھے بغیر نیند نہیں آتی۔ سو اب بھی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میری نظر باہر لان میں بندھے جھولے پر پڑی۔ کتاب بند کر کے میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ جھولا اپنی جگہ ساکت تھا۔

اسی اثنا میں مجھے لگا کہ کہیں کسی درخت کے پیچھے کوئی سفید آنچل لہرایا تھا اور پل بھر میں غائب بھی ہو گیا تھا۔

”یہ کیا تھا؟“ میں غور کرنے لگا تھا۔

”شاید میرا وہم ہو۔“ میں نے سوچا۔

میں کھڑکی بند کر کے جانے لگا تھا کہ پازیب کی چھم چھم نے مجھے اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے کوئی چل رہا تھا۔ آج اتنے دنوں بعد پازیب کی آواز سنائی دی تھی، میں خوف زدہ ہونے کی بجائے باہر لان میں آ گیا۔ میں بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

”کون ہے؟“ میں کسی اَن دیکھے سے مخاطب تھا۔

جواب میں پل بھر کے لیے پازیب کی آواز تھم سی گئی تھی اور پھر دھیرے دھیرے دُور ہوتی چلی گئی تھی۔

میری اُلجھن آج بھی جُوں کی تُوں رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں اُداسی سے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ ذہنی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی، آخر پازیب والی کیا چاہتی تھی؟ نظر نہیں آتا تو پھر سنائی کیوں دیتی تھی؟

میں نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں، میں نے کانوں پر تکیہ رکھ لیا تاکہ پازیب کی آواز نہ سن سکوں۔

☆☆

سارا دن میں آفس میں افسردہ سا رہا تھا۔ کام میں بے دھیانی رہی تھی۔

''ہیلو ہائے کیا ہو رہا ہے؟'' فیضی نے حسب عادت اچانک انٹری دی۔

''کچھ خاص نہیں۔'' میں نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

''او میرے یار اتنے اُداس کیوں ہو؟'' فیضی تشویش سے بولا۔

''فیضی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے چہرے کو نارمل کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں، ورنہ یقین نہیں آ رہا۔'' فیضی ہنوز تشویش زدہ تھا۔

''اچھا چل فارغ ہو جا تو پھر ساتھ ہی لنچ کرتے ہیں۔'' فیضی کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

سارا دن میں نے بے حد مصروف گزارا تھا۔ فیضی کی کمپنی میں کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ موسم میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کوفی بنالی، اب میں اپنے ذہن کو تمام خیالات سے آزاد کر کے پُرسکون ہو رہا تھا۔

کتاب پڑھتے پڑھتے میں نیند کی وادی میں اُتر گیا۔

چھم چھم کی تیز آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ کتنی دیر میں غائب دماغی کی کیفیت میں لیٹا رہا۔ شاید میں اِس آواز سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں دوبارہ بند کر لیں، میں کوئی بھی بات سننا اور سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر پازیب کی تسلسل سے آتی آواز میری نیند اُڑا چکی تھی۔ چاند کی روشنی چھن چھن کر کے کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ ماحول میں ایک عجیب سی کیفیت رچی ہوئی تھی۔

میں اُٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا مگر یہ کیا، یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی تھیں۔ جھولے پر کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ وہی سفید کپڑے، لمبی لہراتی زُلفیں، ہوا میں اُڑتا وہ آنچل، وہ دھیرے دھیرے جھولا لے رہی تھی۔ اتنی دور سے اُس کا چہرہ کہیں واضح ہو رہا تھا۔ میں ایک دم سے کھڑکی کی اوٹ میں ہو گیا۔

آج سنہری موقع تھا اِس کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا جو مجھے یوں پریشان کر رہی تھی۔ میں کوئی بھی آہٹ کیے بغیر لان کی طرف نکل آیا تا کہ اُسے قریب سے دیکھوں، مگر جیسے ہی میں وہاں پہنچا لڑکی غائب تھی۔ جھولا ابھی بھی ہل رہا تھا۔ مگر چھم چھم کی آواز ختم ہو چکی تھی۔

کہاں گئی؟ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا جھولے تک جا پہنچا تھا۔ آج پہلی مرتبہ میں جھولے تک پہنچا تھا۔ جھولے کے اردگرد ایک دلفریب مہک رچی بسی تھی۔ نہ جانے وہ کوئی پھولوں کی خوشبو تھی۔ میں آگے بڑھ کر کنویں تک چلا گیا، کنواں کافی گہرا تھا اور وہاں بے حد تاریکی چھائی تھی۔

''ضرور میرے آنے سے پہلے وہ یہاں سے باہر بھاگ گئی ہے۔'' میں نے لان کے اِردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے سوچا۔ کوئی بات نہیں پھر آئی تو ضرور پوچھوں گا کہ کون ہے وہ، پہلے چھم چھم پھر اب یہ خوابوں سے نکل کر میرے سامنے آ گئی ہے۔ کیا چاہتی ہے؟ میں بھی پاگل ہوں کیا باتیں سوچ رہا ہوں بھلا، اِس لڑکی کا اُس خواب والی لڑکی سے کیا تعلق؟ میں اپنی سوچ پر خود سر جھٹک رہا تھا۔

☆☆

تین دن گزر چکے تھے، نہ چھم چھم کی آواز آئی تھی اور نہ وہ لڑکی دوبارہ دکھائی دی تھی۔ چلو اچھی بات ہے جہاں چھوٹی مجھے کیوں اتنی فکر ہو؟ یہ تین دن اضطراب میں ہی گزر گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو طبیعت بوجھل سی تھی۔ آفس فون کر کے میں نے بتا دیا کہ آج آ نہیں سکوں گا۔ سارا دن کھڑکی بند رکھی تھی۔ میں دانستہ اس ساری صورت حال کو اگنور کرنا چاہ رہا تھا۔ دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ بس یونہی لیٹا سوچوں کے بھنور میں ڈوبتا اُبھرتا رہا۔

اگلی رات وہ لڑکی پھر جھولے پر موجود تھی۔ میں اُسے کھڑکی سے دیکھتا رہا تھا مگر سوچتا رہا کہ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ آخر کار میں ایک بار پھر اُس کے سامنے تھا۔ اب کی بار اُس نے میرے آنے پر دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ بلکہ جھولے سے اُتر کر ایک طرف کو جانے لگی تھی۔

''ٹھہرو۔'' میں ایک دم اُس پکار بیٹھا۔ میرے پکارنے پر وہ اپنی جگہ پر رُک گئی مگر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

''کون ہو تم؟'' دل میں مچلتا ہوا سوال زبان میں آ گیا تھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا، یہاں کیوں آئی ہو؟'' میں

مزید بولا۔
اب کی بار اُس نے میری طرف پلٹ کر دیکھا مگر نگاہیں نہیں اُٹھائی تھیں۔
''میں...... گلنار ہوں۔'' چند لمحوں بعد اُس کے لب ہلے تھے۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اُس کی آواز بھی بے حد خوبصورت تھی۔
''تم کون ہو؟ یہاں اس وقت یوں اکیلے کیوں آتی ہو؟'' مجھے اُس کے بولنے پر حوصلہ ہوا۔
وہ بے حد کم عمر تھی شاید 16 یا 17 سال اور یوں اکیلے اس جگہ اتنی رات کو آنا میری سمجھ سے باہر تھا۔ وہ میری بات کے جواب میں چپ تھی۔
''دیکھو میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ تم بتاؤ تو سہی آخر کہاں سے آتی ہو؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟'' میں اُس کی خاموشی پر نرمی سے بولا۔
''میں یہیں رہتی ہوں اور یہاں جھولا لینے آتی ہوں۔ آپ کو اگر بُرا لگ رہا ہے تو میں آئندہ نہیں آؤں گی۔'' اب کی بار اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
''دیکھو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنی رات کو تمہارا یہاں آنا مناسب نہیں اور پھر آج کل کے حالات بھی ٹھیک نہیں۔ تمہارے والدین کو پتا چل گیا تو پریشان ہوں گے۔'' میں اُسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ وہ بے حد معصوم تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح اُس کے انداز میں تیزی طراری نہیں تھی۔ چہرے پر بے حد معصومیت تھی۔ دیکھنے سے وہ کسی اچھے گھر کی لگ رہی تھی۔ میری بات کے جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔
''دیکھو تم دن میں بھی تو جھولا لینے آسکتی ہو۔'' میں نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔
''نہیں میں اُس وقت نہیں آسکتی، میری مجبوری ہے۔'' اُس کی کانچ جیسی آنکھیں لمحے بھر میں پانی سے بھر گئیں۔ اور پھر وہ ایک جانب کو بھاگتی ہوئی اندھیرے میں گم ہوگئی۔ آج بھی میں اپنے سوالوں کے جواب نہ لے سکا تھا۔ مگر اب مجھے اُس پر ترس آرہا تھا۔ وہ بے حد معصوم اور کم عمر تھی۔

......☆......☆......

اگلے تین دن وہ اُسی مقررہ وقت پر آتی رہی تھی، مگر میں اُس کے پاس نہیں گیا تھا۔ میں اُسے یوں ہی کھڑکی سے دیکھتا رہا تھا۔ تیسرے دن میرا ضبط جواب دے گیا اور میں ایک بار پھر اُس کے سامنے تھا۔
اب کی بار وہ مجھے دیکھ کر نہ تو گھبرائی تھی، نہ جھولے سے اتری تھی۔ بس خاموشی سے بیٹھی رہی۔
''میں نے تم سے کچھ کہا تھا؟'' اس بار میرے لہجے میں کچھ سختی تھی۔ مگر وہ خاموش نظریں جھکائے بیٹھی رہی تھی۔
''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تمہارا کیا کروں، نہ کچھ بتاتی ہو اور نہ ہی کوئی بات سمجھتی ہو۔'' اب میرے لہجے میں بے بسی نمایاں تھی۔
''آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں اور نہ میری فکر کریں۔'' بہت دیر بعد وہ بولی۔
''یعنی تم بہت سمجھدار اور عقل مند ہو اور میں گدھا اور اُلو ہوں۔'' میں اُس کے اتنے اطمینان پر چڑ سا گیا۔
میرے یوں جذباتی ہوکر بولنے پر اُس کے لبوں پر پہلی بار مسکراہٹ اُبھری تھی۔
''نہیں ایسی بات نہیں ہے مگر میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔'' وہ اب بھی اطمینان سے بولی۔
''دیکھو لڑکی سیدھی طرح سے بات مان جاؤ ورنہ میں تمہارے والدین سے بات کرتا ہوں اور یہ نہ ہوسکا تو پھر میرے پاس ایک اور طریقہ بھی ہے۔'' میں نے اُسے ڈرانے کے لیے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔
''کون سا طریقہ۔'' اُس کی نظروں میں شک کے بادل لہرائے تھے۔
''یہی کہ میں پولیس کو بلالوں تاکہ وہ تم جیسی مشکوک لڑکی سے خود ہی اُگلوالیں گے۔'' میں نے اپنے خیال سے جیسے بم پھوڑا تھا۔
''کوئی فائدہ نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ تو میرا برسوں کا معمول ہے۔ یہ جھولا میرے بابا نے میرے لیے باندھا تھا۔'' اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پتا نہیں کیوں اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے دُکھ سا ہوا تھا۔
''اچھا تم رو تو مت۔'' مجھے اور کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ نظریں جھکائے اب بھی رنجیدہ تھی۔

''دیکھو مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ دیکھو میری بات سنو، تم ابھی کم عمر ہو، نا سمجھ ہو لیکن یوں اِس وقت یہاں اکیلے آنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ میں یہاں تنہا رہتا ہوں۔ میری ماں بہنیں بھی یہاں نہیں ہیں اور پھر اگر اِدھر اُدھر سے کوئی یوں تمہیں میرے ساتھ دیکھ لے تو سوچو کیا ہوگا۔ میں تو مرد ہوں مگر نہیں چاہتا کہ کوئی تمہارے کردار پر اُنگلی اُٹھائے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔'' میں نے بات ختم کر کے اُسے دیکھا تھا۔

وہ آہستگی سے سر ہلا کر نظریں جُھکا گئی تھی۔

''آئندہ اگر تم مجھے یہاں ملیں تو پھر میں سختی سے پیش آؤں گا۔'' میں اُس کی خاموشی پر برہم ہوتے ہوئے بولا۔ وہ ابھی بھی خاموش بیٹھی تھی۔

''تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ تم باز نہیں آؤ گی۔'' میں مزید برہم ہوا۔

''میں نے کہا نا آپ پریشان نہ ہوں، مجھے کوئی نہیں دیکھے گا۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

''کیوں تم نے کیا سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے کہ کوئی تمہیں نہیں دیکھے گا۔'' اُس کی بات پر مجھے پتنگے لگ گئے تھے۔

''میرا مطلب ہے کہ میں ہمیشہ سے یہاں آتی ہوں، مگر کبھی کسی نے مجھے نہیں روکا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا فرض کرو میری جگہ کوئی غلط انسان آجاتا تو کیا وہ بھی تمہیں دیکھ کر اپنی راہ لیتا۔ میں آج یہاں ہوں، پھر چلا جاؤں گا، میری جگہ اور کوئی آگیا تو کچھ بھی ممکن ہے۔ او مائی گاڈ! میں کیا کروں اس بے وقوف لڑکی کا۔'' میں اُس کی ضد پر نڈھال ہو گیا۔

میں اُسے وہیں چھوڑ کر واپس اپنے کمرے میں آگیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں بہت مصروف تھا۔ نجمہ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں جلدی جلدی اپنے ضروری کام نبٹانا چاہ رہا تھا تاکہ آرام سے چھٹیاں لے کر گاؤں جاؤں اور شادی کی تیاریوں میں اپنا کردار ادا کروں۔ تایا جان اور فیضی بھی میرے ساتھ جا رہے تھے۔ البتہ آفرین تائی جان کی ناراضگی کے ڈر سے نہیں جا رہی تھی۔

سارے دن کی مصروفیت نے بُری طرح سے تھکا ڈالا تھا۔ کھانا کھا کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا اور میں کھڑکی سے اُسے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں خود کو وہاں جانے سے روک نہیں پاتا تھا اور یہی میں چاہتا نہیں تھا۔ پھر میرا اُس سے کیا تعلق تھا۔ انسانیت کے ناتے جو میرا فرض تھا، میں نے اُسے سمجھا دیا تھا۔ اب وہ خود فیصلہ کر سکتی تھی کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح ہے۔ یہ ساری باتیں میں سوچ رہا تھا مگر اندر ہی اندر اُس کے لیے فکرمند ہو رہا تھا۔ یہ محبت تھی یا کوئی اور جذبہ۔ میں ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہا، یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح میں گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ شادی والا گھر تھا۔ بے حد گہما گہمی تھی۔ اماں مجھے اور فیضی کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ نجمہ بھی مجھے دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔ البتہ فیضی اور آسیہ نے اُسے خوب چھیڑا تھا۔ یونہی شادی کا دن آگیا تھا۔

شادی کا انتظام بے حد شاندار رہا تھا۔ البتہ میرا دھیان بار بار گلنار کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ ضرور آئی ہوگی پگلی، میں اُس کے بارے میں سوچ کر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

اماں کا اِصرار تھا کہ شادی کے بعد میں چند دن اور اُن کے پاس رہوں۔ تایا جان اور فیضی چلے گئے تھے۔ میں اماں کے پاس ٹھہر گیا تھا۔

مجھے پازیب کی چھم چھم بے قرار کرتی رہی تھی۔ اُس کی کانچ جیسی نیلی آنکھیں بار بار میرے تصور میں آتی رہیں۔ مجھے اُس کی فکر بھی ہو رہی تھی۔ میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر چند دنوں کی شناسائی تو بہر حال تھی۔

چند دنوں کے بعد میں واپس شہر آگیا تھا۔ میرے آنے کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی تھی مگر اس بار وجہ صرف گلنار ہی تھی۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ آتی رہی تھی یا پھر کچھ عقل میں آگیا تھا۔ اب مجھے رات کا انتظار تھا اور پھر مقررہ وقت پر وہ وہاں موجود تھی۔ میں نے اُسے کھڑکی سے دیکھا تھا اور پھر سیدھا وہاں پہنچ گیا۔

''تو تم بات نہیں مانو گی۔'' اتنے دنوں بعد میں اُس

سے مخاطب تھا۔

وہ یوں آرام سے بیٹھی تھی جیسے اُسے یقین ہو کہ آج میں ضرور آؤں گا۔ میرے کھڑے ہونے کے باوجود وہ جھولا لیتی جارہی تھی دھیرے دھیرے۔ اتنے دنوں سے میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ انہی کپڑوں میں ملبوس تھی۔ مگر وہ کپڑے اُتنے ہی صاف اور شفاف تھے۔ جیسے پہلی مرتبہ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ پیروں میں پازیب بھی وہی تھی۔ میری نظریں اُس کی پازیب میں اُلجھ سی جاتی تھیں۔ مگر نہیں مجھے سنائی دینے والی پازیب کا تعلق گلنار سے نہیں تھا۔ شاید وہ میرا وہم تھا۔ وہ خواب میرا تخیل تھا۔ مگر یہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ پازیب کی میرے دل میں ایک خاص جگہ تھی۔ گلنار کی پازیب نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

وہ میری اتنی دیر خاموشی پر مجھے دیکھنے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"کچھ نہیں، بس ویسے ہی خاموش تھا۔" میں نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ گلنار نے چند لمحوں تک میرے بولنے کا انتظار کیا تھا پھر وہ اپنے گھر کی طرف چل دی تھی۔

"ٹھہرو۔" میں نے اُسے پکارا۔

میرے کہنے پر وہ پلٹ کر مجھے سوالیہ نظروں سے تکنے لگی تھی۔

"آؤ میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔" میں نے اُس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا تھا۔

"نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔" وسرد سے لہجے میں بولتے ہوئے پھر چل پڑی تھی۔

"گلنار میری بات سنو۔" میں نے اُس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

مگر وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے ہوا کے جھونکے کی مانند باہر نکل گئی تھی۔

میں نے تیزی سے باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے تاکہ اُس کا تعاقب کر کے اُس کا گھر دیکھ لوں مگر وہ نہ جانے اندھیرے میں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اتنی جلدی وہ کہاں چلی گئی تھی۔ عجیب لڑکی ہے، میں اُس کے بارے میں سوچتا ہوا واپس آگیا تھا۔

............☆.....☆............

اگلے چند دن گلنار نہیں آئی تھی۔ میں نے مقررہ وقت پر جب بھی دیکھا وہ موجود نہیں تھی۔ البتہ جھولا معمول کے مطابق ہل رہا تھا، خود بخود یہ بھی ایک راز تھا کہ جھولا اپنے آپ کیسے ہل رہا تھا؟

میں نے گلنار کی طرف سے جامع خاموشی پر ہار مان لی تھی۔ میں جو راز جاننے نکلا تھا وہ اب جاننے کی آرزو نہیں تھی۔ میں نڈھال ہو چکا تھا اور میں اُسے بھلانے کی کوشش میں تھا کہ وہ ایک بار پھر آزمائش کی صورت میرے سامنے تھی۔

میں جانا نہیں چاہ رہا تھا مگر ایک انجانی کشش مجھے اُس کی طرف لے جارہی تھی۔ آج وہ پہلے سے بہتر لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اجنبیت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ آج وہ قدرے مطمئن لگ رہی تھی۔

میں خاموش کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔

"ہادی صاحب! میں جانتی ہوں کہ آپ میرے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ میں کون ہوں؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے اُسے اپنا نام کبھی نہیں بتایا مگر وہ جانتی تھی پر کیسے؟

"نام جاننا کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے، جو آپ یوں پریشان ہو رہے ہیں۔" وہ جیسے میری ایک ایک سوچ پڑھ رہی تھی۔

میں بالکل خاموش رہا تھا۔

"آج میں آپ کو وہ سب بتانے آئی ہوں جو میں نے اُس سے پہلے کبھی کسی کو نہیں بتایا اور وہ سب جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔" وہ میری طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ میں اُس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔

"میرا نام گلنار میرے بابا نے رکھا تھا۔ میری پیدائش پر میرے والدین بہت خوش تھے۔ شادی کے دس سال بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ مجھ سے پہلے کوئی اولاد نہ تھی اور نہ میرے بعد کوئی اولاد ہوئی تھی۔ میری ماں مجھے شہزادی گلنار کہتی تھی۔

میں ابھی چھ سال کی ہوئی تھی کہ میری ماں مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے ناطہ توڑ گئی۔ بہت دن تک میں پورے گھر میں اپنی ماں کو ڈھونڈتی رہی تھی۔

میرے بابا مجھے بہلاتے، پیار کرتے تاکہ میں ماں کو بھول جاؤں۔ ایک دن میں بہت رو رہی تھی۔ میری ایک ہی رٹ تھی کہ میں اپنی ماں کے پاس جاؤں گی۔ بابا مجھے سنبھال کر بے حال ہو رہے تھے۔ پھر مجھے خوش کرنے کی خاطر بابا نے یہ جھولا میرے لیے باندھا اور پھر میں جھولا جھولتی رہتی تھی اور رفتہ رفتہ اپنی ماں کی جدائی کا غم بھول گئی۔'' گلنار چند لمحے کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھیں برسنے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔ میرا دل دُکھ سے بھر گیا، مگر تسلی کے لیے ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

''بابا کا اپنا کاروبار تھا۔ وہ گھر اور کاروبار ایک ساتھ نہیں سنبھال پا رہے تھے۔ عزیز اور دوستوں کے مشورے کے بعد بابا نے دوسری کرلی۔ میری نئی ماں روایتی سوتیلی ماں ہی ثابت ہوئی تھی۔ میں ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ سگی اور سوتیلی کے فرق کو سمجھتی۔ البتہ سوتیلی ماں شروع دن سے میری دشمن ہوگئی تھی۔ بابا مطمئن تھے کہ اب میں تنہا نہیں رہوں گی اور وہ اپنے کاروبار پر توجہ دینے لگے تھے۔

رفتہ رفتہ میں سوتیلی ماں کے رویے کو سمجھنے لگی تھی۔ اب میں اُس سے دور دور رہنے لگی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھے مارتی تھی۔ میں روتی ہوئی جھولے پر جا بیٹھتی تھی اور تنہائی میں گھنٹوں اپنی ماں سے باتیں کرتی تھی بلکہ اپنی ماں سے سوتیلی ماں کی شکایتیں بھی لگاتی تھی۔

ایک دن بابا میرے لیے بے حد خوبصورت پازیب لائے۔ جو مجھے بے حد بھائی اور پھر میں سارا دن گھر میں چھن چھن کرتی رہتی تھی۔ پازیب گویا میری سہیلی تھی۔ جیسے وہ میری ہر بات سمجھتی تھی۔ پازیب کی آواز مجھے اِردگرد کا ہر غم بھلا دیتی تھی۔ میری زندگی میں میرے بابا کے بعد میرا جھولا اور پازیب ہی میرے لیے اہم تھے۔ بابا نے میرا شوق دیکھا تو جب بھی کسی دوسرے شہر جاتے تو میرے لیے نت نئی پازیب ضرور لاتے۔ سوتیلی ماں کو ہم دونوں کا پیار ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

سوتیلی ماں نے مجھ سے اب گھر کا کام کروانا شروع کر دیا تھا۔ میں خاموشی سے سارا دن گھر کے کام کرتی تھی اور جب بھی جھولے کی طرف بڑھتی تو سوتیلی ماں کوئی کام کہہ دیتی تھی۔ میں اُس کی نظروں سے بچنے کے لیے رات کو جھولا لیتی تھی۔ میرے بابا کو ان حالات کی کوئی خبر نہیں تھی اور نہ ہی میں نے کبھی بتانے کی کوشش کی تھی۔ میں اُنہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وقت گزرتا گیا اور میں نے جوانی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں تو بچپن سے بے حد خوبصورت تھی۔ جوانی میں تو میرے حُسن کا انداز ہی نرالا تھا۔ ہر آیا گیا میرے حُسن کے قصیدے پڑھتا تھا۔ ورنہ مجھے کبھی علم نہ ہوتا۔ میرے ماں باپ بھی بہت خوبصورت تھے اور میں اُن ہی پر گئی تھی۔ البتہ سوتیلی ماں واجبی شکل وصورت کی مالک تھی۔

سوتیلی ماں کا دور پار کا رشتے دار تھا مہروز خان، بڑی بڑی سُرخ آنکھوں والا، جس کے چہرے ہی سے خباثت جھلکتی تھی۔ میں اُس کی آمد پر اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی مگر وہ جیسے میری تلاش میں ہی آتا تھا۔ وہ بابا کی عمر کا تھا۔ میں اُسے ماموں بلاتی تھی۔ سوتیلی ماں مہروز خان کی مجھ میں دلچسپی فوراً تاڑ گئی اور بجائے یہ کہ وہ اُسے آنے سے منع کرتی وہ اور اُسے شہہ دیتی تھی۔ میں بہت پریشان تھی، بابا کو بتاتی تو سوتیلی ماں میرا جینا حرام کر دیتی۔ جاؤں تو جاؤں کہاں والی صورتِ حال ہوگئی تھی۔ بابا کو مہروز خان کی آمد بُری لگتی تھی مگر وہ خاموش تھے۔

پھر ایک دن وہ ہوگیا جس کا میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ بابا کاروبار کے سلسلے میں دوسرے شہر گئے تھے۔ میرا دل صبح سے ہی گھبرا رہا تھا۔ طبیعت میں عجیب سی بے کلی تھی۔ کسی انہونی کا ڈر کھائے جا رہا تھا۔

مہروز خان کی آمد نے میرے دل و دماغ میں ہلچل مچادی تھی۔ خطرہ میرے اِردگرد منڈلانے لگا تھا۔

''گلنار مہروز کے لیے چائے بنا کے لاؤ۔'' سوتیلی ماں نے مجھے حکم دیا تھا۔

میں نے چائے بنا کر مہروز خان کو دی تو اُس کی سرخ آنکھوں نے مجھے اندر تک ڈرا دیا تھا۔ آج اُس کی آنکھوں میں ہوس کے رنگ نمایاں تھے۔ میں گھبرا کر کچن میں آگئی۔

''میں سوچ رہی ہوں مہروز تیری اور گلنار کی شادی کروا دیتی ہوں۔'' سوتیلی ماں نے ہنستے ہوئے بم پھوڑا تھا۔

''ارے آپا شادی بھی ہو جائے گی، پہلے دیدار تو ہو جائے۔'' مہروز خان کی خباثت بھری آواز میرے کانوں میں زہر گھول گئی تھی۔

میں نے کام کرتے کرتے پلٹ کر دیکھا تو وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں خوف کے مارے بے ہوش ہونے کے قریب تھی کہ ایک دم میں باہر کی سمت بھاگی تھی۔ مہروز اس کے لیے تیار نہیں تھا، وہ بھی میرے تعاقب میں تھا۔ سوتیلی ماں ہمیں دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

''کہاں بھاگ رہی ہے تُو۔'' مہروز نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

مجھے تو ایک دم کرنٹ لگ گیا تھا۔ کچھ بہت بُرا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ زندگی اور موت مجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

''ماموں میرا ہاتھ چھوڑ دو۔'' میں لرزتی آواز میں بولی۔

''ارے ہاتھ بھی چھوڑ دیں گے، ذرا قریب تو آؤ۔'' مہروز انسان نہیں شیطان لگ رہا تھا، جس کے سر پر ہوس سوار تھی۔ وہ سوتیلی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ میں نے اِس غفلت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کے ہاتھ پر دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ وہ تکلیف سے بلبلا اُٹھا تھا اور میں بھاگ کر کنویں تک آ گئی تھی۔ میں مرنا نہیں چاہتی تھیں مگر دُنیا مجھے مارنا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے بابا یاد آ رہے تھے۔ میں نے حسرت سے اپنے گھر اور جھولے پر الوداعی نگاہ ڈالی تھی۔

''ماموں میرے قریب مت آنا ورنہ میں کنویں میں چھلانگ لگا دوں گی۔'' میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پُرعزم لہجے میں بولی۔

ماں اور مہروز کو مجھ سے اِس بات کی توقع نہیں تھی، وہ سمجھ رہے تھے کہ میں اُن کی خواہش کے آگے سر جھکا دوں گی۔

''گلنار یہ کیا کر رہی ہے؟ اِدھر آ۔'' سوتیلی ماں نے مجھے بہلاتے ہوئے کہا۔

مگر میں بہلنے والی نہیں تھی۔ میں اُن کے ناپاک ارادے جان گئی تھی۔

''گلنار خبردار ایسا کچھ کیا۔'' مہروز نے مجھے دھمکی دی اور میری طرف قدم بڑھائے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ میں اُن کے آگے ہار مان لوں گی، وہ مجھ جیسی بزدل لڑکی سے اتنی ہمت کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کے مہروز مجھے قابو میں کر کے اپنے ناپاک عزائم پورے کرتا، میں نے اِس کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی۔'' یہ کہہ کر گلنار یوں ہانپنے لگی تھی جیسے میلوں کا سفر کر کے آئی ہو۔ میں جو ساکت بیٹھا اُس کی کہانی سن رہا تھا۔ چونک اُٹھا تھا۔

''وہ دن ہے اور آج کا دن، میری بے قرار روح اپنے قاتل کو ڈھونڈتی ہے۔ میرے صدمے میں باپ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میرا گھر ویران ہو گیا، مگر میں یہیں رہ گئی۔ میں نے موت کو گلے تو لگا لیا تھا مگر اب میرے اندر انتقام اُبھر رہا تھا۔ دُنیا کے تمام مردوں سے صرف انتقام لینا ہے۔

میرے حُسن و جمال کے علاوہ میری پازیب کی چھم چھم بھی مردوں کو گھائل کرنے کے لیے کافی تھی۔ جو مجھے دیکھتا میرا دیوانہ ہو جاتا تھا اور پھر میری محبت و عشق میں بے قرار ہو کر وہ اس کنویں سے چھلانگ لگانے کے لیے بھی تیار ہو جاتا تھا۔ میں پہلے اُنہیں اپنی محبت کا فریب دیتی تھی، پھر اُن کی محبت کا امتحان لینے کے لیے اُنہیں جان دینے پر مجبور کرتی تھی اور وہ اپنی جان پر کھیل جاتے تھے اور مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ مجھے لگتا کہ میں نے مہروز خان سے اپنی موت کا بدلہ لے لیا ہے۔ گلنار کی آنکھوں میں سفاکی جھلک رہی تھی۔

پھر ایک دن میری ملاقات آپ سے ہو گئی۔ آپ بھی میرا اگلا شکار تھے۔ پھر اتفاق کی بات کہ آپ اسی گھر میں رہنے آ گئے۔ مجھے اپنے حسن و جمال پر پورا اعتماد تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی میں نے آپ کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھ لی تھی۔ مجھے اپنا کام آسان لگ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میری پازیب کی چھم چھم آپ کے اِردگرد جال بُن رہی تھی کہ آپ کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔'' گلنار نے کہتے ہوئے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی تھی۔

یہ جاننے کے باوجود کے وہ ایک روح تھی، مجھے اُس سے کوئی خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا بلکہ وہ تو بے حد معصوم

اور مظلوم تھی۔

''مجھے لگا کہ میرا خیال غلط تھا۔ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے اور سب مرد ہوس پرست نہیں ہوتے۔ آپ کی نظروں میں میرے لیے پسندیدگی کے علاوہ عزت، فکر اور خیال بھی نمایاں تھا۔ آپ میری فکر میں گھل رہے تھے بلکہ میری اُداسی پر اُداس ہوتے تھے۔ مجھے کبھی بھی آپ کی نظروں میں ہوس نہیں نظر آئی تھی۔ میں مہروز کی ہوس کی سزا سارے مردوں کو نہیں دے سکتی اور پھر میں کون ہوتی ہوں سزا دینے والی۔ اُوپر ایک ہستی جو سزا اور جزا دینے کا حق رکھتی ہے۔ آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ جو بھی لڑکی آپ کی زندگی میں آئے گی وہ بے حد خوش قسمت ہوگی۔ جس کو آپ جیسا خیال اور محبت کرنے والا مرد ملے گا۔ میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے۔'' کہتے ہی گلنار میری نظروں کے سامنے ہی غائب ہوگئی تھی۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اُس کی موت پر اُس کی بے بسی پر مگر مجھے خوشی تھی کہ اُس کی بے قرار روح کو قرار آ گیا تھا۔ وہ اب بھٹکے گی نہیں، وہ اپنی دُنیا میں لوٹ گئی تھی۔

میں پلٹ کر جانے لگا تھا کہ میری نظریں اُس جگہ پر پڑیں جہاں گلنار موجود تھی۔ اُس کی پازیب وہاں پڑی تھی۔ میں نے جھک کر وہ اُٹھالی۔ میں سوچتا ہوں پازیب گلنار کے پیروں میں اتنی اچھی کیوں لگتی تھی؟

☆......☆......☆

ہر رات کو کھڑکی میں کھڑا میں جھولے کو تکتا رہتا ہوں کہ شاید گلنار کبھی بھولے سے دوبارہ وہاں آجائے مگر ایسا پھر کبھی نہیں ہوا۔ گلنار نے ہمیشہ کے لیے اس ظالم دُنیا سے ناتا توڑ لیا ہے۔ یہ سوچ مجھے ہر پل رنجیدہ رکھتی ہے۔ گلنار کی یاد میں ہر پل صدیوں کے برابر لگنے لگا ہے۔ وقت گزرتا رہا اور اس دوران آفرین اور فیضان کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ آسیہ بھی اپنے گھر کی ہوگئی۔ اماں بہت اکیلی ہوگئی ہیں۔ اِصرار کرتی رہتی ہیں کہ میں جلد گاؤں آجاؤں اور شادی کر کے اپنا گھر بساؤں مگر دل بجھ سا گیا ہے۔ گلنار کی یاد دل سے امربیل کی طرح لپٹی ہے، جو مجھے خوش ہی نہیں ہونے دیتی۔ آج بھی فیضی میرے سامنے موجود مجھے گاؤں جانے پر منا رہا تھا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' فیضی مجھے کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں جو لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ جھولے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''یعنی کیا کیا جائے جو تم گاؤں جانے پر تیار ہو جاؤ گے۔'' فیضی سٹپٹاتے ہوئے بولا۔

''اچھا یار چند دنوں تک میں گاؤں چلا جاؤں گا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔'' میں اُس کے اِصرار پر مجبور ہوتے ہوئے بولا۔

میرے گاؤں جانے کی دیر تھی۔ اماں نے جھٹ پٹ میری شادی کروادی، لڑکی پہلے ہی دیکھ رکھی تھی۔ میری نا نا کے باوجود اماں نے مجھے مہلت نہیں دی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ میں محض گلنار کی یاد کی وجہ سے اماں کو دُکھی نہیں کر سکتا۔ سو میں یاسمین کے سامنے بیٹھا تھا۔

''یاسمین میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو خوش رکھ سکوں۔''

میری بات پر دُلہن بنی یاسمین نے سر مزید جھکا لیا تھا۔ میں نے لمحے بھر کے لیے اُسے دیکھا تھا اور پھر اُس کا گھونگھٹ اُٹھا دیا تھا۔

''گلنار!'' میرے سامنے گلنار دُلہن بنی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے مسکراتے ہوئے نظریں جھکالیں۔

یاسمین بالکل گلنار کا دوسرا روپ ہے۔ مجھے اماں پر بے حد پیار آرہا ہے کہ اماں نے مجھے میری محبت سے ملا دیا۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں گلنار کو یاسمین کی شکل میں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔

میں بے حد خوش ہوں اور میری خوشی اُس وقت دوچند ہوجاتی ہے جب یاسمین کی پازیب کی چھم چھم سنائی دیتی ہے اور میں خوشی سے جھوم اُٹھتا ہوں۔

پازیب والی اور پازیب کا راز مجھے سمجھ آگیا ہے کہ وہ آواز میرے آنے والی زندگی کا اشارہ تھی کہ مستقبل میں مجھے بار بار یہ آواز سنائی دے گی۔ وہ خواب میں نظر آنے والی لڑکی گلنار تھی۔ کیونکہ خواب آدھی زندگی ہوتا ہے اور مجھے آئندہ آنے والی زندگی گلنار سے ملنا تھا۔

☆☆☆

گنگا کی سمادھی

سکندر حبیب

ایک ایسے نوجوان کی بپتا، جسے اُس کے تجسس نے ایک ایسی سمادھی میں پہنچادیا، جہاں سے زندہ نکلنا ناممکن تھا مگر......

ستمبر کے شروع ایام میں میرے کزن عمران کی شادی تھی۔ مایوں والے دن تو ہم نہ جا سکے البتہ بارات والے دن علی الصبح ہماری روانگی ہوئی۔ خالہ کے گھر میں جب ہم داخل ہوئے تو جس جس کی ہمارے چہروں پر نظر پڑتی گئی، مسکراہٹ کے پھول کھلتے گئے۔ سب سے علیک سلیک کے بعد چھوٹی خالہ ہمیں ایک مخصوص کمرے میں لے گئیں۔ جہاں پر دو چھوٹے بچوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ جو ایک کونے میں موجود چارپائی پر سو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم اتنی دور سے لمبے سفر پر آئے ہیں۔ اس لیے تھک گئے ہوں گے۔ تواضع وغیرہ کے بعد میں یونہی کمرے سے نکل کر باہر نکل آیا۔

گھر میں وہی شادیوں کا سماں تھا۔ ہر طرف بچوں کا شور اور لڑکیاں سجنے سنورنے میں مصروف تھیں۔ اس ہنگامہ آرائی سے بچنے کے لیے میں چھت پر چلا آیا۔

''اب میری نگاہیں گاؤں کا طواف کرنے لگیں۔ یہ علاقہ کافی خوبصورت اور زرخیز تھا۔ سرسبز درختوں کی موج نے ماحول کو کافی حد تک خوشگوار بنا رکھا تھا۔ یک دم گھومتے گھومتے میری نگاہیں گاؤں کی مغربی اور جنوبی جانب بنی ایک سفید گنبد نما عمارت پر جا کر رک گئیں۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے گویا خود سے پوچھا۔ ابھی میری سوچیں اس راستے میں ہی گڈمڈ تھیں کہ نیچے سے کسی چشم براہ کی آواز آئی کہ بارات بالکل تیار ہے۔ لہٰذا سب لوگ گاڑیوں میں جا کر بیٹھ جائیں۔'' اب میں نے نیچے جانا ہی مناسب سمجھا۔'' ابھی میں گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ جیب میں موجود موبائل کی بیل بجنے لگی۔ نکال کر دیکھا تو اپنے شہر سیالکوٹ سے ایک دوست کا فون تھا۔ میں اس سے باتیں کرنے میں اس قدر محو ہوگیا تھا کہ میرا آگے پیچھے بالکل بھی دھیان نہ رہا تھا۔

''دفعتاً گلی کا پہلا موڑ کاٹتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک موٹی سی بھینس مجھ سے ٹکرائی ہو۔ نتیجے کے طور پر میں پشت کے بل زمین پر گر پڑا۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی درد سے احتجاج کرتی محسوس ہوئی۔ وہ تو شکر تھا کہ موبائل پر میری گرفت مضبوط تھی۔ ورنہ اس بے چارے کے بھی ٹکڑے ہو جاتے۔

جتنی تیزی سے میں گرا تھا اتنی تیزی سے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ درد کی لہر ایسی ایک دفعہ پھر ریڑھ کی ہڈی سے نکل کر پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ جس پر مجھے بڑی مشکل سے قابو کرنا پڑا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میری تمام تر سوچوں اور توقعات پر پانی پھر گیا۔ مجھ سے ٹکرانے والی کوئی بھینس نہیں تھی۔ بلکہ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی



تھی۔ اس کا چہرہ کالے لباس میں ایسا لگ رہا تھا جیسے سیاہ بادلوں کے حصار میں ماہتاب جھانک رہا ہو۔

''آئی ایم سوری جناب۔ میں جان بوجھ کر آپ سے نہیں ٹکرائی۔ وہ دراصل اس نے مجھے دھکا دیا تھا اور میں اتفاقی طور پر آپ سے ٹکرا گئی۔ اتنا کہہ کر وہ مسکرائی اور پھر کچھ دیر بعد بارات روانہ ہوگئی۔

''بارات گوجرانوالہ شہر کے ایک میرج ہال میں جانی تھی۔ وہاں پر جا کر نوجوان لڑکوں نے بھنگڑا ڈالا اور خوب ہوائی فائرنگ کی۔ اکثر کے ہاتھ میں تو اسلحہ وغیرہ نظر آرہا تھا۔ بڑے بزرگوں نے انہیں خوب سمجھایا کہ اس طرح سے فائرنگ کرنا ٹھیک نہیں۔ مگر اس نقار خانے میں طوطی کی سنتا کون ہے پھر اسی بھگدڑ میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ یکا یک ایک گولی ایک جوان لڑکے کو لگ گئی۔ پھر کیا تھا سب کو اس کی فکر لگ گئی اور بارات کا مزہ خراب ہوگیا۔ قریب ہی ایک اسپتال تھا۔ اُسے جلدی سے وہاں لے جایا گیا۔ بارات کی واپسی رات گئے ہوئی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے نیند جلد ہی آگئی تھی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔

کچھ دیر بعد میں پھر چھت پر پہنچ گیا۔

یہ گنبد کیا ہوسکتا ہے؟ کس الگ تھلگ کھیتوں کے بیچ میں ہے۔ کہیں یہ کسی پیر، فقیر کا مزار تو نہیں یا پھر کسی پرانی مسجد کا حصہ؟ لیکن اگر یہ کوئی مزار وغیرہ ہوتا تو اس کی ایسی حالت نہ ہوتی۔ اسے وہاں جا کر دیکھنا چاہیے،

''کس کا ہم خیال ہوا جارہا ہے بھئی۔'' میں کافی دیر سے اس گنبد پر نگاہیں جمائے سوچ رہا تھا کہ اپنے پیچھے کسی لڑکی کی آواز سن کر چونک پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی جو کل گلی میں مجھ سے ٹکرائی تھی اور اس کے ساتھ دوسری لڑکی بھی تھی۔

''کچھ نہیں!'' میں بس اس گنبد نما چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اتنا کہہ کر میری نگاہیں پھر اس گنبد پر جم گئیں۔

''ہوں! تو آپ کی نظر سے یہ بچ نہ سکا۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''کیا مطلب؟'' اس کی بات نے واقعی مجھے چونکا دیا۔

''مطلب یہ جناب کہ مجھے معلوم ہے آپ ایسی چیزوں کو دیکھنے کے بے حد شوقین ہیں اور یہی نہیں! میں تو آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں کہ آپ کا نام کیا ہے۔ آپ آئے کہاں سے ہیں۔ آپ کی اس گھر میں [illegible] ہے؟''

''آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟'' میں واقعی دنگ رہ گیا۔
''وہ ایسے جناب کہ جس طرح آپ کی عمران کے گھر والوں کے ساتھ کچھ رشتے داری بنتی ہے۔ اس طرح معلومات تو ملتی ہی رہتی ہیں کہ کون اپنا ہے۔ کون پرایا۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتی واپس نیچے چلی گئی اس نے اپنا نام امروزیہ بتایا تھا۔
''دعوتِ ولیمہ کی تیاریاں پورے جوش وخروش سے جاری تھیں۔ سارا دن اسی میں گزر گیا۔ چھت پر جاتے میری نظر اس گنبد پر ضرور پڑتی۔ لیکن اُسے دیکھنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مگر میں بھی مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ اُسے دیکھوں گا ضروری!''
رات کو عمران اپنے سسرال والوں کے ساتھ چلا گیا۔ قریبی رشتے دار بھی رخصت ہو چکے تھے۔ رات کو امروزیہ کے ساتھ میرا ٹکراؤ ہوا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں نہیں گئے؟''
''آپ کیوں نہیں جا سکے؟'' اس نے اُلٹا سوال کر ڈالا۔
''خالہ نے نہیں جانے دیا۔ ہم پرسوں جائیں گے۔''
''تو ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ پرسوں جائیں گے۔'' وہ بولی۔ ''آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
''پوچھو......!'' میں نے کہا۔
''آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' اس کی بات سن کر میں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔
''ارے نہیں امروزیہ جی! زندگی میں اتنا ٹائم کہاں کہ ہم کسی سے محبت کر سکیں۔ ویسے بھی میں ان پیار، عشق، محبت جیسی الجھنوں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔''
''مگر آپ کی باتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے امروزیہ جی کہ آپ بھی کسی سے محبت کرتی ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھونکا۔
''ہاں ہوئی ہے اور وہ بھی سچی محبت۔''
''اچھا کون ہے وہ خوش قسمت۔ جسے آپ اتنا چاہتی ہیں۔'' میں نے سامنے ایک سبز درخت پر نظریں جما دیں۔
''وہ ہستی آپ ہیں جناب۔'' اس نے بلا جھجک کہہ دیا۔
میں نے سر گھما کر اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ پاگل ہو۔
''مذاق اچھا کر لیتی ہیں آپ۔'' میں نے ہنس کر پھر اسی درخت پر نظریں گاڑ دیں۔
''میں سب کچھ جانتی ہوں عدنان جی! مگر اس کم بخت دل کو کون سمجھائے۔ اور میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ یقین کریں جب سے آپ کو دیکھا ہے تو بس......بس اس سے آگے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔
''اچھا باقی کی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ وہ جو سامنے گنبد نما عمارت دکھائی دے رہی ہے۔ وہ کیا ہے۔'' میں نے گنبد کی سمت اشارہ کیا۔
''اوہ......! میں بھی کہوں۔ جناب ابھی تک اس کے بارے میں پوچھ کیوں نہیں رہے۔ اچھا تو سنیے!''
''یہاں کے لوگ اسے 'سمادھی' کہتے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں پر ہندو اور سکھ رہا کرتے تھے۔ یہ ان ہی میں سے کسی کی عبادت گاہ تھی۔ وہ لوگ یہاں سے چلے گئے تو یہ ویران ہو گئی۔''
''تو اس کا مطلب ہے یہ دیکھنے کی چیز ہے۔ میں گویا ہوا۔
''دیکھیے ضرور دیکھیے......! مگر رات کو نہیں۔'' وہ بولی۔
''رات کو کوئی خاص بات ہوتی ہے۔'' میں نے راز داری سے پوچھا۔
''خاص تو کوئی نہیں۔ لیکن بزرگ کہتے ہیں یہ جگہ اچھی نہیں۔''
''کیا آسیب وغیرہ کا کوئی چکر ہے۔'' میں نے پوچھا۔
''آج تک کوئی ایسا واقعہ پیش تو نہیں آیا۔ پھر بھی بزرگوں کی باتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔'' ابھی باتیں درمیان میں ہی تھیں کہ زارا چھت پر آ گئی۔
''اگر باتیں ختم ہو گئی ہوں تو نیچے خالہ جی بلا رہی ہیں۔'' وہ شرارتی انداز میں بولی۔
''اچھا بائے۔'' امروزیہ ہاتھ لہراتی زارا کو بُرا بھلا کہتی نیچے چلی گئی۔

☆......☆......☆

کچھ دیر بعد میں اکیلا ہی سمادھی کی طرف جانے والے راستے پر کھڑا تھا۔ یہ نو فٹ کچا سا راستہ تھا۔ اس کے دونوں طرف دھان کی فصل کھڑی تھی۔ دو ایکڑ کے

فاصلے پر وہ سمادھی نظر آ رہی تھی۔ میں اس راستے پر چلتا ہوا سمادھی کے پاس پہنچ گیا۔

یہ ایک چار فٹ اونچا بڑا گول سا چبوترا تھا۔ اس کے اوپر پندرہ فٹ کا بنا وہ سفید گنبد ایستادہ تھا۔ میں چبوترے کے اوپر چڑھ گیا۔ اس کا پلستر جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور کئی جگہ سے مٹی کے ساتھ جڑی اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔ سمادھی کے اندر جانے کا راستہ بھی تھا جس کی اونچائی پانچ فٹ اور چوڑائی تین فٹ تھی۔ آس پاس چبوترے کے اوپر نیچے لمبی لمبی جنگلی گھاس اور بھنگ کی بسا ندھ تھی۔

میں اس کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر سے اس کی چوڑائی بھی پانچ فٹ اور لمبائی بھی پانچ فٹ تھی، چونکہ میرا قد ساڑھے پانچ فٹ سے بھی زیادہ تھا اس لیے مجھے جھک کر اندر کا جائزہ لینا پڑا۔ اطراف کی دیواروں پر جگہ جگہ خانے بنے ہوئے تھے۔ جن کے اندر کسی ماہر آرٹسٹ نے ہاتھ سے ہندوؤں کی دیوی سیتا دیوی کی کئی کلر تصویریں بنا رکھی تھیں۔ میں نے جینز پینٹ کی جیب سے موبائل نکالا اور چند تصویریں لے لیں۔ پھر باہر نکل کر اس کی اور تصویریں لیں اور ساتھ ہی میں گنبد کی پچھلی جانب آ گیا۔ سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر نہر کا بند سانپ کی طرح بل کھاتا شمال سے جنوب کی طرف آ رہا تھا۔ اس بند کے اوپر کیکر اور شیشم کے درختوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ نہر کی طرف سے آتی ہوئی نیم یخ بستہ ہوائیں تن من میں سرشاری کی لہریں تخلیق کر رہی تھیں۔ گھومتے گھومتے میری نگاہیں اس بوڑھے پر جا کر رک گئیں۔ جو نہر کے بند کے اوپر لگے ایک درخت کے نیچے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ چلو سمادھی کے بارے میں اس بابے سے مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ لہٰذا میں چبوترے سے اترا اور اس چھوٹے سے بنے راستے پر پاؤں دھرتا بند کے اوپر چڑھ گیا۔ نہر میں پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔

''اسلام علیکم!'' قریب پہنچتے ہی میں بوڑھے سے مخاطب ہوا۔

''ہوں!'' اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر سلام کا جواب نہ دیا۔

''کیتھوں آیا ایں؟ (کہاں سے آئے ہو) میرے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ بول اٹھا۔

''وہ جی میں سیالکوٹ سے یہاں ایک شادی کی تقریب میں آیا ہوں۔''

''پروہناں آیا ایں؟'' (مہمان آئے ہو) وہ دوبارہ بولا۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''فوٹو شوٹو تو کھینچی ہو گی اس کی۔'' اس نے سمادھی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں! بس چند ایک تصویریں لی ہیں اور''

''میری بات غور سے سن لڑکے!'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ دن کو تو، تو اس کو جی بھر کر دیکھ سکتا ہے۔ مگر رات کو یہاں نہ آنا۔ ورنہ پچھتائے گا۔ اب تو جا یہاں سے۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا رُعب تھا کہ میں چپ چاپ دوبارہ سمادھی کی طرف آیا اور پھر واپس گھر آ گیا اب میں دوبارہ چھت پر تھا۔

تب امروزیہ چھت پر آ گئی۔

''کہاں تھے آپ؟ آپ کے کزنز اور دوست کئی بار خالہ سے آپ کے بارے میں پوچھ بیٹھے ہیں۔''

وہ میں ویسے ہی گھومنے پھرنے گیا تھا۔''

''اچھا یہ بتایئے شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے۔ کہیں سیر سپاٹا ہو جائے، پاور ہاؤس دیکھنے چلیں؟''

''شام کو میں نظام پور جا رہا ہوں۔'' لیکن یہ میرا سفید جھوٹ تھا۔

اب مغرب کی نماز ہو چکی تھی اور میرا یہاں سے نکلنا ضروری تھا۔ سو میں نے ایک بہانا بنایا اور چپکے سے نکل آیا۔ عشاء کی اذان تک میں نے اِدھر اُدھر وقت گزارا۔ میرا خیال تھا کہ جو بھی واقعہ ہو گا وہ رات کو ہو گا۔

میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ نا جانے ایک سفید رنگ کا قد آور کتا کہاں سے آ گیا اور بیچ راستے میں کسی آہنی دیوار کی طرح کھڑا ہو کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی خوفناک آواز ماحول پر دہشت کے تاثر چھوڑ رہی تھی۔

''او...... ہو...... یہ مصیبت کہاں سے آ گئی۔'' میں نے دو تین نیچے سے پتھر اٹھائے اور اس کی طرف پھینک دیے۔ لیکن وہ اچھل کر ایک طرف ہو جاتا اور پھر اپنی جگہ

پر آجاتا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ہر قیمت پر مجھے آگے بڑھنے سے روکنا چاہتا ہے۔

"کیا کروں؟ واپس چلا جاؤں؟" ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے پیچھے ایک نسوانی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ جس نے ہاتھ میں ایک بڑا سا ٹوکرا اٹھا رکھا تھا۔ ٹوکرے کا منہ سفید رنگ کے کپڑے سے بند ہوا تھا۔

"یہ آپ سے نہیں ہٹے گا۔ بابو جی! اسے میں ہٹاتی ہوں۔" اس نے ٹوکرا ایک طرف رکھا اور نیچے سے ایک وزنی پتھر اٹھا کر کتے کو دے مارا۔ کتا چوں چوں کی ہلکی سی آواز نکال کر قریبی کھیت میں روپوش ہو گیا۔

"ارے واہ! آپ نے تو ایک منٹ میں ہی اسے بھگا دیا۔ میں تو مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔"

"یہ ایسے ہی بھونکتا ہے بابو جی! میں نے ایک دفعہ اس کی ڈنڈے سے خوب پٹائی کی تھی اس لیے مجھے دیکھ کر یہ بھاگ گیا۔ آپ کو سمادھی کی طرف جانا ہے چلیے میں بھی اس طرف ہی جا رہی ہوں۔" اس نے ٹوکرا اٹھا لیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں سمادھی کی طرف جا رہا ہوں۔" اس کی بات پر میں ششدر رہ گیا۔

"آپ جس جگہ پر کھڑے ہیں کوئی بھی دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

"اوہ...... ہاں...... ٹھیک کہا تم نے!" مگر تم اس وقت وہاں کیوں جا رہی ہو؟ میں نے اس کی تفتیش پر پوچھا۔

میری بات سن کر وہ ہنسنے لگی۔ میں وہاں رہتی ہوں بابو جی!" اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ "کیا کہا وہاں رہتی ہو۔ اس چھوٹی سی سمادھی کے اندر......؟"

"اب آپ سے کیا چھپانا بابو! آپ مہمان ہیں۔ اس لیے میں آپ کو ساری بات بتا دیتی ہوں۔ سمادھی کے اندر ایک تہہ خانہ ہے۔ میں اور میرا باپو!" وہاں رہتے ہیں۔ اس بھری دنیا میں میرا باپو کے سوا کوئی نہیں۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے یہ جگہ ٹھیک نہیں۔ رات کو یہ خطرناک ہو جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں جی!" یہ افواہ میرے باپو کی اڑائی ہوئی ہے۔ میں جو یہاں اکیلی ہوتی ہوں۔ اس طرح کسی بھی لفنگے کی نظر مجھ پر پڑ سکتی ہے۔ اچھا چھوڑیے! باقی کی باتیں سمادھی کے اندر جا کر کرتے ہیں۔" اس نے سمادھی کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"ارے نہیں نہیں۔ پھر بھی زندگی رہی تو چکر لگاؤں گا۔" میں بولا۔

"اب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمیں بھی تو کچھ خدمت کا موقع دیں۔ ویسے بھی میں اکیلی ہوں۔ گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ بے شک چند منٹ بیٹھ کر واپس آجایئے گا۔ تب تک باپو بھی آجائیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مجھے کسی نے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو خواہ مخواہ بدنامی کا باعث بن جاؤں گا۔ ویسے بھی ایک جوان لڑکی کا کسی انجان لڑکے کے ساتھ رات کی تنہائی میں بیٹھنا اچھا نہیں ہوتا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے آپ پر اور خود پر مکمل اعتماد ہے۔" وہ بولی۔

"اگر ہے تو چلیے۔" پھر میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

"گنگا نام ہے جی میرا۔" وہ بغیر رکے بولی۔

"گنگا!" سنا ہے گنگا کسی دریا کا نام ہے۔" میں بولا۔

"آپ نے ٹھیک سنا ہے جی۔ یہ دریا انڈیا میں ہے۔ جسے بہت مقدس مانا جاتا ہے۔" اب ہم سمادھی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہاں پر بھی کیڑوں مکوڑوں کی آوازیں بھی ماحول کو پُراسرار بنا رہی تھیں۔ گنگا چبوترے پر پاؤں دھرتی سمادھی کے اندر داخل ہو گئی۔ بادل نخواستہ مجھے بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔ وہ ٹوکرا ایک طرف رکھ چکی تھی۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک موم بتی نظر آنے لگی۔ چاند کی چاندنی اس ٹوٹے ہوئے چھوٹے سے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

"ایک منٹ رکیے؟ گنگا بولی۔ "میں اُجالا کرتی ہوں۔" پلک جھپکتے ہی میں اس نے موم بتی روشن کر لی۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں ایک دفعہ پھر چکرا کر رہ گیا۔ صبح جب میں نے اسے اندر سے دیکھا تھا تو یہ کافی تنگ تھی۔ مگر اب کافی وسیع ہو چکی تھی۔ میں نے گنگا کی طرف دیکھا تو موم بتی کی زرد لو میں اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ تب اچانک میرا دماغ ٹھنکنے لگا۔ اس لڑکی کا پلک جھپکتے ہی موم بتی روشن کر لینا، پھر اندر کی جگہ

اتنی کشادہ ہو جانا، ضرور کچھ نہ کچھ تو گڑبڑ ہے؟
دفعتاً گھڑ، گھڑ جیسی آواز پیدا ہوئی اور ہلکی ہلکی زمین لرزنے لگی۔ میں نے نیچے دیکھا تو فرش پر تین فٹ چوڑا اور دو فٹ لمبا شگاف پڑ چکا تھا اور نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔

''بابو جی! آپ یہاں پر بیٹھیں، میں اوپر سے ٹوکرا لے آؤں۔'' اتنا کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کی چال میں اب تیزی تھی۔

''میں وہیں پر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر سے اطراف میں دیکھنے لگا۔ گنگا اوپر جا چکی تھی۔ پھر اوپر سے پھر گھڑ گھڑ جیسی آواز اُبھری۔ میں نے جلدی سے اوپر دیکھا تو سیڑھیوں والا راستہ بند ہو چکا تھا اور فرش ایک جیسا نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنی رگوں میں لہو منجمد ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دہشت کا بھیانک اژدہا بے رحم ہو کر مجھے ڈسنے لگا۔ میں نے دوڑتا ہوا سیڑھی پر پہنچ کر میں نے گنگا کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

''گنگا...... گنگا اسے کھولو۔ دیکھو مجھے ایسا مذاق ہرگز بھی پسند نہیں۔'' مگر دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

''گنگا۔ اس دروازے کو کھولو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ اور میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم ایک لڑکی ہو۔'' پھر دوسری طرف سے اس کا قہقہہ بلند ہوا۔

''اب یہ دروازہ کبھی نہیں کھلے گا بابو جی!'' آپ کی اب یہی آخری آرام گاہ ہے۔'' اس کی آواز بلند ہوئی۔

''دیکھو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے گلا پھاڑ کر کہا۔

''باہر نکلو گے تو دیکھا جائے گا۔'' ساتھ ہی اس کی آواز بند ہوگئی۔ میں اسے آوازیں دیتا رہا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ یہاں تک کہ میرے گلے میں خراشیں پڑ گئیں۔ میں نے زور لگا کر اس راستے کو کھولنے کی کوشش بھی کی اور چند گھونسے بھی رسید کیے لیکن وہ ٹس کا مس نہ ہوا۔

یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا تو راستہ نہ ہوگا۔ غصے میں آ کر میں نے دیوار پر ایک لات زور سے رسید کر دی۔

''یک لخت وہاں سے سفید دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ کر حیرت کا بت بنا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ دھوئیں کی شدت اب تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ لیکن نہ اس میں گھٹن تھی اور نہ ہی مجھے کھانسنا پڑا۔ چند ساعتوں بعد دھواں بالکل صاف ہو گیا اور اس جگہ پر لکڑی کا بنا ہوا ایک بوسیدہ سا دروازہ نظر آنے لگا۔

کہیں یہ باہر جانے کا راستہ تو نہیں؟ میں نے خود سے کہا۔ لہٰذا یہ سوچ کر میں دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میں ابھی دو قدم ہی آیا تھا کہ اچانک وہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور دیوار پہلے کی طرح نظر آنے لگی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا پھر رُخ سیدھا کر لیا۔ اندر عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ روشنی کہاں سے پھوٹ رہی تھی، وہ چیز مجھے نظر نہ آئی۔

''کمرہ کافی بڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے میری نگاہ ایک کونے میں جا کر رکی تو خوف سے میں بھونچکا رہ گیا۔ اس کونے میں تین انسانی ڈھانچے کھڑے تھے۔ ان میں سے درمیان والے ڈھانچے کی کھوپڑی پر ایک چوہے سے ملتا جلتا جانور بیٹھا ہوا تھا اور مجھے اپنی لال چھوٹی چھوٹی خونخوار آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک بل نظر آیا۔ اس بل کے آگے اسی طرح کے تین اور جانور کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔ وہ بھی چیں، چیں، چوں جیسی آوازیں نکال رہے تھے۔ میری نظریں ان پر جم چکی تھیں۔ ان کے ارادے نیک نہیں لگ رہے تھے۔

یک دم ان تینوں جانوروں نے ایک ساتھ میری طرف دوڑ لگا دی۔ خوف سے میری گھگھی بندھ گئی اور میں نے دوسرے کونے کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن وہ میرے تعاقب میں تھے۔ میں کبھی اِدھر بھاگتا کبھی اُدھر...... مگر وہ میرے پیچھے تھے۔ میں پوری طرح بوکھلا چکا تھا۔ مجھے اس بھولی صورت گنگا پر تاؤ چڑھتا گیا اور اس غصے نے مجھے جلا بخشی اور گنگا کے لیے نفرت آتش فشاں بن گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا اور ایک کونے میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس کھڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک سب سے آگے تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب

آیا۔ میں نے نشانہ لے کر فٹ بال کی طرح پاؤں گھمایا۔ ٹھیک اس جانور کے پیٹ میں لگا اور وہ سیدھا چھت سے ٹکرا کر فرش پر گر گیا۔ اس کے منہ سے نیلے رنگ کا سیال بہنے لگا اور وہ ساکت ہو گیا۔ دوسرا میری پنڈلی سے چمٹ گیا۔ میں نے اسے زور سے کھینچا اور دیوار کے ساتھ دے مارا۔ اس کا بھی یہی حال ہوا۔ منہ سے نیلا سیال نکلنے کے بعد وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ تیسرا میرے کندھے پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنے تیز ناخن میری شرٹ میں گاڑ یے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا پیٹ پکڑا اور بڑی مشکل سے اس کو کھینچ کر شرٹ سے الگ کیا۔ اور زور سے فرش پر دے مارا۔ اس کے منہ سے چیں کی آواز نکلی اور وہ بھی وہیں مر گیا۔ میں نے سر گھما کر ڈھانچوں کی طرف دیکھا۔

''ڈھانچے کی کھوپڑی پر بیٹھا وہ جانور اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ جیسے اس کا پہلا حملہ ناکام گیا ہو۔ اِسی اثناء ایک ڈھانچے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں خوف سے بوکھلاہٹ کا شکار ضرور ہو چکا تھا لیکن کہتے ہیں نا کہ نفرت اور غصہ انسان کو ایسی طاقت عطا کر دیتا ہے جو کسی بھی چیز پر بھی حاوی ہو سکتی ہے۔ میرے رگ و پے میں گنگا کے لیے نفرت اور غصّے کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ ڈھانچہ میرے نزدیک آیا میں نے پوری قوت سے لات گھما کر اس کی درمیانی ہڈی پر دے ماری۔ کڑک کی آواز بلند ہوئی اور اس کے اعضاء بکھر گئے۔ دوسرا میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر اس نے اتنی زور سے میرے پہلو میں ٹکر ماری کہ میں سیدھا دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے لوہے کا ہتھوڑا میری پسلیوں میں دے مارا ہو۔ ایک لمحے میں تو درد سے کٹ کر ہی رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ ڈھانچہ میرے سر پر پہنچ جاتا۔ میں کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ بڑے آرام سے چلتا ہوا میرے نزدیک آیا اور منہ کا نشانہ لے کر اس نے مکا گھمایا۔ میں جلدی سے نیچے جھک گیا اور ایک ہاتھ اس کی گردن پر ڈال کر اور دوسرے سے بازو پکڑ کر پوری قوت سے دیوار کی طرف دے مارا۔ کڑ کڑ کی آواز بلند ہوئی اور اس کی ہڈیاں ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگیں۔

آخری ڈھانچے کے اوپر بیٹھا جانور تیزی سے اُچھل کود کرنے لگا۔ جیسے یہ سب دیکھ کر بے چین ہو۔ پھر اس نے کھوپڑی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

تیسرا ڈھانچہ متحرک ہوا اور اس نے وہیں سے مجھ پہ جست لگا دی۔ ساتھ ہی اس نے میری گردن قابو میں کر لی اور گرفت بڑھا لگا۔ میں نیچے گر چکا تھا اور ڈھانچہ میرے اوپر تھا۔ مجھے اپنی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں اور سانس اندر دم توڑتا ہوا۔ میں نے تمام تر قوت یکجا کی اور اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر ہاتھ اوپر اٹھانے لگا۔ مگر وہ تو جیسے مجھے چمٹ ہی گئے تھے۔ میں نے دوسری دفعہ بھرپور زور لگایا اور اس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ اوپر اٹھتے چلے گئے۔ کچھ اوپر جا کر اس نے پھرتی سے اپنی کلائیاں میرے ہاتھوں سے چھڑا لیں اور دوبارہ گردن پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے جلدی سے سر اٹھا کر ایک ٹکر اس کے ماتھے پر دے ماری۔ اک عجیب سی چنگاری پیدا ہوئی۔ جیسے لوہے پر گرائنڈر چلتا ہے۔ مجھے اپنے سر میں درد اٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے پوری طاقت سے اسے پرے دھکیل دیا۔

''ڈھانچہ منہ کے بل گر چکا تھا۔ میں متحرک ہوا اور لپک کر اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں۔ پھر اوپر اٹھا کر دائرے میں گھمانے لگا۔ تین چار چکر دینے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ سیدھا اڑتا ہوا سامنے دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ ڈز کی آواز اُبھری اور اس کی ہڈیاں بکھر کر رہ گئیں۔ میں نے پلٹ کر اس چوہے جیسے جانور کی طرف دیکھا۔

اچانک اس کے گرد اسی طرح کا سفید دھواں اٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ دھوئیں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب وہاں پر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند ساعتوں بعد دھواں ختم ہوا تو وہاں پر اسی، نوے سال کا ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ اس نے میلا کچیلا سا جبہ پہن رکھا تھا اور اس کی مونچھیں اور داڑھی کافی بڑی ہوئی تھی۔ سر کے بال میل سے اٹے ہوئے تھے۔ جیسے برسوں سے وہ حمام میں نہ گیا ہو۔ اس کے چہرے پر جا بجا جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں لال خون کی طرح چمک رہی تھیں۔

''یک دم میری نظر قریب پڑی ہوئی کھوپڑی پر پڑی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا، وہ جیسے ہی میرے نزدیک آیا۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے اس کے منہ کا نشانہ لے کر کھوپڑی پھینک دی۔ کھوپڑی ٹھیک اس کی آنکھوں پر لگی اور پاش پاش ہوگئی۔ اس کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں گھس چکی تھیں۔ پھر خون کی دھار خارج ہونے لگی۔ میں اُٹھا اور دوڑتا ہوا دائیں کندھا اس کے پیٹ پر دے مارا۔ گرا میں بھی تھا اور وہ بھی...... لیکن تکلیف اسے زیادہ تھی۔ وہ مرگی کے مریض کی طرح نیچے تڑپ رہا تھا۔

میں پھر اٹھا اور لپک کر اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں۔ پھر حصار میں گھمانے لگا۔ چار پانچ چکر دینے کے بعد اسے اس طرح اچھال دیا جس طرف پہلے دروازہ تھا۔ یک دم کڑک جیسی آواز پیدا ہوئی اور بوڑھا دوسری طرف جا گرا۔ اب وہاں پر دروازہ موجود تھا۔ مگر ٹوٹا ہوا۔ یہ شاید اس بڈھے کا طلسم تھا۔ جس کے آنے جانے سے دروازہ کھلتا تھا۔ میں ٹوٹے ہوئے دروازے سے چھلانگ لگا کر پہلے ہال میں آگیا۔ بڈھا فرش پر بے ماہی آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

دفعتاً میری نظر سیڑھیوں کے اوپر اٹھ گئی۔ وہ راستہ کھلا ہوا تھا۔ اور باہر سے اندھیرے کی پرچھائیں نظر آرہی تھی۔ میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا پھر سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی میں نے آدھی سے کم ہی سیڑھیاں عبور کی تھیں کہ وہ بابا تیزی سے اٹھا اور کسی باز کی طرح چھلانگ لگا کر میرے آگے والی سیڑھی پر آ کھڑا ہوا۔

''تو کیا سمجھتا ہے لڑکے۔ یہاں سے بچ کر نکل جائے گا۔ کھیل تو اب شروع ہوا ہے بچے......'' اتنا کہہ کر اس نے ایک تھپڑ میرے گال پر دے مارا۔ میں سیڑھیوں پر لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گرا۔ اس نے وہیں سے جست لگائی اور میرے قریب آگیا۔ ایک دفعہ پھر اس نے مجھے اوپر اٹھایا اور دیوار کی طرف مار دیا۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد میں فرش سے بھی ٹکرایا۔ شکر تھا کہ میرا سر پھٹنے سے بال بال بچ گیا۔ بوڑھے کے قوی ہیکل قہقہے ہال میں گونجنے لگے۔ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بڑی مشکل سے میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ بڈھا بڑے تسلسل سے میری طرف بڑھنے لگا۔

''اچانک میری نگاہیں اس مشعل کی طرف اٹھ گئیں۔ جو دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے وہ مشعل نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی اور وہ مستعد کھڑا ہوگیا۔ وہ میرے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ مشعل کو میرے ہاتھ میں دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

''اوئے لڑکے! اس مشعل کو وہیں لگا دے۔ ورنہ ہڈیاں چبا ڈالوں گا۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

کہیں یہ بڈھا اس آگ سے تو نہیں ڈر رہا؟ میرے دماغ میں یہ بات دوڑنے لگی۔ تو یہ بات ہے۔ میں نے خاموشی سے جلتی مشعل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ آگ نے اسے ایسے پکڑا جیسے سوکھی لکڑی ہو۔ اب وہ آگ میں دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اس کی بھیانک اور دلدوز چیخوں نے خاموش فضا کا تسلط توڑ کر ہلچل مچا دی۔ مشعل کو وہیں پھینک کر میں قدرے بھاگتا ہوا سیڑھیوں پر پاؤں دھرتا باہر نکل آیا۔

اب میں اس جگہ پر کھڑا تھا۔ جہاں کتے نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی اور گنگا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں رک کر میں نے لمبے لمبے سانس لیے اور اسے بحال کرنے لگا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو ترتیب دی۔

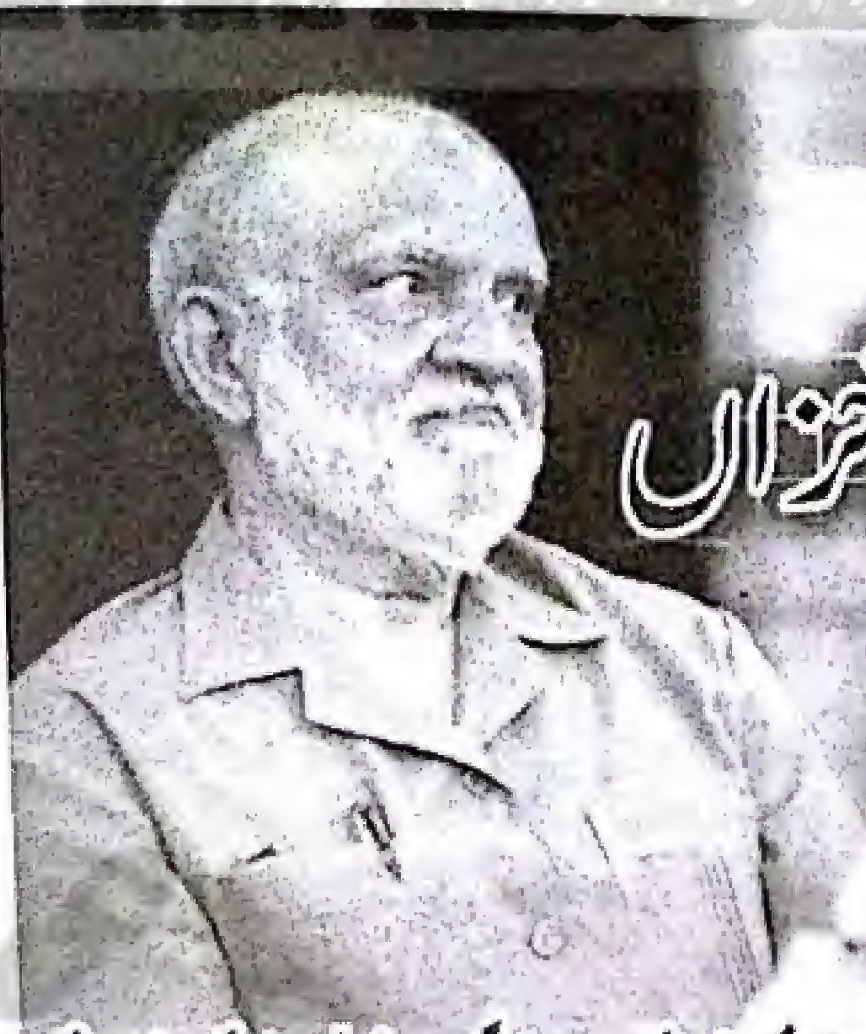
میرا پورا وجود پسینے سے تربتر تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور چہرہ صاف کرنے کے بعد گاؤں کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کہیں دور سے گنگا کی صاف آواز ہوا کے دوش پر میری سماعت سے ٹکرائی۔

''تسی بڑے خوش قسمت او باؤ جی! اج کسے دیاں دعاواں نے توانوں بچالے آیا اے...... نئیں تے اج تسی......؟'' اتنی بات کہہ کر اس نے بلند قہقہہ لگایا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کی آواز بند ہوگئی۔

میں واقعی سوچ میں پڑ چکا تھا کہ یہ کسی کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ ماں کی یا پھر کسی چاہنے والی کی......

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

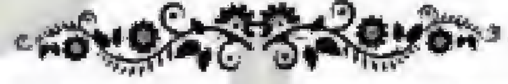
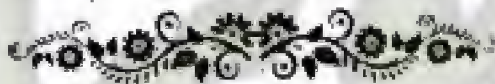
☆......☆......☆



برطانیہ میں خزاں

محمود شام

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر، عظیم صحافی اور شاعر محمود شام کے برطانیہ میں گزرے اُن لمحات کا ذکر جو اَمر ہو گئے
ایسا سفرنامہ جسے پڑھ کر قاری خود کو اُن ہی مناظر کا حصہ محسوس کرتا ہے جس میں محمود شام خود سفر کر رہے تھے

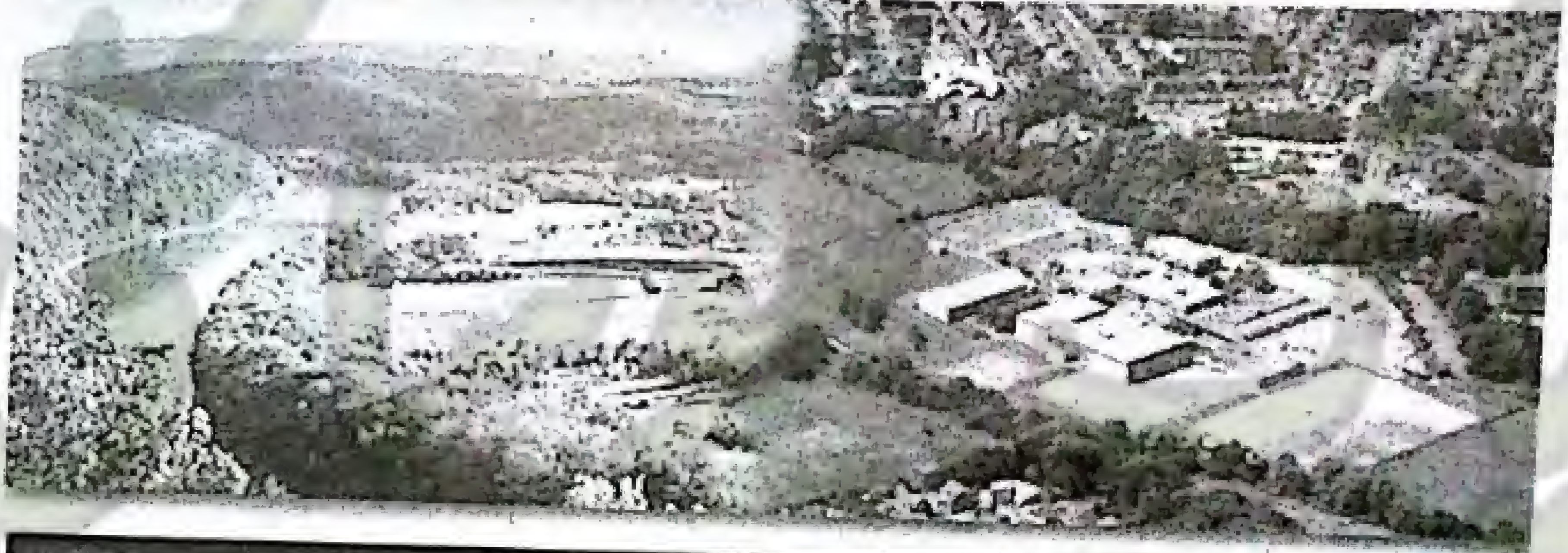



''یہ سٹی ہال ہم نے 1873ء میں بنایا تھا۔''
یہ جین کی آواز ہے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں۔ سفر شروع ہونے والا ہے۔ ہمارے دائیں ہاتھ سٹی ہال ہے۔ ایسا ہی ہال ہم نے مانچسٹر میں دیکھا ہے۔
''یہ تو مانچسٹر کے سٹی ہال کی نقل ہے۔''
''نہیں مانچسٹر والوں نے ہماری نقل کی ہے۔ ہم نے اپنا ہال پہلے بنایا تھا۔''
یہ ماریہ بول رہی ہے حالانکہ اسے ڈرائیور کو راستہ بتانا ہے لیکن مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑی ہے اس لیے کم سخت اور خاموش طبع جین کی جگہ ماریہ کا بولنا ضروری ہے ورنہ بریڈفورڈ مانچسٹر سے پیچھے رہ جائے گا۔
''ہمارا پتھر انہوں نے استعمال کیا۔ مانچسٹر والے تو ہر چیز میں ہماری نقل کرتے ہیں۔''
ماریہ کے لہجے سے معلوم ہو رہا ہے کہ دونوں شہروں کے درمیان کیسا مقابلہ ہو رہا ہے اور بھی کئی عمارتوں میں کئی معاملات میں وہ مانچسٹر پر نقل کا الزام لگا رہی ہے۔ لیکن جب ہم پوچھتے ہیں کہ مانچسٹر والوں کو 2000ء میں اولمپک کی میزبانی ملنی چاہیے۔''
پھر اس کی گہری بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ جاتی ہے۔ وہ مانچسٹر کے حق میں ہو جاتی ہے۔

بریڈفورڈ کی سڑکیں تیزی سے گزر رہی ہیں۔ اس کے مضافات پہاڑوں پر بسے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں تو گلیاں درختوں سے بالکل ڈھک جاتی ہیں۔ یہ ہماری کنٹری کورٹس ہیں، سول عدالتیں۔ یہ کراؤن کورٹس ہیں، سیشن عدالتیں۔
وقار لین، جرمنوں کی آبادیاں، جرمن چرچ۔
یہ شہر خوشاں ہے۔ ختم ہونے میں نہیں آ رہا ہے۔
''جین! یہ تو بہت بڑا قبرستان ہے۔''
''یہ تقریباً 26 مربع ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔''
یہاں جرمنوں کی بھی آخری آرام گاہیں ہیں۔ اسی قبرستان میں مسلمانوں کی تدفین کے لیے بھی جگہ ہے۔ یہ قبرستان سیاحوں کے لیے کشش بھی رکھتا ہے اور اہتمام بھی۔ گائیڈ اور مترجم کا بھی انتظام ہے۔ اہم تاریخی قبروں تک پہنچنے کے لیے راستے بھی بنے ہوئے ہیں۔
''یہاں بدروحوں کی بھی کہانیاں مشہور ہیں۔'' ہم میں سے کسی نے پوچھا ہے۔ ماریا کہہ رہی ہے۔
''سنا ہے لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''
''بریڈفورڈ آخر کوئی کیوں آئے'' ہم میں سے کسی نے سوال کیا۔

''ماریا سے ملنے کے لیے۔'' ہم میں سے کسی نے کہا ہے۔
ماریا خلوص سے شکریہ ادا کر رہی ہے اور کہتی ہے ''بریڈفورڈ اپنی صنعتی تہذیب کے لیے مشہور ہے۔ کئی صدیوں کی صنعتی میراث، اون کا گھر، اون کے پارچہ جات''
ماریا حسن بے خبر نہیں ہے۔ نہ جانے اب تک کتنے سیاحوں کو بریڈفورڈ کی بو قلمونیوں سے آگاہ کر چکی ہوگی۔ وہ عام قسم کی گائیڈ نہیں ہے۔ بلکہ ٹورزم اینڈ کانفرنس آفیسر ہے۔ بریڈفورڈ اکنامک ڈیویلپمنٹ

1796ء میں بھاپ کی قوت سے کپڑا تیار کرنے کے کارخانوں کی ابتدا ہوئی۔ اس وقت بریڈفورڈ میں آبادی 6 ہزار تھی۔ 1780ء سے 1850ء کے درمیان پورے برطانیہ کی آبادی تو 130 فیصد کی شرح سے بڑھی لیکن بریڈفورڈ کی آبادی میں 1000 فیصد کی شرح سے اضافہ ہو رہا تھا۔
بریڈفورڈ کی ٹیکسٹائلز کو رنگینی اور دلکشی اس وقت ملی جب برصغیر کے محنت کشوں کی ذہانت اور استعداد کے رنگ اس میں شامل ہوئے۔
دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرقی یورپ، جزائر کیریبین



بریڈفورڈ کے قریب وادیوں کا ایک منظر

یونٹ کی مارکٹنگ ٹیم کی رکن۔ اس ٹیم میں اس کی ایک بہن جینا گلوٹ بھی ہے۔ وہ بھی ٹورزم اینڈ کانفرنس آفیسر ہے۔ جین وڈال میڈیا ریلیشنز آفیسر۔ ہم جیسے صحافی سیاحت پر آئیں تو میڈیا ریلیشنز آفیسران کی رہنمائی کرتے ہیں۔ گیری وڈ صاحب ہیں، وہ مارکیٹنگ انفارمیشن آفیسر ہیں۔ ایک ڈیبی کریکٹین ہیں خاتون، وہ سینئر پروموشن آفیسر ہیں۔ جینی ہیلنی، ٹورزم آفیسر، مائیک کولام، مارکیٹنگ منیجر۔
بریڈفورڈ ہینری ہشتم کے دور سے ہی ٹیکسٹائل کا مرکز تھا۔ 1760ء میں بھی اس علاقے میں سوت کا تنا اور کپڑا بننا چھوٹے پیمانے پر عام تھا۔ ہاورتھ اور سٹین بری جیسے گاؤں اس کے لیے مشہور تھے۔ بہت سے گھروں میں کھڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ کھٹ کھٹ کی آواز آتی رہتی تھی۔ چھوٹے آڑھتی یہاں سے تھوڑا تھوڑا کپڑا خریدتے اور بریڈفورڈ اور ہالی فیکس کے بازاروں میں لا کر بیچتے تھے۔

اور برصغیر کے تمام حصوں سے اہل ہنر پہنچنے لگے۔
بریڈفورڈ والے بھی ایشیا کی ہنرمندی کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایشیا کی فیبرکس میں ڈیزائن، رنگوں کے شیڈز اور کشش زیادہ تھی۔ ریشم، بروکیڈ، ساٹن، اور نہ جانے کیا کیا۔ سب نے بریڈفورڈ میں ڈیزائنوں کی قوس وقزح سجادی، رنگ بکھیر دیے اور بریڈفورڈ کہکشاں کی طرح جگمگا اٹھا۔
''یہ لٹل جرمنی ہے۔''
جین بتا رہی ہے۔
بریڈفورڈ کی مصنوعات کی سب سے بڑی مارکیٹ ایک زمانے میں جرمنی تھا۔ متعدد جرمن تاجر اپنا ملک چھوڑ کر اسی شہر میں آبسے اور اپنی تجارت میں مصروف ہوگئے۔ 1861ء میں بریڈفورڈ میں وورسٹڈ تیار کرنے والوں میں 40 فیصد جرمن تھے۔ وہ یہیں آباد ہوگئے، اس لیے یہ علاقہ اس وقت سے 'لٹل جرمنی' کہلاتا ہے۔
بریڈفورڈ میں بھی ایسے ٹیلرز ہیں جنہیں آپ ناپ

دیں تو ایک دو گھنٹے میں آپ کو سوٹ پینٹ سی کر دے دیں گے۔ ماریا بتا رہی ہے کہ جو سوٹ آپ کو یہاں 200 پاؤنڈ میں سلا سلایا مل جائے گا لندن میں اس کی قیمت کم از کم 1500 پاؤنڈ ہوگی۔''

یہاں انہوں نے ایک کشش 'مل شاپنگ' کے نام سے رکھی ہے۔ ملوں کے ساتھ ساتھ ان کی رعایتی شاپس واقع ہیں، جو یہاں آپ کی سیاحت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اگر آپ کا گائیڈڈ ٹور ہے تو ایسی شاپنگ اس کا ضروری جزو ہے۔ ان شاپس میں آپ کو چھوٹی سے چھوٹی چیز جیسے جراب، ٹائی سے لے کر کمبل، بیڈ شیٹس تک مل جائیں گی۔ اون اور کاٹن دونوں کی مصنوعات دستیاب ہیں۔ پہلے سے آپ اپنی پسند بتا دیجیے۔ جوتے بھی ہیں، کھلونے بھی، تولیے، تکیے بھی۔

یہ بھی ایک ایسی ہی شاپ ہے۔

سوٹنگ، ٹائی، سویٹر، سٹاکنگز، جمپر، اسکرٹ، جرابیں، سب کچھ دستیاب ہے۔

یہاں سے کچھ خریدیں یا شاپنگ لندن میں کریں۔

خالد عزیز برطانیہ کے ایکسپرٹ ہیں۔ ہر سال دو تین چکر ضرور لگاتے ہیں۔

ان کا مشورہ یہ ہے کہ اگر کچھ لینا ہے تو یہیں سے لے لیں۔ لندن اس سے کہیں زیادہ مہنگا ہے۔ خود ماریا اور جین بھی کچھ خرید رہی ہیں۔

بریڈ فورڈ اکنامک یونٹ نے مل شاپنگ پر باقاعدہ گائیڈ شائع کر رکھی ہیں۔ اکثر شاپس سے ان کا باقاعدہ رابطہ ہے۔

بعض اوقات سیاحوں کے گروپ ایسے وقت آتے ہیں جو اوقاتِ کار نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ طے ہے کہ اگر پہلے نوٹس دے دیا جائے تو یہ دکانیں خاص طور پر کھول دی جاتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مل شاپوں پر صرف قریبی یا ملحقہ ملوں کی مصنوعات ہی ملیں۔ برطانیہ کے دوسرے حصوں یارک شائر یا اسکاٹ لینڈ میں تیار کردہ چیزیں بھی ان شاپس پر مل سکتی ہیں۔

☆......☆......☆

بن بیاہ رفاقتیں

یہ علاقہ ہے ان تڑپتی روحوں کا جو زندگی بہت کم پاتی تھیں۔ لیکن ناول لازوال لکھ گئیں۔

اب ہم بلندیوں کی طرف رواں ہیں۔ بریڈ فورڈ کی بستیاں ہم سے بہت نیچے پھیلی ہوئی ہمیں واپس بلا رہی ہیں۔ سڑکیں کچھ تنگ ہو رہی ہیں۔

''خبردار گھوڑے آرہے ہیں۔''

ایک نشان ہمیں خبردار کر رہا ہے۔ ہم ایک صنعتی عجائب گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ پہلے ان ملوں کے لیے کوئلہ گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے آتا تھا۔ کپڑا وغیرہ لے جانے کا ذریعہ بھی یہی گاڑیاں تھیں۔ اب جہاں اور تمام چیزوں کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ گھوڑا گاڑیوں کو بھی محفوظ کیا گیا ہے۔ گھوڑے ظاہر ہے کہ بدلنے پڑتے ہیں۔ وہ تو زندہ چیزیں ہیں۔ یہ گھوڑے اب بھی ایک چھکڑا لے کر چلتے ہیں۔ سامان کے لیے نہیں نمائش کے لیے۔ انگریز انہیں دیکھ کر اپنی تاریخ کو یاد کرتے ہیں۔

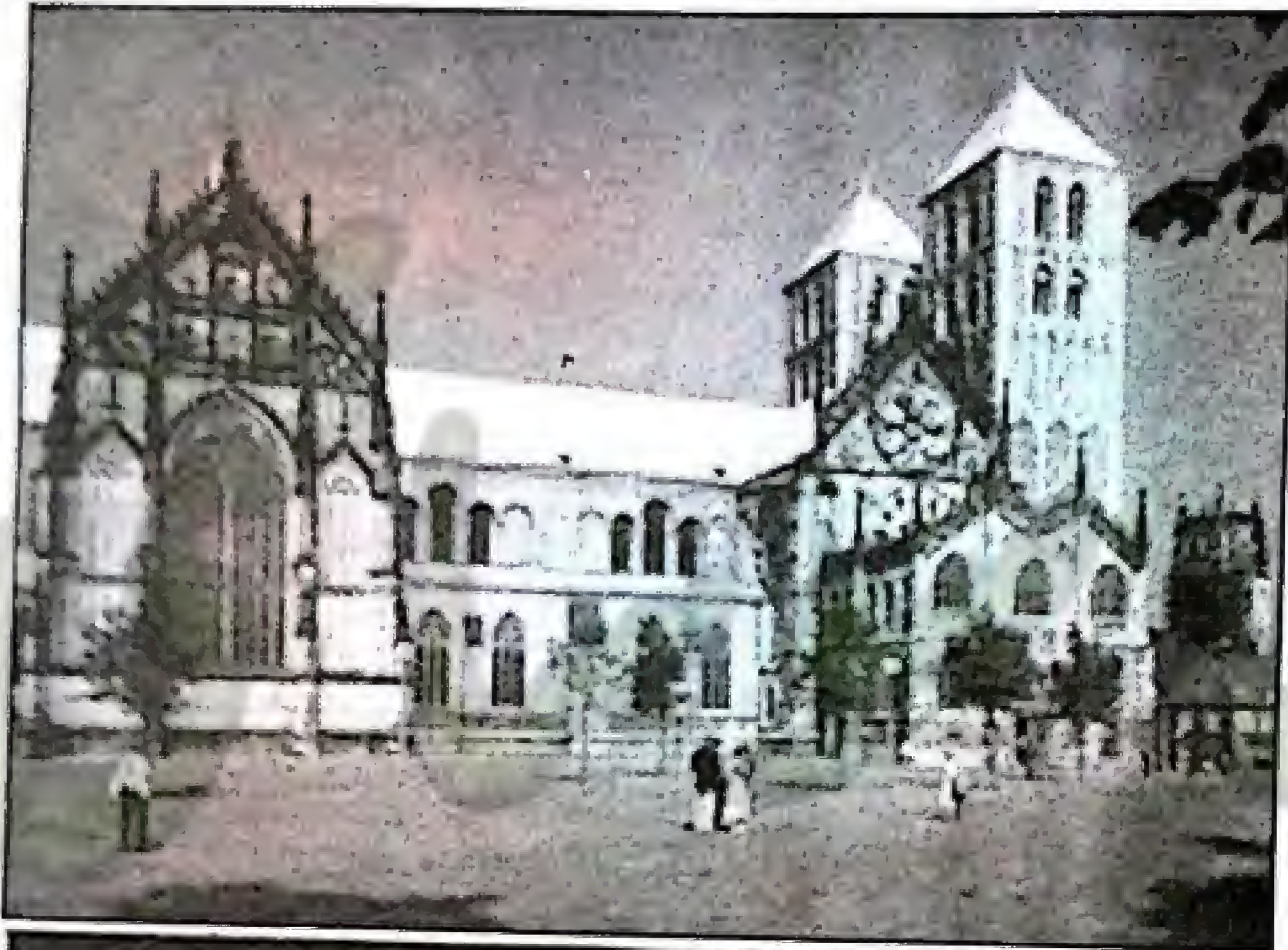
یہ سیمسن ہے، بادامی رنگ کا تنومند، اپنی ڈیلائیلہ کی یاد میں گم ہے۔

یہ نارمن صاحب ہیں۔ یہ کوئی زیادہ انگریز معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ ہم کالوں کی طرف دیکھنا گوارا کر رہے ہیں۔ بین خود مشکی ہے۔ یہ سب سے زیادہ صحت مند اور مہنگا معلوم ہوتا ہے۔ ان سب کو دیکھنے کا ٹکٹ ہے۔ ان کے اوقات کار مقرر ہیں۔ اگر آپ ان لمحوں میں آئیں تو انہیں گاڑی میں جتا بھی دیکھ سکتے ہیں۔

یہ گھوڑے اسی انڈسٹریل میوزیم کا حصہ ہیں۔ 1820ء سے 1925ء تک کا دور یہاں محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ اُس دور کے کارکنوں کے گھر ہیں۔ دو کمروں کے گھر۔ چیزیں محفوظ رکھی گئی ہیں۔ جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ کیسے رہتے تھے۔ ماریا یہ چھوٹے چھوٹے مکان دکھانے پر اصرار کر رہی ہے۔ کیوں کہ اس کا بچپن ایسے ہی مکانوں میں گزرا ہے۔ اس کی ماں نے ایسا ہی کاٹیج خریدا تھا۔ اس کی ماں ایک محنت کش ہی تھی۔ مور سائڈ روڈ پر ایک عجائب گھر ماریا کو اپنا بچپن یاد دلا گیا ہے۔ اس نے اپنی عمر بھی بتا دی ہے۔ وہ 1953

ء میں پیدا ہوئی تھی۔اب چالیسویں سال میں ہے۔یہ چھوٹے چھوٹے مکان غریبوں کے ہیں۔اندر نہیں جا سکتے باہر سے یہ لوگ کیسے رہتے ہوں گے۔مختصر سا خاندان، مختصر سا سامان۔چھوٹی سی جگہ میں ایسے ہی تین چار مکان موجود ہیں۔مل کے اس طرف ایک امیر گھر بھی اسی طرح محفوظ کیا گیا ہے پہلے مل دیکھ لیں۔پھر امیر آدمی کے گھر کی زیارت کرتے ہیں۔ویسے بھی ماریا کی بے تابی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ امیر کا گھر ابھی مقفل ہے۔اس گھر کا نگراں جلدی لنچ کرنے چلا گیا ہے۔

یہ پہلے بھی ایک کارخانہ ہوتا ہوگا جہاں اب صنعتی عجائب گھر بنایا گیا ہے۔ٹرام بھی موجود ہے۔بس بھی ہے۔قالین بننے کی کھڈی بھی ہے۔اور ٹیکسٹائل مل کی مشینری بھی۔یہاں دیہاتی لوگ بھیڑیں کیسے پالتے تھے۔ان سے اون کیسے حاصل کرتے تھے۔



بریڈفورڈ کا جرمن چرچ

یہ ایک پرانا ریلوے انجن ہے۔انہوں نے اسے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ہمارے ہاں تو یہ اب تک ریل گاڑی اور مسافروں کو کھینچتا ہے۔انگریز اِن چیزوں سے جلدی مایوس ہو جاتا ہے۔

یہ سائیکل ہے۔جو مسٹر واکر قصائی کی ہے۔گزشتہ صدی میں اور اس صدی کے آخر میں قصائی سائیکلوں پر گوشت لے کر بیچنے آتے تھے۔

موٹر کاریں زیادہ پرانی نہیں ہیں۔ایک گاڑی 1953ء کی ہے یہ گاڑی عجائب گھر میں رکھ دی گئی ہے۔1953ء کی ماریا ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔

خبر ملی ہے کہ امیر کا گھر کھل گیا ہے۔یہ بھی ایک انقلاب ہے کہ امیر گھرانے کے دروازے ہم جیسے غریبوں کے لیے کھل جائیں۔

ایک فرنگی قمیص اور پینٹ میں ہمارا منتظر ہے۔

یہ ہے وہ امیر شخص جس کا یہ مکان ہے۔

اس شخص کو شاید اپنے آپ کو امیر شخص کہلوانا اچھا نہیں لگا ہے۔وہ فوراً پکار اٹھا ہے۔''نو۔نو۔یہ میرا گھر نہیں ہے۔''

1870ء سے 1940ء تک امیر لوگ کیسے رہتے تھے۔دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک نشست گاہ۔اس کمرے میں ایک چھوٹی سی بار ہے۔برانڈی، شمپین کی بوتلیں۔جنہیں مکڑی کے جالوں نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔بار کاؤنٹر، صوفے۔دوسری طرف ڈائننگ روم۔طویل میز کے گرد کرسیاں۔

وہ شخص جو اپنے آپ کو امیر نہیں کہلوانا چاہتا تھا، وہ ایک بکس اٹھا کر لایا ہے۔

''بتائیے یہ کیا ہے؟'' ہم سب کچھ نہ کچھ بتا رہے ہیں۔لاکر، سگار بکس۔

وہ کہتا ہے کہ یہ ٹی بکس ہے۔اس میں امراء چائے رکھتے تھے۔اُس دور میں چائے بہت مہنگی ہوتی تھی۔بڑی دور سے آتی تھی اس لیے انتہائی احتیاط سے سنبھال کر رکھی جاتی تھی اور بہت ہی خاص مہمانوں کے لیے تیار کی جاتی تھی۔''

امیر گھرانے کی خواب گاہیں بھی دیکھیں۔

یہاں ہمیں اپنے گردو پیش سب مارکسٹ محسوس ہو رہے ہیں۔وہ کہہ رہے ہیں امیر اور غریب کی زندگی میں اُس دور میں اتنا زیادہ فاصلہ نہ ہوتا تو کیمونزم کیوں

آتا؟ غریب لوگ کتنی محنت کرتے تھے اور کتنی مشکل سے رہتے تھے۔ امیر لوگوں کو کتنی سہولتیں میسر تھیں۔

عجائب گھر کے ساتھ ساتھ ایک مل شاپ بھی ہے۔ باہر فرش اور راستوں پر قدیم دور کی اینٹیں اسی طرح لگی ہوئی ہیں تاکہ گزشتہ صدی کی طرح ماحول قائم رہے۔

اینٹوں سے صدیاں جھانکتی ہوئی۔

دیوار پر جمی کائی برف کی یاد دلاتی ہوئی۔

کچھ اور بلندیاں، سبزے میں لپٹی ہوئی وادیاں۔

یہ سالٹیر گاؤں ہے

ایک دریا کے کنارے۔ وکٹورین دور میں ایک مل کے مالک تھے۔ ٹائٹس سالٹ اور دریا کا نام ''ایئر'' دونوں مل کر سالٹیر ہو گئے۔ سالٹ صاحب کی بہت دلکش شخصیت تھے۔ شہر کے امیر ترین کارخانے دار، سب سے زیادہ کارکن ان کے ہاں کام کرتے تھے۔ مل مالک ہونے کے باوجود انہیں اپنے کارکنوں کی بہبود اور رہن سہن کا بہت خیال تھا۔ انہوں نے گاؤں آباد کیا تو اس میں اسکول، اسپتال، دکانیں، پارک سب کچھ ہی بنایا۔

ماریا بتا رہی ہے کہ سالٹ اپنے گاؤں میں رہنے والوں کے طرزِ زندگی کے بارے میں بہت بااصول تھا۔ سب کی شراب نوشی پر اس نے سخت پابندی عائد کر رکھی تھی۔ گاؤں والے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے ایک دوا فروش سے ایسی دوائیں لیتے تھے جن میں الکحل شامل ہوتی تھی۔

۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

سالٹ صاحب نے پورے گاؤں کے لیے ایک اجتماعی لانڈری قائم کر رکھی تھی۔ اس لیے وہ پسند نہیں کرتا تھا کہ لوگوں کے گھروں کے پیچھے بھی کپڑے دھل کر سوکھنے کے لیے لٹکے ہوں۔ وہ اپنی جیب میں قینچی لے کر چلتے تھے جہاں کپڑے لٹکے نظر آتے وہ رسی کو کاٹ کر پھینک دیتے۔

سالٹیر 1851ء میں آباد ہوا۔ اس وقت بریڈفورڈ دنیا میں اون کا صدر مقام کہلانے لگا تھا۔ اسی لیے سالٹ نے کارکنوں کی فلاح و بہبود کے لیے یہ نئی بستی دریا کے کنارے آباد کی۔

سالٹ مل کا افتتاح سالٹ صاحب کی پچاسویں سالگرہ 1853ء میں ہوا، جس میں ایک ہزار تکلے تھے اور تیس ہزار گز کپڑا تیار ہوتا تھا۔ اب جہاں ہم خوبصورت تصویروں اور پینٹنگز کو دیکھ رہے ہیں اور اب جس کا نام '1853ء گیلری' ہے۔ کبھی یہی سالٹ مل تھا۔ اب یہاں بریڈفورڈ کے نامور فرزند اور عظیم عالمی آرٹسٹ 'ڈیوڈ ہوکنے' کے فن پارے دنیا میں سب سے زیادہ تعداد میں یہاں موجود ہیں۔ یہاں تصاویر اور پینٹنگز فروخت کے لیے بھی موجود ہیں۔

اس وقت بھی ہال شائقین سے بھرا ہوا ہے۔

مختلف ممالک سے آئے ہوئے سیاح گھوم رہے ہیں اور آرٹسٹوں کے شاہکار دیکھ رہے ہیں۔ سال بھر میں آنے والے سیاحوں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی ہے۔ سالٹ تو تھا ہی عظیم جس نے گاؤں آباد کرتے وقت انسانوں کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھا لیکن وہ لوگ عظیم تر ہیں جنہوں نے اس مل کو ایک آرٹ گیلری میں تبدیل کر دیا اور اُسے ایک عجائب گھر کی طرح دنیا بھر کے لوگوں کے لیے کھول دیا۔ اس عمارت نے پہلے بریڈفورڈ کو خوشحالی دی۔ دنیا کو پیرہن بخشا، کارکنوں کو تحفظ فراہم کیا۔ اب یہ فنونِ لطیفہ کے تشنگان کی پیاس بجھاتی ہے۔

سامنے ہی ایک پُرشکوہ گرجا گھر ہے۔ اس کی اطراف پارکنگ کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔

خیال یہ ہے کہ لنچ کچھ جلدی کر لیا جائے اس کے بعد ایک طویل سفر پر روانہ ہونا ہے۔

ماریا کے پاس ہر مسئلے کا فوری حل موجود ہے۔

یہاں ساتھ ہی Beties eating emporium یعنی بٹی کی شاہی طعام گاہ۔

ان کی خصوصیت یہ ہے کہ سب کچھ تازہ بنتا ہے۔

یہ کیک، مٹھائی کے لیے بھی مشہور ہیں۔

ماریا اور جین تو تھیں ہی اب اضافہ ہو گیا سارہ کا۔

ویسے تو اسے ویٹرس کہنا چاہیے لیکن یہاں ماحول بالکل ایک گھر جیسا ہے۔ جیسے ایک خاندان کے کچھ افراد کھانا کھا رہے ہیں۔ کچھ لا رہے ہیں۔ کوئی چیز اچھی لگی، نہیں لگی، دوسری لے آتے ہیں۔ نیچے سے ایمپوریم کی

مالکہ بھی پوچھنے آجاتی ہے۔ کھانے کے انتظار میں برطانیہ کی نئی نسل کی بات شروع ہوگئی ہے۔ نئی اور پرانی نسل کی کشمکش بھی یہاں ہے۔ بے روزگاری زیادہ ہو رہی ہے۔ 38 افراد کے لیے ایک ملازم ہے۔ پہلے سے یہ فاصلہ زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ سارہ کو شکایت ہے کہ بریڈفورڈ میں کچھ زیادہ اچھے نائٹ کلب نہیں ہیں۔ پھر ویسے بھی یہاں وقت نہیں ملتا ہے۔ مزہ تب ہی ہے ہفتے کے اختتام پر کسی کے ساتھ نائٹ کلب جایا جائے اور کچھ گھنٹے تو دنیا کو بھول کر ایک دوسرے کی بانہوں میں وقت گزار دیا جائے۔ جین اس گفتگو میں شریک نہیں ہوتی ہے۔ وہ صرف زیرلب مسکراتی رہتی ہے۔ اسے اپنے خانگی امور کے باعث موقع ہی نہیں ملتا کہ کچھ سوشل بھی ہو سکے۔ ماریا، سارہ سے خوب بحث کررہی ہے۔ اپنے سب ساتھی بھی اس گفتگو میں سرگرمی سے شریک ہیں۔ اپنی اپنی محرومیاں ستا رہی ہیں۔ باہر درختوں کے پتے رنگ بدل رہے ہیں۔ ماحول کچھ اداس ہورہا ہے۔

سارہ کو ہم پاکستانیوں کو دیکھ کر اپنا ایک پاکستانی دوست یاد آرہا ہے جو ہوٹلنگ اور کیٹرنگ کے ایک کورس میں اس کے ساتھ تھا۔ سارہ کی آنکھوں میں کوندتی چمک بتا رہی ہے کہ یہ پاکستانی کوئی خاص ہی تھا۔ اسے پیا ملن کی آس تھی کیوں کہ دسمبر میں وہ لندن آرہا ہے وہ بھی چھٹی لے کر لندن چلے جائے گی۔ کرسمس کے دنوں کا مزہ لندن میں ہی ہے۔

کھانا تازہ ہے، اچھا ہے۔ خاص طور پر پکایا گیا ہے۔ بیٹی والوں کا اصرار ہے کہ ہم ان کے تیار کردہ وہ خصوصی کیک بھی کھائیں جو پورے برطانیہ میں مشہور ہیں۔ ماریا کا کہنا ہے کہ ہمیں دیر ہو جائے گی۔ بات تو ہمیں ماریا کی ہی ماننی پڑے گی۔ سارہ بھی اس وقت اگر کچھ کہے تو ہم میں سے اکثر اس کے جنبش ابرو پر بھی سرخم کرسکتے ہیں۔ لیکن اس سرو قامت غزال چشم کو ابھی کچن پر آنے والوں کی خدمت کرنا ہے۔ ابھی اس کی ڈیوٹی چل رہی ہے۔

ہم میں سے کوئی پوچھ رہا ہوگا۔ اپنے پاکستانی ''ماہی'' کا پتا بتا دو۔ اسے کچھ کہنا ہو، کوئی پیغام ہو تو ہمیں بتا دیں ہمیں خوشی ہوگی۔ وہ اپنے تعلق خاطر کو عام نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے نامہ بر کو درمیان میں نہیں لانا چاہتی۔

سارہ ابھی غیر شادی شدہ ہے۔ ابھی وہ پیسے جمع کر رہی ہے۔ ایک دو برس بعد وہ شادی کے بارے میں منصوبہ بنائے گی۔

ماریہ شادی کے بندھن کی قائل نہیں وہ کہہ رہی ہے یہ ایک جھنجھٹ ہے۔ شادی صرف نسل بڑھانے کے لیے ہی کی جاتی ہے۔ اس کے پاس بھی ایک بیٹا ہے۔ خوبصورت، نوجوان 15 سالہ۔ وہ اور اس کا محبوب اکٹھے رہتے رہے ہیں یہ بیٹا اسی ہمدمی کی نشانی ہے۔ اب وہ اکیلی رہتی ہے۔ کوئی الجھن نہ کوئی غم۔ بیٹے کا باپ اپنی جگہ خوش ہے۔ وہ اپنی جگہ خوش ہے۔

ماریا کی طرح اس کی نسل کے اور بہت سے نوجوان اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس طرز زندگی کو یورپ میں Co-habitation کہتے ہیں۔ اس میں بھی اختلاف، جھگڑے ہوتے ہیں۔ علیحدگی ہوتی ہے لیکن کوئی قانونی کاروائی نہیں ہوتی۔ ماریا جیسی آزاد خیال لڑکیاں اور لڑکے اس طرز زندگی کو زیادہ ترجیح دے رہے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اگرچہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی اعلیٰ طبقے میں یہ کسی نہ کسی کی شکل میں موجود ہے۔ نوجوان اگرچہ اس طرح زندگی نہیں گزار سکتے۔ لیکن بڑے لوگ یہ طرز زندگی اختیار کر رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یورپ میں ایسا گر ہے تو صرف ایک کے ساتھ، وہاں یہ نہیں ہے کہ ایک منکوحہ گھر میں موجود ہے۔ اور دوسری کو ویسے رکھا ہوا ہے۔ وہاں بھی جو رفاقت ہے ایک ہی ہے چاہے باقاعدہ شادی کے ذریعے یا ہمدمی کے ذریعے۔

ہمارے پوچھنے پر ماریا بتا رہی ہے کہ اسے اپنے معاشرے میں اس ذریعے سے صاحبِ اولاد ہونے پر شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بیٹے اور اس کے درمیان وہی رشتہ اور محبت ہے جو شادی کے ذریعے ہونے والے بیٹے سے ہوسکتی تھی۔

''کیا یہ بیٹا اسکول اور دیگر مقامات پر اپنی ولدیت

وہی لکھوا سکتا ہے۔"

"جی کیوں نہیں۔"

"جائیداد، وراثت میں کیا ہوتا ہے۔"

"ایسا کوئی مسئلہ نہیں اٹھا ہے۔ یہ مرضی پر منحصر ہے۔ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔" اس ٹھہرانے کے دوران ہم نے کتنے برسوں کے فاصلے طے کر لیے ہیں۔

چلتے چلتے ہم اپنی سویٹ ڈش ساتھ لے کر چل رہے ہیں کہ راستے میں کھاتے جائیں گے۔

پھر ہمارے سامنے وادیاں اپنی پوری رعنائیوں اور دلربائیوں سمیت پھیلی ہوئی ہیں۔ خالد عزیز ہمیں اور بلندیوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہماری منزل ہاروتھ ہے۔

سڑک کے ساتھ ساتھ گلاب کھلے ہیں۔ گھاس اس طرح سر اٹھا رہی ہے۔ جیسے نیزے۔

یہ بلندیاں اور وادیاں کچھ دیکھی بھالی لگتی ہیں۔ یہ منظر جانا جانا سا کیوں ہے۔ پہلے ادھر ہمارا آنا تو نہیں ہوا ہے۔ شاید فلموں میں دیکھا ہو۔

اب ایک خطرناک چوراہا۔

ہم بالکل سیدھے ڈھلوان پر اتر رہے ہیں اور سامنے دونوں طرف ٹریفک رواں دواں ہے۔ یہ مرحلہ بھی گزر گیا ہے۔ ماریا ڈرائیونگ کی تعریف کر رہی ہے۔ خالد عزیز پھولے نہیں سما رہے ہیں۔

جین بتا رہی ہے کہ یہ برانٹے سسٹرز کا علاقہ ہے۔ انگریزی کے شہرہ آفاق کلاسیکی ناول Wuthering Heights کی سرزمین یہ ناول انہی وادیوں کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔

اب یاد آیا ہے کہ یہ منظر جانا کیوں لگ رہا تھا۔ یہ فلم بھی ہم نے دیکھی ہے۔ یہ ناول بھی کتنی بار پڑھا ہے۔

وہ تمام مناظر اسی طرح برقرار رکھے گئے ہیں کہ لگتا ہے۔ ہم اسی دور میں گھوم رہے ہیں۔ ابھی یہاں سے ناول کا ہیرو گزرے گا۔ ابھی برونٹے سسٹرز میں سے کوئی آ جائے گا۔

"اصطبل کرائے کے لیے خالی ہے۔"

اصطبل اس تہذیب میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔

برونٹے پرسنیج کے قریب گاڑیاں پارک ہوتی ہیں۔

یہ علاقہ ہے اُن تڑپتی روحوں کا جنہوں نے انیسویں صدی کے چند عظیم ناول لکھے۔ برونٹے سسٹرز تین تھیں شارلٹ، ایملی اور این۔ "جین آئر ودرنگ ہائٹس" جیسے ناول انہی کی تخلیق ہیں۔

پورا شہر بسا ہوا ہے۔ جگہ جگہ ان کی یادوں کے نقوش ملتے ہیں۔ کتنی محبت کرتے ہیں یہ لوگ اپنے اہلِ قلم سے۔ ایک ایک نقش کو محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ چوڑی چوڑی اینٹوں والی گلیاں اب بھی اسی طرح ہیں۔

برونٹے خاندان کے لوگ بہت کم زندگی پاتے تھے۔ پہلی بیٹی گیارہ سال کی عمر میں فوت ہوگئی تھی۔ تپ دق سے۔ یہ 1814ء کی بات ہے۔ دوسری بیٹی ایلزبتھ برونٹے کو صرف دس سال جینے کو ملے۔

پھر اس خاندان نے گھر بدل لیا۔ باقی چار بچے یہاں پیدا ہوئے جن میں شارلٹ، ایملی، اور این اور اکلوتا بھائی برین ول شامل ہے۔ شارلٹ نے چار ناول لکھے جین آئر، شرلے، ویسٹ، پروفیسر۔

برین ول اکیلا بھائی تھا۔ بہت ذہین، حساس، لیکن وہ بعد میں افیم اور شراب کا رسیا ہو کر رہ گیا۔ ایملی برونٹے چوتھی بیٹی تھی۔ یہ بہت زیادہ گم صم رہتی تھی۔ نظمیں بھی لکھیں اور مشہور ناول "ودرنگ ہائٹس" بھی اس کی تخلیق ہے۔ جس میں انسانی جذبات کو بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ہیرو ایک محنت کش خاندان سے ہے جسے اشرافیہ طبقے میں ناپسند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک لازوال محبت کی، بے مثال کہانی ہے۔

این برونٹے۔ پانچویں بیٹی مذہبی جذبات رکھتی تھی۔ اس نے روحانی شاعری کی، دو ناول لکھے۔ "ایگنیز گرے" اور "دی ٹیننٹ آف وائلڈ فیل ہال۔"

اس خاندان کی زندگی پر باقاعدہ تحقیق کی گئی ہے۔

یہ بھی دریافت کیا گیا ہے کہ یہ خاندان جب تھارنٹن سے ہاروتھ منتقل ہوا تو کتنے چھکڑوں میں سامان آیا تھا۔

یہ خاندان جس گھر میں منتقل ہوا تھا ہمارے سامنے اس کا نام ہے Theparsonage جارجین طرزِ تعمیر کا مظہر پرسنیج 1779ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن اسے

شارلٹ نے مزید خوبصورت اور جدید شکل دی۔ 1850ء میں شارلٹ مشہور بھی ہو چکی تھی۔ اب پرسنیج براونٹے سوسائٹی کی ملکیت ہے اور عجائب گھر کی معیشت سے مرجع خاص و عام ہے۔ ہر سال بڑی تعداد میں یہاں سیاح آتے ہیں۔ ہاروتھ گاؤں کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ سیاح ہی ہیں۔ دکانوں پر برونٹے سسٹرز کی کتابیں، تصویریں اور دیگر تحائف انہی کے حوالے سے فروخت ہوتے ہیں۔

تینوں بہنوں نے اپنے ناولوں میں اسی غم زدہ زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں، جس کے برفیلے تھپیڑے انہیں برداشت کرنے پڑے۔ قدرت اس زمانے میں ان علاقوں میں اتنی مہربان نہیں تھی۔ تپ دق عام تھی۔ کبھی کبھی ہیضے کی وبا پھوٹ پڑتی تھی۔ اور زندگی سے موت کا فاصلہ مختصر ہوتا رہتا تھا۔ اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی ان بہنوں کو ابتداء میں مایوسی کی حالت کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ ناول تو ان کی موت کے بعد بھی شائع ہو سکے۔

برونٹے سسٹرز کی یادیں اب بھی ماحول کو اداس کر رہی ہیں۔ ان کی روحیں دیکھتی تو ہوں گی۔ اب ایک صدی سے کتنے ادب کے دلدادہ انہیں خراج عقیدت پیش کرنے آتے ہیں۔ امریکہ سے، یورپ سے، ایشیاء سے فلمیں دیکھنے والے، ناول پڑھنے والے ان دکھی ناول نگاروں کی عظمتِ فن کو سلام پیش کرنے آتے ہیں۔

عجائب گھر میں ہر چیز سلیقے سے محفوظ ہے۔ ساتھ ہی ہاورتھ پارش چرچ ہے۔ رومانی رنگوں اور نقوش کا مرقع۔

شام ڈھل رہی ہے۔ ہمیں واپس بریڈ فورڈ پہنچنا ہے۔ ان ہی بل کھاتی تنگ تنگ سڑکوں سے۔ اس لیے ماریا اور جین کا اصرار ہے کہ اب دیکھنے کا سلسلہ روکا جائے۔ چند تصویریں تو بنا لیتے ہیں۔ کون جانے ادھر برونٹے سسٹرز کی قربتوں میں آنے کا موقع دوبارہ ملے یا نہیں۔ یہ بلندیاں پھر ہمارے مقدر میں ہوں یا نہیں۔

سرسبز وادیاں ہمیں الوداع کہہ رہی ہیں۔ مرغزاروں میں گھوڑے گھاس چر رہے ہیں۔ کہیں کہیں بھیڑیں بھی رنگوں میں اضافہ کر رہی ہیں۔

ایک موڑ پر تو نظارہ دامن دل اس طرح کھینچتا ہے کہ ہم رکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سڑک کے ساتھ نوکیلی گھاس ہمارے برابر کھڑی ہونے کو بے تاب ہے۔ آگے سرسبزے میں لپٹی وادیاں ہیں اور نیچے ایک جھیل آئینے کی طرح اس سارے نظارے کے عین قلب بھی ہوئی ہے۔ درخت ہر طرف سر اٹھائے ہوئے ہیں ایک عجیب سکوت ہے۔ حسن ہے۔ رومان ہے۔ ایسے ماحول میں تو نظمیں، غزلیں خود ہی اترتی ہیں۔



بریڈفورڈ کا سٹی ہال

واپسی انہی حسین وادیوں میں سے ہو رہی ہے ماریا پوچھ رہی ہے کہ رات کا کھانا ہم کہاں کھانا پسند کریں گے۔"

اسے شاید ان حسین نظاروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے صرف اپنے فرائض کا احساس ہے۔ یہ نظارے دیکھنا اور دکھانا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ایک معمول بن چکا ہے اور شاید وہ خود بھی ایک حسین نظارہ ہے۔

وہ ہمیں بریڈفورڈ کا ایشیائی علاقہ دیکھنے کی دعوت دے رہی ہے۔ وہیں کسی ایشیائی ریستوران میں کھانا بھی کھالیں گے۔

بریڈفورڈ میں ایشیائی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ جن میں پاکستانی بھی ہیں۔ بھارتی بھی، بنگلا دیشی بھی، سری لنکا والے بھی، کشمیری بھی۔ ان کی آمد کا سلسلہ گزشتہ صدی میں شروع ہوگیا تھا۔ اون اور ٹیکسٹائل کے سلسلے میں کاریگر اور کارکن دور دور سے آتے تھے۔ اب تو ان کی تیسری یا چوتھی نسل یہاں موجود ہے۔ جس نے اپنا وطن دیکھا ہی نہیں۔ بریڈفورڈ ہی اب ان کا وطن ہے۔ ان ایشیائیوں کو بریڈفورڈ والوں نے بڑی محبت سے قبول کرلیا ہے۔ اب وہ ان کے فن کو، رہن سہن کو، ان کے لباس کو، ان کی رسوم کو بریڈفورڈ کی رعنائیوں میں نئے اضافے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور فخر سے سیاحوں کو دعوت دیتے ہیں کہ بریڈفورڈ کے اس حسن کا بھی نظارہ کریں۔

مسلمان، ہندو، سکھ اپنے اپنے طرز زندگی، دینی شعائر کی یہاں حفاظت بھی کر رہے ہیں اور ان سے وابستگی کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ایشیائی مناظر تو کیا ہم بریڈفورڈ کے مشہور عالم فوٹوگرافی فلم اور ٹیلی ویژن کے عجائب گھر کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتے۔ طے یہی ہوتا ہے کہ رات کا کھانا اپنے ہوٹل میں ہی بہتر رہے گا۔

سٹی ہال کی چڑیاں

سرخ کھپریل کی جھکی چھتیں۔ شیشیوں سے جھانکتے بیڈ روم۔ دریچوں میں رکھے پھول

ماریا ہمیں ہوٹل میں چھوڑ کر کسی کام سے جا رہی ہے۔ وہ کھانے کے وقت پہنچ جائے گی۔ جین کھانے پر ہمارا ساتھ نہیں دے گی کیوں کہ اب اسے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو وقت دینا ہے۔ ماریا اور جین اپنے لباس کے معاملے میں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی ہیں۔ اس عمر کی خواتین اکثر منی اسکرٹ میں پھرتی ہیں۔ ٹانگوں کو سردی سے بچانے کے لیے شفاف قسم کی اسٹاکنگز پہن لیتی ہیں۔ ہوٹل کے سامنے بریڈفورڈ کے سٹی ہال کے باہر پیڑوں پر چڑیاں ہزاروں کی تعداد میں بیٹھی چہک رہی ہیں۔ شام بریڈفورڈ پر دھیرے دھیرے اتر رہی ہے۔

اسٹاکز نورفوک گارڈنز ہوٹل کی لابی سرشام رنگوں میں ڈھل رہی ہے۔ برونٹے سسٹرز کا اثر یہاں بھی ہے۔ ایک ہال کو برونٹے روم کا نام دیا گیا ہے۔ ایک لاؤنج۔ شارلٹ روم کہلاتا ہے۔

کچھ جوڑے آرہے ہیں۔ شاید کوئی تقریب ہے۔ ہم اپنے ساتھیوں کے منتظر ہیں۔ ایک کھلے سنہرے بالوں والی سروقامت حسینہ نہ جانے کس کی منتظر ہے، منی اسکرٹ اور لانبی ٹانگوں پر اسٹاکنگز۔ ہم کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ نہ جانے کون خوش نصیب ہے، جس کے لیے یہ حسن منتظر ہے۔ اسی اثنا میں ماریا پہنچ گئی۔ اور وہ حسینہ اس سے بڑے تپاک سے مل رہی ہے۔

''یہ ڈیبی ہے۔''

ڈیبورا کیرنگٹن۔ یہ بھی بریڈفورڈ اکنامک یونٹ کی افسر ہے۔ جین کی کمی اس سے زیادہ خوبصورت انداز سے دور ہو رہی ہے۔ عشائیہ طول کھینچ رہا ہے۔ دونوں بریڈ فورڈ کے حسین مناظر کو فروغ دے رہی ہیں۔ ہم اپنے وطن کے حسن کی مدح میں مصروف ہیں۔ انہیں پاکستان کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں کی دلکشی کی خبر ان تک نہیں پہنچی ہے۔ پاکستان کے تاریخی اثاثے ان کی نظر میں نہیں ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ پاکستان میں چاروں موسموں میں سیاحت کی جاسکتی ہے۔ مغل بادشاہ ہمارے ہاں جو تاریخی عمارات تعمیر کر گئے ہیں۔ وہ رومیوں کے تاریخی آثار سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔

ڈیبورا طلاق یافتہ ہے۔ وہ بھی شادی کے بندھن کا بوجھ برداشت نہیں کرسکی۔ اس لیے بات پہلے علیحدگی پھر طلاق تک پہنچی۔ اس کی ذہانت اس کے لیے مشکل بنی ہے۔ ادبیات سے اس کی دلچسپی بہت زیادہ ہے۔ پہلے وہ اخبار نویس تھی۔ ''ووگ'' جیسے فیشن میگزین سے وابستہ رہ چکی ہے۔ ''ڈیلی میل'' میں بھی کام کیا

ہے۔ شاعری بھی کرتی رہی ہے۔ اس کی نظمیں ''سنڈے ٹائمز'' کے لٹریری سیکشن میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ایک جنگ میں ایک نوجوان ہواباز کا طیارہ تباہ ہو گیا۔ ہواباز بھی ہلاک ہو گیا۔ ٹی وی نے خبر دی کہ یہ طیارہ اتنے کروڑ کا تھا۔ اس پر ڈیبی کو بہت دکھ ہوا کہ اس نوجوان ہواباز کی قیمتی زندگی پر کوئی تاسف ظاہر نہیں کیا گیا۔ ایک طیارے کی فکر ہے جو پھر تیار ہو سکتا ہے۔ جو ہواباز پھر نہیں آ سکتا اس پر دکھ نہیں ہے۔ اس نیرنگیٔ زمانہ پر اس نے ایک نظم لکھی۔ جو سنڈے ٹائمز میں شائع ہوئی تھی۔

ڈیبی پاکستان کو عمران خان کے حوالے سے جانتی ہے۔ وہ اس سے ملنے کے لیے پاکستان ضرور آ سکتی ہے۔

انگریزی کے شعراء میں سے کولرخ اس کا سب سے پسندیدہ شاعر ہے۔ اس کے زندگی کے تصورات اسے بہت مانوس لگتے ہیں۔ فلسفہ اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ نٹشے۔ شوپنہادر کو بہت تفصیل سے پڑھا ہے۔ اب بھی وہ کلاسیکی فلسفہ پڑھتی رہتی ہے۔

سیاحت سے اسے ذاتی دلچسپی ہے۔ اس لیے بریڈ فورڈ اکنامک یونٹ کی ٹورازم ٹیم سے منسلک ہو گئی ہے۔ اس کا گھر شہر سے کئی میل دور ہے۔ رات کو دیر سے گھر جانا ہو تو وہ اپنے کتے کو ساتھ رکھتی ہے۔ کچھ ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ گاڑی خراب ہونے کی صورت میں اکیلی خواتین پر حملے ہو جاتے ہیں۔ لیکن گاڑی میں فون ہو تو مدد کے لیے کسی کو بلایا جا سکتا ہے۔ ڈیبی کے پاس کتا بھی ہے فون بھی ہے۔ اور پھر اس کی گاڑی بھی ابھی تک خراب نہیں ہوئی ہے۔

ہم ٹھہرے مشرقی لوگ۔ ہماری غیرت جاگ اٹھی ہے۔ ہم سب پیش کش کر رہے ہیں کہ ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔ وہ شکریہ ادا کر رہی ہے کہ یہ تو اس کا اکثر کا معمول ہے۔ آپ تو کل چلے جائیں گے۔

ماریا اور ڈیبی دونوں الیکشن کے موقع پر کوئی زیادہ سرگرم نہیں ہوتی ہیں۔ ماریا کئی بار ووٹ ڈال چکی ہے۔ شادی کی طرح وہ پولنگ سے بھی تنگ آ گئی ہے۔ سب کو ووٹ دیا۔ لیکن کوئی معیار پر نہیں اترا۔

ریستوران میں شاید اب ہماری میز پر ہی زندگی ہے۔ باقی سب میزیں خالی ہو گئی ہیں۔

ماریا پاکستان کے بارے میں تفصیلات جان کر پاکستان آنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ میں نے اپنا انگریزی میگزین ''The Destination'' دکھایا ہے۔ اس کی تزئین، طباعت، کاغذ کی وہ بار بار تعریف کر رہی ہے۔

''کاش میری تصویر بھی ایسے خوبصورت پرچے میں شائع ہو سکے۔'' مجید عباسی نے فوراً اس کی تصویر The Destination پڑھتے بنالی ہے۔

ڈیبی سندھی میگزین حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ رنگین تصویریں دیکھ رہی ہے۔

مجید عباسی نے انہیں سندھ کی روایتی سوغات اجرک پہنائی ہے۔ اس کی ڈیزائننگ اور رنگ انہیں مزید متاثر کر گئے ہیں۔

ہم انہیں ہوٹل کے دروازے تک چھوڑ آئے ہیں۔ باہر خنکی میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن چڑیاں نہیں بول رہی ہیں۔ وہ بھی خاموش ہو گئی ہیں۔ شاید سو رہی ہیں۔

ہوٹل کے بالکل پیچھے بریڈ فورڈ کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ چلیے رات گئے اسے دیکھتے ہیں۔

رونق اب بھی موجود ہے۔ صفائی بھی ہو رہی ہے۔ کچھ جوڑے سرِعام بوس و کنار میں مصروف ہیں۔ کچھ کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن بھی اچھی خاصی مارکیٹ ہیں۔ سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ کتابیں بھی، برگر بھی، سگریٹ بھی، مشروبات بھی، اور محبت بھی۔

برطانیہ میں یہ ہماری دوسری رات ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ ہم پاکستان سے مہینوں سے آئے ہوئے ہیں۔ اتنی جلد ان گلیوں کوچوں کی یاد ستانے لگی ہے۔ خواب ہمیں پھر پاکستان لے گئے ہیں۔

☆......☆......☆

بریڈ فورڈ کی صبح۔ ہوٹل کے کمرے کے دریچے پر سورج کی کرنوں کے ذریعے دستک دے رہی ہے۔

پردے کا سرا اٹھا کر دیکھتا ہوں تو شہر انگڑائی لے کر بیدار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ بسیں، گاڑیاں، رواں دواں ہیں۔ مجھے فوراً ہوٹل کے سامنے پیڑوں پر بیٹھی چڑیاں

یاد آ گئی ہیں۔ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

''گڈ مارننگ سر۔''

استقبالیے پر موجود خاتون کمرے کی چابی لیتے وقت کہتی ہے۔

ہوٹل کا گیٹ کھلتے ہی چڑیوں کی چہچہاہٹ سے پورا علاقہ گونجتا نظر آتا ہے۔ سفید اور سیاہ رنگ کی یہ چڑیاں۔ بلبلوں کی شکل کی ہیں۔ رات ڈیبی نے ان کا نام ''اسٹارلنگز'' بتایا تھا۔ اور یہ بھی کہ ان سے بریڈفورڈ کے اہلکار بہت تنگ ہیں۔ یہ ان کے دفتروں میں بے تکلفی سے آتی جاتی ہیں۔ جہاں چاہے بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ ان کی آوازوں سے ڈسٹرب ہو جاتے ہیں۔ ان کو بھگانے کی کئی ترکیبیں آزمائی جا چکی ہیں۔ لیکن ان سے نجات حاصل نہیں ہو سکی۔

ان کی آواز تو چہرے کو ایک حسن بخش رہی ہے، ورنہ گاڑیاں اور ٹرکوں کا شور تو اکتا دینے والا ہوتا ہے۔ اس چہچہاہٹ سے تو انسان کا فطرت سے ٹوٹا ہوا رشتہ جڑتا رہتا ہے۔

چڑیاں پیڑوں پر ہی نہیں سٹی ہال کی منڈیروں پر بھی موجود ہیں۔ کھڑکیوں، دروازوں کی چوکھٹوں پر بھی چہچہا رہی ہیں۔ یہ بریڈفورڈ کی بلبلیں ہیں۔ بریڈفورڈ کی زندگی ہیں۔ یہ چہچہاتی رہیں زندہ رہیں۔ شہر ان کی آوازوں سے گونجتا رہے۔

بریڈفورڈ کی صبح مانوس سی لگتی ہے۔ بسیں لوگوں کو اٹھا بھی رہی ہیں، چھوڑ بھی رہی ہیں۔ دفتر کھل رہے ہیں۔ دکانیں ابھی بند ہیں۔ شیشے دکانوں کے اندر کا منظر دکھا رہے ہیں۔

بیڈ خوبصورت 590 پونڈ کے ۔ کرسیاں صوفے۔ ادھر ٹیلی گراف اینڈ آرگس کا دفتر شیشے کے اندر کی پرنٹنگ مشینیں۔ ایڈیٹرز کے کمرے۔ سب کچھ دکھا رہے ہیں۔

بس اسٹاپ پر صبح کی نوجوان ملاقاتیں۔ دفتر ختم ہونے پر ملنے کے عہد و پیماں۔ تیز رفتار قدم۔ اپنے اپنے دفتر پہنچنے کے لیے بے تاب۔

☆......☆......☆

اب ہماری منزل ہیرد گیٹ گاؤں ہے۔ جہاں ہمیں جون تھامپسن ملے گی۔ جو ہمیں ڈیل کی وادیوں میں لے جائے گی۔ پروگرام کے مطابق تو جون کو صبح سویرے ہمارے ہوٹل پہنچنا تھا لیکن اس کا فون آ گیا ہے۔ وہ ہیرد گیٹ کی ایک سڑک پر ہمارا انتظار کرے گی۔ پھر کچھ اجنبی سڑکیں، خوبصورت وادیاں، تنگ تنگ سڑکیں۔ اصطبل برائے فروخت۔ ''لان ٹرف برائے فروخت۔'' دیکھیں کہیں ہیرد گیٹ نہ گزر جائے۔

اب نہ ماریا ہے۔ نہ جین۔ ہم سب پاکستانی ہیں۔ صرف واکہال برطانوی ہے۔ جو ہمیں ہیرد گیٹ لے جا رہی ہے۔

ہیرد گیٹ ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ زیادہ بڑا قصبہ معلوم نہیں ہوتا۔ ہم اب تک صحیح سڑک پر جا رہے ہیں۔ جو نشانیاں بتائی گئی تھیں۔ وہ سب نظر آ رہی ہیں۔ سڑک کے بائیں طرف ایک ادھیڑ عمر کی خاتون ہمیں ہاتھ دے رہی ہے۔

شاید لفٹ مانگ رہی ہے۔

نوجوان ہوتی تو ضرور اٹھا لیتے۔

بھائی روک لو۔ شاید یہ جون تھامپسن ہو۔

یہ جون تھامپسن ہی ہے۔ اب یہ ہماری رہنما ہے۔

ہیرد گیٹ کی گلیاں۔ کوچے درختوں کی آغوش میں ہیں۔ سرخ کھپریل کی جھکی چھتیں۔ شیشوں سے جھانکتے بیڈروم۔ دریچوں میں رکھے ہوئے پھول۔

اس پورے ضلع کی آبادی صرف ایک لاکھ تینتیس ہزار ہے۔ ہیرد گیٹ کی آبادی تو صرف چھ سات ہزار کے درمیان ہونی چاہیے۔ لیکن یہاں دوسرے علاقے سے لوگ بہت کم آتے ہیں۔ اس لیے ہوٹل آباد رہتے ہیں۔ کھیلوں کے لیے یہ علاقہ آئیڈیل ہے۔ کھلے کھلے سرسبز گراؤنڈ۔ قومی صحت کے لیے بھی یہاں کافی مراکز ہیں۔

جون بتا رہی ہے کہ سال بھر یہاں کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔ بڑی تجارتی کمپنیاں۔ کثیر القومی ادارے اپنی کانفرنسیں اس پُر فضا اور صحت افزا مقام پر منعقد کرتے ہیں۔ صنعتی نمائشوں کے لیے بھی یہ مثالی مقام ہے۔ گندھک کے پانی کے چشمے بھی ہیں، جن میں غسل



برونٹے سسٹرز۔ ایک خاکہ

کے لیے برطانیہ بھر سے صاحب فراش آتے ہیں۔

پھولوں کی نمائشیں بھی ہیرد گیٹ کی خصوصیات ہیں۔ آج کل بھی خزاں کے پھولوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ خزاں کے بھی اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ پھول تو پھول ہیں خزاں میں تو پتوں کے بھی رنگ دلکش ہوتے ہیں۔

یہ اولڈ سوان ہوٹل ہے۔ جون کے مطابق فائیو اسٹار ہوٹل۔ اس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہاں مشہور ناول نگار اگاتھا کرسٹی بھی ایک عرصہ مقیم رہی۔ اور اپنے کچھ ناول یہاں مکمل کیے۔

سڑک کے کنارے ایک ''پوئٹری سینٹر'' لکھا ہوا ہے۔ جون بتاتی ہے کہ شہر کے شعراء یہاں جمع ہوتے ہیں اور اپنی نظمیں سناتے ہیں۔ ان پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ کوئی حلقۂ اربابِ ذوق یا حلقہ احبابِ معیار جیسی کوئی چیز ہوگی۔

ہیرد گیٹ اپریل سے اکتوبر کے آخر تک برطانیہ بھر سے اور دوسرے ملکوں سے آنے والے سیاحوں سے آباد رہتا ہے۔ موسم بہار میں تو یہاں کی رونق دیدنی ہوتی ہے۔ کیسے کیسے پھول کھلتے ہیں۔ کیسے کیسے رنگ بکھرتے ہیں۔

ہیرد گیٹ میلوں تک پھیلی ہوئی ''دی یارک شائر ڈیلز'' وادیوں۔ دریاؤں۔ مرغزاروں اور سر سبز پہاڑوں پر مشتمل علاقے کا دروازہ ہے۔

یارک شائر ڈیلز۔ برطانیہ کے محفوظ کیے گئے گیارہ نیشنل پارکوں میں سے ایک ہے۔ آلودگی سے حتی المقدور بہت دور۔ صنعتی علاقے کو نزدیک نہیں آنے دیا جاتا۔

یہ سب کچھ ایسے ہی محفوظ نہیں ہوگیا ہے۔ نہ جانے کتنی تنظیمیں یارک شائر ڈیلز میں زندگی کو اپنی اصل حالت میں برقرار رکھنے کے لیے کتنی محنت کر رہی ہیں، کتنے فنڈز خرچ کر رہی ہیں۔ یہاں کے محنت کش لوگوں کو بھی اپنی طبع زاد زندگی گزارنے میں مدد دی جاتی ہے۔ جنگلی حیات، پرندوں، جانوروں، جنگلی پودوں، پھولوں کو بڑی احتیاط سے جدید زندگی کے اثرات سے بچایا جاتا ہے۔ ورنہ آنے والی نسلوں کے دیکھنے کے لیے کیا باقی رہے گا۔

جون نے ہمیں ایک پمفلٹ دیا ہے۔ جس میں

سیاحوں کے لیے کچھ ہدایات موجود ہیں۔
☆ دیہی علاقوں کی سیر کا لطف اٹھائیں۔ لیکن یہاں کے طرزِ زندگی کا احترام کیجیے۔ مقامی ہنر۔ خدمات اور مصنوعات کے فروغ میں تعاون کیجیے۔
☆ جہاں سے گزریں عام راستوں پر چلیے۔
☆ پتھر کی دیواروں، باڑوں اور حصاروں سے گزرنے کے لیے دروازے اور راہداری استعمال کیجیے۔
☆ دروازوں کو آپ نے جس طرح بند یا کھلا پایا ہو۔ اسی طرح چھوڑ دیجیے۔
☆ مرغزاروں کی گھاس کو ایک صف میں چل کر خراب مت کیجیے۔
☆ جنگلی پرندوں، درختوں اور دوسرے پودوں کو تباہ مت کیجیے۔ خاص طور پر جنگلی پھولوں کو دوسروں کے نظارے کے لیے بھی چھوڑ دیجیے۔ اور پرندوں۔ جانوروں کے معمول میں خلل نہ ڈالیے۔
☆ اپنے کتے کو پوری طرح کنٹرول میں رکھیے۔
☆ زرعی مشینری کو نہ چھیڑیے۔ یہ خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔
☆ اپنا کوڑا کرکٹ ساتھ لے جائیے۔
☆ آگ کے خطرے سے احتیاط کیجیے۔
☆ دریاؤں، ندیوں اور جھیلوں کو صاف ستھرا رہنے دیجیے۔
☆ جہاں تک ممکن ہو۔ عوامی ٹرانسپورٹ استعمال کیجیے۔
☆ تنگ سڑکوں پر محتاط رہیے۔
☆ دیکھ بھال کر گاڑی پارک کیجیے۔ جہاں تک ممکن ہو۔ وہاں کار باقاعدہ پارکنگ میں کھڑی کیجیے۔
☆ دوسرے انسانوں کے لیے آرام و سکون کا خیال رکھیے۔
☆ ان لوگوں کا خیال رکھیے جو دیہی علاقوں کو دوسرے قانونی انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔

ہمارے سامنے خزاں اپنے رنگ بکھیر رہی ہے۔ ایک چوراہے پر گاڑی رکتی ہے۔ سامنے ایک بار ہے۔ بورز ہیڈ۔ اس کے ساتھ ایک مجسمہ۔ اور نیچے لوہے کا ایک جنگلا اور اس میں چار سوراخ۔ یہاں سولہویں سترہویں صدی میں چرچ کے حکم پر ملزموں کو یہ سزا دی جاتی تھی کہ ان کے دونوں ہاتھ اور ٹانگیں ان سوراخوں میں باندھ دی جائیں۔ اور جب تک پورا شہر انہیں اس حالت میں نہ دیکھ لیتا۔ انہیں یہاں سے نہیں ہٹایا جاتا تھا۔ آج کل تو انسانی حقوق کے علمبردار ایسی سزائیں نہیں دینے دیں گے۔ اس سے ذرا دور اسی صدی یعنی سترہویں صدی کا قلعہ ہے۔ اس پر اب بھی گولیوں کے نشان ہیں۔ کرامویل کے دور کی جنگ کے۔ یہیں کچھ اس دور کی جنگ میں کام آنے والے جرنیلوں کی قبریں بھی ہیں۔ قلعے کے سامنے ایک گھر پر ایک بیل بڑی نزاکت سے دیوار سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ جون اس بیل کا نام ''ورجینیا کریپر'' بتا رہی ہے۔ اردو میں اسے ''کنواری بیل'' کہہ لیجیے۔ کوئی حرج نہیں ہے۔

''یہ بھیڑیں کس نسل کی ہیں۔''

''ہمارے علاقے میں سب سے زیادہ بھیڑیں پائی جاتی ہیں۔''

وقت کی بات ہے۔ ورنہ بھیڑیے بھی سب سے زیادہ یہیں ہوتے تھے۔ اور دنیا بھر میں بھیڑوں کے شکار پر نکل جاتے تھے۔

بھیڑوں کی سب سے قدیم نسل جیکب بھیڑ کی ہے۔ اس نسل کی حفاظت کے لیے ''جیکب شیپ سوسائٹی'' بھی بنی ہوئی ہے۔ جیکب بھیڑ کا تعلق جیکب آباد سے کتنا ہے۔ یہ تو میر ہزار خان بجارانی سے پوچھنا ہوگا۔ دریا خان کھوسو تو اب آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کا تعلق اب نہ جیکب بھیڑوں سے رہا نہ جیکب بھیڑیوں سے۔

یہ چھوٹا سا قصبہ پیچھے رہ گیا ہے۔ اب ہم انگلینڈ کی سب سے خوبصورت وادیوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ پیڑ ہمیں اپنی شاخوں میں لینے کو بے تاب ہیں۔

☆......☆......☆......☆

برطانیہ کی رنگین خزاؤں کے اِس خوبصورت سفر میں ہم اگلے ماہ پھر سے محمود شام کے ساتھ ہوں گے۔ برطانیہ کی صدیوں پرانی غاریں اور آلٹن ٹاورز کی حیرتوں کے ساتھ۔

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

اسرار کی نئی دنیا میں لے جانے والے، پُراسرار سلسلے کی پہلی قسط

رات کی ہولناکی اپنے جوبن پر تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس اندھیری رات میں جائے تو جائے کہاں؟ ہر سُو ایک عجیب سی اداسی ٹھہری ہوئی تھی۔ آخر یہ راستا کہاں گم ہو گیا... ویران سڑک کسی بل کھاتے اژدھے کی طرح اوندھی پڑی تھی اور خوف سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بدروحوں کا کوئی قافلہ ہے جو آج زمین پر اترنے والا ہے اور اسی نے اپنی گپت شکتیوں سے اس کا راستا بھی نگل لیا ہے۔ خوف اور ڈر...... یہ تو انسانی واہمے ہیں۔ پر اُس پر یہ کیوں سوار ہوئے جاتے ہیں۔ کیا آج اس کا بھید کھلنے والا ہے۔ آسمانوں سے ایسی بلائیں اترنے والی ہیں جو اس کا راز طشت از بام کر کے اسے رسوا اور ذلیل کرنے کا پورا سامان کر چکی ہیں۔ یا خدا اب کیا ہوگا... اس کا دل بُری طرح دھڑ دھڑایا۔ پر ایسا کیا ہے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ ہواؤں میں خوف کے مرغولے سرسراتے تھے اور ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی اور اسے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے اندر تک ایسے اتر رہا ہے جیسے ٹھٹھرتی ہوئی سردیوں میں ٹھنڈی برفانی ہوائیں جسم کی کھال کو چیرتی ہوئی ہڈیوں تک میں جا گھستی ہیں...

ہڈیاں... یکا یک اسے خیال گزرا اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ دونوں ہاتھوں سے بار بار اپنے ہی جسم کو وہ ایسے چھو چھو کر دیکھنے لگا جیسے یہ اس کا نہیں کسی اور کا جسم ہو اور اسے ایک لمحے کو خوف سا محسوس ہوا کہ اس کے جسم کی ہڈیاں اس وقت کہیں خود بخود تحلیل ہو گئی تھیں اور سارے جسم کے ہر حصے میں بس گوشت ہی گوشت اور کھال ہی کھال محسوس ہوتی تھی۔ نرم اور گدلی گدلی سی کھال... جیسے کسی پیدا ہونے والے بچے کی ہوتی ہے، نرم اور پلپلی سی۔ اسے وحشت ہونے لگی، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو انسان کی جون میں آئے ہوئے اب کافی طویل عرصہ ہو چکا ہے اور اسے کبھی یہ خیال اگر آیا بھی تھا کہ اس کے جسم میں ہڈیاں نہیں ہیں۔ تو اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن...؟ پھر اسے یاد آیا ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا، کبھی کبھی ہوتا تھا اور وہ یہ کبھی نہیں جان سکا کہ ایسا کبھی کبھی بھی کیوں ہوتا تھا۔ اس نے تو پورے طور پر خود کو جن سے انسان کے روپ میں بدلا تھا اور یہ کوئی آج کی بات تو نہیں تھی اس بات کو تو برسوں ہو چکے تھے اور اب تو وہ بھولتا جا رہا تھا کہ وہ ایک انسان نہیں بلکہ جن ہے اور اسے یوں بھی جن رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ جن بننے میں خوش ہوتا تھا۔ اسے تو انسان بن کے جو مزا آ رہا تھا، جس طرح اسے انسانوں میں رہ کر لطف ملتا تھا اس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن اسے دور افتادہ پہاڑیوں میں اپنے والدین سے ملنے ان کے پاس ان تاریک اور دل دہلا دینے والے



غاروں میں جانا پڑتا تھا تو اس کا دل اداسی سے بھر جاتا۔ پر اس کے باپ ابراہیم کا سختی سے اسے حکم تھا کہ وہ مہینے میں ایک بار ضرور ان سے ملنے ان کے پاس چکر لگائے گا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کا باپ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے گا۔ اس سختی کا مطلب وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا باپ اسے یا تو پھر سے انسان بننے کی اجازت نہیں دے گا اور اگر اس نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف ایسا کیا تو وہ اس کا یہ راز انسانوں پر کھول دے گا۔ خاص طور پر اس مدرسے کے مدرس پر جہاں وہ پڑھ رہا تھا۔ جہاں اسے طالب علم کی حیثیت سے طعام وقیام کی سہولتیں ملی ہوئی تھیں... اگر اس کے باپ نے ایسا کیا تو سمجھو اس کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا اور اسے مدرسے سے نکال دیا جائے گا۔ ایسا ہوا تو وہ کہاں جائے گا اور کہاں رہے گا۔ انسانوں کی اس دنیا میں ایک جن چاہے وہ انسان بھی ہو تب بھی رہنا کوئی ایسا آسان نہیں ہوگا۔ وہ بھی اس صورت میں جب اس سے اس کا باپ ناراض ہو...... ظاہر ہے وہ جہاں بھی رہے گا اس کے باپ کو اس کی خبر ہو جائے گی اور وہ اس کا بھانڈا پھوڑ کے اسے ایسی ہر جگہ سے بھاگ نکلنے پر مجبور کر دے گا۔ یا پھر اسے جہاں وہ پناہ لے گا وہاں کے رہائشی اور مالکان ذلیل کر کے نکال دیں گے۔ اس لیے وہ مجبور تھا نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مہینے میں ایک بار ضرور اپنے گھر جانا پڑتا تھا۔ پر یہ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر بالکل سے جانا ہی نہ چاہتا ہو۔ اسے اپنی یاں سے اس کے باوجود بے پناہ محبت تھی کہ وہ بھی ایک جنی تھی اور ہر وقت اسے واپس اپنے جیسا ہونے کی تلقین کیا کرتی تھی۔ ماں بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ یہ اس کی ماں کی بے حساب چاہت اور محبت کی ہی وجہ سے ممکن ہوا تھا کہ اسے انسان کے روپ میں انسانوں کے درمیان رہنے کی اجازت مل گئی تھی... ورنہ اس کے باپ ابراہیم نے تو اس کی یہ بات سننے کے بعد صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی جن کبھی بھی انسانوں کے بھیس میں، انسانوں کے درمیان نہیں رہ سکتا۔ قدرت کو یہ کسی طور منظور نہیں ہے۔ ان کی اور ہماری دنیاؤں کو الگ الگ بنایا گیا ہے اور بنانے والے مالک نے یہ فیصلہ اول روز سے ہی کر لیا تھا کہ نہ کوئی جن مالک کے حکم کے بغیر انسانوں کی بستی میں ان کے ساتھ رہ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی انسان جنات کے ساتھ ان کی بستی میں رہ سکتا ہے۔ یوں بھی جنوں کو انسانوں کی طرح باقاعدہ بستیاں بسا کے رہنے کی نہ عادت ہوتی ہے اور نہ یہ ان کے لیے ممکن ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

''سلمان'' ہاں اس کا یہی نام تھا۔ اسے انسانوں کے ساتھ رہنے کی اس قدر شدید خواہش تھی کہ وہ دن رات بس یہی ایک بات سوچتا رہتا تھا کہ آخر وہ کیا طریقہ ہو کہ وہ انسانوں کی بستی میں انسان بن کے رہ سکتا ہو۔ دن رات اس قسم کی سوچ بچار اور ادھیڑ بن میں گم رہنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی اس شدید سے شدید تر ہوتی ہوئی خواہش پر کیسے عمل کرے یا اس سے کیسے پیچھا چھڑائے۔ ہر نیا دن اور ہر رات اس کی اس خواہش میں ایک نئی آگ بھر دیتی تھی اور وہ سارا سارا دن چپ چاپ بیٹھا اس آگ میں جلتا رہتا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنی ماں سے ہی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسے یاد تھا اس کی ماں یہ سنتے ہی ایک دم سے دھک سے رہ گئی تھی اور دیر تک اس کی طرف کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ کیسی انوکھی بات ہے جو تم نے کہی سلمان؟ کس نے سکھائی یہ بات؟'' ماں کے اس سوال کا وہ کیا جواب دیتا چپ رہا اور ماں اس کے بال پکڑ کے اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی ''اگر تیرے باپ کو پتا چلا تو وہ تجھے جان سے ہی مار دے گا۔''

''تم بھی کیسی عجیب بات کرتی ہو ماں۔ یہ کوئی ایسی بات ہے جو مجھے کوئی سکھائے گا اور میرے دل میں اسے پورا کرنے کی ضد جڑ پکڑ لے۔''

''تو پھر تو ایسا کیوں چاہتا ہے؟'' ماں کے چہرے پر ناچتی ہوئی گمبھیر فکر مندی کو اس نے محسوس بھی کیا اور دیکھا بھی۔

''میں تجھے کیسے سمجھاؤں ماں۔ یہ بات تو خود میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے، پر میں اپنے دل کا کیا کروں جس میں دن رات یہی ایک بات طوفان کی لہروں کی طرح سر اٹھاتی رہتی ہے اور ایسے ہلچل مچاتی ہے کہ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں اور کبھی لوٹ کر نہ آؤں۔ پھر سوچتا ہوں اس سے کیا ہوگا۔ وہ میرے دل میں اچھلنے مچلنے والی آگ کی لہریں

اور لپٹیں کیا ایسا کرنے سے مجھے چین لینے دیں گی۔ بس یہی سوچ کر یہاں ہی پڑا رہتا ہوں۔ اب تُو ہی بتا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تُو تو مجھے ایسے الزام دے رہی ہے جیسے انسانوں کے بچے کسی کھلونے کے لیے ضد کرتے ہیں۔ میں کوئی ایسی ضد کر رہا ہوں۔ میں تجھے اس سے زیادہ نہیں سمجھا سکتا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے بس'' اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور پہاڑیوں کی ویران چوٹیوں پر بیٹھا سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے اس کے من میں جانے کیا سمائی، گدھوں کی طرح وہیں لوٹیں لگانے لگا۔ دور سے اُڑ کے آتے ہوئے اس کے باپ اور اس کے ساتھ اس کے ایک اور جن دوست نے جب سلمان کو



یوں پتھریلی زمین پر لوٹیں لگاتے دیکھا تو دونوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور دونوں نے ایک دوسرے کی طرف اجنبیت سے دیکھتے ہوئے سر ہلائے اور جلدی سے سلمان کی طرف دوڑے جو بس ایک اونچی چٹان سے نیچے لڑھکنے ہی والا تھا۔ اس کے باپ نے اسے گرنے سے بچاتے ہوئے جلدی سے ایک دم پکڑا اور اپنے سینے سے لگاتے ہوئے جیسے خود کو یقین دلایا ہو کہ اس کا سلمان اس کے پاس ہے اور زندہ ہے، اسے کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر اسی طرح اسے سینے سے لگائے رکھنے کے بعد اسے اس وقت ہوش آیا جب اس کے دوست دانیال نے کہا۔

''ارے ابراہیم اس سے پوچھو تو یہ ایسا کر کیوں رہا تھا؟'' ابراہیم نے اسے خود سے الگ کیا اور بولا۔

''ہاں بھئی سلمان بتا تو یہ کیا حرکت تھی اور تُو ایسی بے دھیانی کیوں دکھا رہا تھا۔ کیا زندگی سے جان چھڑانے کا ارادہ تھا تیرا؟''

یہی سوال ابراہیم نے اس سے کئی بار پوچھا پر جواب میں سلمان وحشت اور خوف سے باپ کی طرف دیکھتا رہا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے ایسے باپ کو کیا بتائے جسے بات بات پر غصہ آ جاتا ہے اور اس کے غصے سے سب کو ہی ڈر لگتا ہے۔ سلمان کو لگا کہ اس حالت میں وہ کچھ بھی کہے گا، اس کے باپ کی سن لے گا تو سمجھ نہیں سکے گا اور سمجھ نہیں سکے گا تو پھر کچھ بھی کہنے کا کیا فائدہ ہے اس لیے اسے چپ رہنے میں ہی عافیت نظر آئی۔

''یہ تُو کچھ بول کیوں نہیں رہا۔ پتا نہیں کیا بات ہے ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا!'' ابراہیم نے اپنے دوست دانیال کی طرف دیکھا۔

''ہاں یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا لگتا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تُو یوں کیوں نہیں کرتا اس کی ماں سے پوچھ۔ اسے ضرور کچھ معلوم ہوگا۔ بچے جو بات اپنے باپ سے نہیں کہہ پاتے، وہ بھی اپنی ماں سے ضرور کہہ دیتے ہیں۔'' دانیال نے اسے صلاح دی۔

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایسا ہی کرتا ہوں۔'' ابراہیم نے سلمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے اس طویل سرنگ نما غار کی طرف لے جانے لگا جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ دانیال بھی اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھ چلا آیا کیونکہ دانیال کو بھی یہ جاننے میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو سلمان نے اس طرح اپنی جان لینے کی کوشش کی۔ جن جاتی میں تو ایسا نہ پہلے کبھی کسی نے دیکھا اور نہ سنا، پھر یہ عجیب انسانوں والی حرکت یہاں ہمارے قبیلے میں کیسے آ گئی۔ وہ بھی ایک بچے میں، ابھی سلمان کی عمر ہی کیا تھی مشکل سے دس برس کا ہوگا اور اس کو ایسی کیا پریشانی لاحق ہو گئی جو وہ اپنی جان لینے کے درپہ ہوا تھا۔ یہی سوچ کر دانیال بھی ان کے ساتھ ساتھ چلا آیا۔ ابراہیم نے اپنی بیوی اور سلمان کی ماں جنی کے سامنے پہنچ کے اسے باہر پیش آنے والا سارا واقعہ سنایا اور بولا۔

''تم کچھ جانتی ہو تو بتاؤ۔ بچے اپنی ماؤں سے ساری بات کر لیتے ہیں۔ اس نے تمہیں بتایا ہوگا اس کو کیا پریشانی ہے؟''

''کیسی بھی پریشانی ہو بھائی ابراہیم، پر ہم جنوں میں ایسی حرکت تو نہ کبھی کسی نے کی اور نہ کبھی دیکھی اور سنی۔ یہ انہونی انسانوں جیسی حرکت تمہارے بیٹے میں کہاں سے آئی اور کیوں؟'' دانیال نے بھی اپنے شکوک اور وسوسوں کا اظہار کیا۔

سلمان کی ماں جانتی تھی کہ اس کا بچہ کس آگ میں جل رہا ہے پر وہ کیا کرتی۔ یہ بات ایسی تھی جو دانیال تو کیا کسی بھی اور کے سامنے کہنے کی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ قبیلے کے سردار کو اس کی خبر لگ گئی تو وہ اس کے پورے خاندان کو جان سے مار دینے کا حکم صادر کر دے گا۔ اس لیے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے وہ بولی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو بس ذرا کی ذرا باہر کھیلنے کو گیا تھا اور ہو سکتا ہے کھیلتے کھیلتے گرنے لگا ہو اور اسی وقت تمہاری نظر پڑی ہو تو تمہیں ایسا لگا ہو جیسے سلمان جان بوجھ کر اپنی جان لینے لگا تھا۔ یہ تو ابھی بچہ ہے یہ ایسا کیوں کرے گا۔ اور بچہ کیا جن جاتی میں تو بڑے بھی کبھی ایسا سوچ نہیں سکتے تو یہ کیوں کرنے لگا۔ میرا بچہ خالص جن جات ہے۔ کوئی اس میں کھوٹ تو نہیں ہے جو وہ ایسی حرکت کرنے لگا۔ کیوں سلمان میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' لمبی اور بے تکی سی تقریر کرتے ہوئے خود بھی یہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بے تکان بولے جا رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ اسی گفتگو میں اسے ایسا کوئی راستا سجھائی دے جائے جس سے وہ اپنے شوہر اور اس کے دوست کے اس خیال کو غلط ثابت کر سکے جو

انھوں نے سلمان کے بارے میں بیان کیا تھا کہ سلمان خودکشی کرنے والا تھا۔ جواب میں سلمان نے ماں کی تائید میں سر ہلا دیا تھا۔ سلمان کی ماں کی بات سن اور سلمان کی تائید دیکھ کر ابراہیم اور دانیال دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر دانیال بولا۔

''ہم نے اتنا پوچھا تو اس نے یہ بات ہمیں کیوں نہیں بتائی کہ وہ کوئی حادثہ تھا۔ وہاں تو یہ ایسے چپ رہا جیسے کوئی مجرم اپنی غلطی کے پکڑے جانے پر چپ ہو جاتا ہے''

''آپ بھی کمال کرتے ہو دانیال بھائی۔ ارے یہ بچہ ہے ڈر گیا ہوگا۔ اور ڈرے ہوا بچہ اتنی جلدی کیسے بتائے گا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ ہوا ہے یا ہونے والا تھا'' سلمان کی ماں کی بات سن کر دانیال جیسے لاجواب تو ہو گیا پر اس کا ذہن ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا اور وہ کوئی اور سوال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ سلمان کی ماں نے اس کا یہ ارادہ بھی بھانپ لیا وہ جلدی سے بولی۔

''اب جو ہوا سو ہوا ہمارا بچہ خیریت سے ہے ہمیں اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور خوش ہونا چاہیے''

''ٹھیک کہتی ہے سلمان کی ماں...'' ابراہیم نے کہا اور بولا ''چلو آؤ بیٹھو اب آ گئے ہو تو کچھ کھا پی کے جانا'' اور دانیال سوچ کی گہری لکیروں کو کم کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے وہاں بیٹھ گیا اور دونوں دوست پھر سے اپنی پرانی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ تب ہی موقع دیکھ کر سلمان کی ماں نے کہا۔

''میں مشروب لاتی ہوں'' یہ کہہ کر اس نے سلمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے غار کے اندر دور تک لیتی چلی گئی۔

''یہ کیا حرکت تھی بیٹا! کیا تم جینے سے جان چھڑانا چاہتے ہو؟'' اندر لے جا کر سلمان کی ماں سے رہا نہ گیا اور اس نے سلمان سے پوچھا۔

''رہنے دو ماں، ابھی دانیال چچا کو جانے دو اور یہ بات مت کرو۔ میں کتنا بھی دھیرے بولوں گا پر مجھے ڈر ہے ان کے کان بہت تیز ہیں اور اس وقت تو وہ یہیں کان لگائے ہوئے ہوں گے۔ اور تمہارا وہ جھوٹ پکڑا جائے گا جو تم نے ان ہی کی وجہ سے ابا سے بھی بولا ہے'' سلمان کی بات سن کر اس کی جنتی ماں نے اسے ایسے اچنبھے سے دیکھا جیسے ایسی سمجھداری کی بات کی اسے سلمان سے توقع نہیں تھی اور پھر خاموشی سے مشروب بنانے لگی۔ سلمان ایک طرف پھر سر نہوڑائے خاموشی سے بیٹھ گیا۔

مشروب دے کر واپس آنے میں اس کی ماں کو کچھ وقت لگا۔ وہ اپنے شوہر اس کے دوست سے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے بیٹھ گئی تھی لیکن جب وہ واپس آئی تو اس نے سلمان کو اسی طرح ہی سر جھکائے بیٹھے ہوئے دیکھا جیسے وہ اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس کا دل کٹ کے رہ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اس کے دل سے اس وقت نکلا کہ دانیال جلدی سے چلا جائے تو وہ اپنے شوہر سے اس گمبھیر مسئلے کے بارے میں بات کرے گی تا کہ اس کا اکلوتا بیٹا کسی بھی صورت اس غم اور مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

خدا خدا کر کے دانیال چلا گیا اور سلمان کی ماں نے رات کے آخری پہر میں اپنے شوہر سے بات چھیڑی۔ بات سن کر ابراہیم کا ایک بے اختیار قہقہہ بلند ہوا اور وہ بولا۔

''آخر بیٹا کس کا ہے، ایسی انوکھی باتیں نہیں سوچے گا تو کیا عام سی باتیں سوچے گا۔ وہ تو ذرا سی کسر رہ گئی ورنہ آج قبیلے کا سردار میں ہوتا اور تم قبیلے کے سردار کی بیوی اور سلمان قبیلے کے سردار کا بیٹا۔''

شوہر کی یہ عجیب و غریب بات سن کر سلمان کی ماں جس کا نام زلیخاں تھا ایک دم چمک کر بولی۔

''تمہاری تو عقل ماری گئی ہے۔ میں کچھ کہہ رہی ہوں اور تم کچھ اور کہے جا رہے ہو۔ کبھی تو اپنے سپنوں سے باہر بھی آ جایا کرو ہر بات کو لے جا کر وہیں جوڑنا کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔ ہمارا اکلوتا بیٹا کس طرح مصیبت میں ہے کہ اپنی جان کے درپے ہے اور تمہیں اپنی سرداری کی پڑی ہوئی ہے۔ اچھا ہوا جو تم سردار نہیں بنے، بن جاتے اور بیٹے کے بارے میں پتا چلتا تو بدنامی سارے قبیلے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے'' زلیخاں

کی بات سن کر ابراہیم ایک دم ہی جیسے چونک سا گیا اور اسے پہلی بار لگا کہ جس بات کو وہ محض ایک انوکھی بات سن کر خوش ہو رہا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

"کیا مطلب ہے تو کیا اس نے واقعی خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی؟" جیسے ابراہیم کی آنکھوں میں غار کی دیواریں ایک دوسرے سے ختم تھا ہوگئیں۔

"سوچا تو تھا تمہیں نہ بتاؤں پر کیا کروں، اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور تمہیں بتانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کچھ کر سکتے ہو تو کر لو نہیں تو ہم اپنا بیٹا....." یہ کہہ کر زلیخاں سسکیاں لینے لگی تو ابراہیم کا وہ غصہ جو کچھ دیر پہلے اس کے سینے سے اچھل کر باہر آنے کو مچل رہا تھا۔ ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ کسی گہری سوچ میں چلا گیا۔ کافی دیر تک زلیخاں کبھی ہولے ہولے اور کبھی کچھ اونچی بلند سطح پر سسکیاں لینے لگتی اور ابراہیم کا ذہن مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی اس کا دماغ اور دل کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"تم یہ رونا اور سسکنا تو بند کرو میں کچھ سوچتا ہوں، کرتا ہوں کچھ۔ اس طرح سسکنے سے کیا ہوگا، الٹا میرے سوچنے میں خلل پڑ رہا ہے اور مجھے کوئی راستا نہیں سوجھ رہا۔"

شوہر کی بات سن کر زلیخاں یکلخت چپ ہوگئی اس کی سسکیوں کو بریک لگ گیا اور وہ مایوس نظروں سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے وہ میری بات مان کر اپنے ارادے سے باز آجائے گا؟"

"نہیں!"

"کیا مطلب نہیں۔" ابراہیم کو اس وقت یہ 'نہیں' ایسی محسوس ہوئی جیسے کسی نے ننگی اور آہنی برچھی اس کے سینے کے آر پار اتار دی ہو۔

"وہ کہتا ہے اس خواہش نے اس کے سارے وجود میں آگ کے الاؤ دہکا رکھے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس کے بس میں نہیں ہے اس لیے میں کیسے کہوں کہ وہ تمہاری بات مان کر اس ارادے یا خواہش سے باز آجائے گا۔" زلیخاں نے تفصیل سے اپنے شوہر کو ساری بات سمجھائی۔

"اچھا یہ بات ہے۔" ابراہیم جیسے کڑیل اور طاقت ور دیو نما جن کے لہجے کی افسردگی اور شکستگی کو زلیخاں نے بھی محسوس کر لیا اور اسے لگا اس کا شوہر جو کسی بھی مسئلے کو مسئلہ نہیں سمجھتا اور دنیا کے ہر معاملے کو، ہر الجھن کو چٹکیوں میں سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے اس مسئلے پر جیسے اپنی بے بسی کو محسوس کر چکا ہے اور اس کا لہجہ اس کر و فر اور بانکپن سے خالی ہو چکا ہے جو اس کی پہچان ہے۔ اپنے شوہر کی یہ حالت دیکھ کر زلیخاں کا دل بھر آیا اور اس لمحے اسے ابراہیم پر ڈھیروں ترس آیا وہ اس کے اور قریب آگئی اور اسے لگا جیسے ابراہیم کو ساری زندگی میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت اسی لمحے میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"پھر تم نے کیا سوچا، کیا حل ہے اس مسئلے کا؟" وہ بھیگے ہوئے لہجے میں دھیرے سے بولا۔

"میں جانتی کوئی حل... تو کب کا کر چکی اس پر عمل اور تم تک یہ بات کبھی نہ آنے دیتی مگر آج جو تم نے اس کی یہ بات بتائی کہ وہ اپنی جان سے غافل ہو چکا ہے اور کسی بھی وقت اس کو خدانخواستہ کچھ ہو سکتا ہے تو میں جیسے ہمت ہار گئی۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی یہ حالت کب سے ہے؟"

"کب سے ہے؟" ابراہیم نے فکرمندی سے زلیخاں کی طرف دیکھا۔

"دو ہفتے سے"

"دو ہفتے سے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟" ابراہیم کا فطری غصہ ایک دم ہی عود کر آیا۔

"تمہیں کیا بتاتی مجھے خود اس نے ایک ہفتا پہلے بتایا ہے لیکن اس سے کیا ہوتا اگر میں تمہیں بتا بھی دیتی۔ اچھا ہوا جو نہیں بتایا۔ تم خوامخواہ غصہ کرتے اور وہ بات جو آج دو ہفتے بعد یہاں تک پہنچی ہے وہ ایک ہفتا پہلے ہی یہاں تک آجاتی۔"

وہ رکی اور پھر بولی' ایک ہفتے سے تو میں اسے دیکھ رہی ہوں جب اس نے پہلی بار مجھے یہ بات بتائی تو پہلے تو میں نے بھی اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور اسے اس کے دماغ کا خلجان سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ پر جب میں نے اسے اس خیال کی گرفت میں دیکھا اور اس کی مسلسل بگڑی ہوئی حالت دیکھی، ہر وقت کھویا کھویا اور پریشان فکر مند اتنا کہ اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا، تب میں نے اسے پہلے پیار سے سمجھایا کہ جن جاتی کو یہ بات زیب نہیں دیتی اور اسے اپنی اس بات کو دل سے نکال کے پھینک دینا چاہیے۔ اس وقت ابراہیم میں نے جو بے بسی اور لاچارگی اس کی آنکھوں میں دیکھی اسے میں کبھی بھول نہیں سکوں گی۔ بڑے دکھ سے اور تھکی ہوئی مردہ سی آواز میں بولا'' ماں میں یہ سب جانتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں ہے اسی لیے کب سے میں اس بات کو اپنے من سے نکال کے پھینکنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ہر طرح کے جتن کر چکا ہوں لیکن.... وہ روہانسا ہو گیا میں نے پوچھا لیکن کیا بیٹا..... تو وہ سنبھلا اور بولا جتنا میں اپنے من سے اس بات کو نکالنے کی کوشش کرتا ہوں اس کی موجودگی اور آگ کی سی تپش میرے سارے وجود میں بڑھتی چلی جاتی ہے میں مجبور ہو گیا ہوں ماں... بالکل مجبور۔ میں نے اسے سینے سے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ اب تم ہی بتاؤ کیسے حل کرتے تم یہ مسئلہ اور کیا حل کر پاتے۔ میں یہ سوچ کر چپ رہی کہ شاید وقت کے ساتھ ساتھ اس کی یہ حالت ٹھیک ہوتی جائے گی مگر میں غلط تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حالت ٹھیک ہونے کے بجائے اور زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔''

''تو اب کیا کریں۔ کیا ہوگا اب۔ جو بھی سنے گا ہم پر ہی انگلیاں اٹھائے گا اور اس کا انت کیا ہوگا۔ یہ بات کہاں جائے ختم ہو گی۔ کچھ اس بارے میں بھی سوچا ہے؟'' ابراہیم کے لہجے سے خوف جھانک رہا تھا۔

''میں ماں ہو اس کی اور وہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ ہمارا تابعدار اور فرمانبردار ہے۔ اس نے نہ کوئی گستاخی کی اور نہ ہماری کوئی حکم عدولی کی ہے۔ ہم اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتے ہیں اور پھر اس میں اس کا دوش کیا ہے جو وہ اپنی طرف سے کوئی ضد کر رہا ہے اور نہ ہی زبردستی ہم سے کوئی بات منوانا چاہتا ہے۔ یہ اس کی بالک ہٹ سے زیادہ اس کی ایسی مجبوری ہے جس سے وہ چاہ کر بھی پیچھا نہیں چھڑا پا رہا۔'' وہ رکی پھر بولی۔'' میں تو بس اتنا جانتی ہوں میں اس کا کوئی دوش نہیں ہے۔ یہ اس کے ارادے کی نہیں بلکہ اس کے اختیار سے باہر کی بات ہے۔ میں نے بہت کوشش کی میں اس عذاب سے نکال سکوں پر ناکام رہی۔ تم بھی کوشش کر لو، تم نے سختی کی تو مجھے ڈر ہے وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گا۔'' اتنا کہہ کر زلیخاں پھر سے دھیمی آواز میں سسکنے لگی۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کیا جائے؟ تم کہو تو اپنے دوست دانیال سے مشورہ کروں؟'' ابراہیم نے تھکے ہوئے اور ہارے ہوئے جواری کی طرح بے بسی اور امید وبیم کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

''نہیں نہیں دانیال یا کسی بھی اپنے قبیلے والے سے بات نہ کرنا۔ اس طرح تو بات قبیلے کے سردار کے پاس پہنچ جائے گی اور پھر تم جانتے ہو اس کا کیا انجام ہوگا۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا اس کی موت کا حکم صادر کر دے گا۔''

''میں اس سے رازداری کا وعدہ لے لوں گا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔'' ابراہیم نے امید بھرے لہجے میں کہا

''پر مجھے اس بات میں کوئی بھلائی نہیں نظر آتی۔ دانیال بھائی چاہے کسی سے کچھ نہ کہیں مگر اس مسئلے کا حل تو ان کے پاس بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔ بلاوجہ بات کسی دوسرے کے ہاتھ میں پڑ جائے گی اور اس کا فائدہ بھی کوئی نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ چپ رہو۔ شاید اللہ کو ہماری حالت پر رحم آ جائے اور اس کے ذہن سے یہ برا خیال خود بخود ہی نکل جائے'' زلیخاں نے کہا۔

''تم اسے بزرگ ماں کو کیوں نہیں دکھاتیں۔ ان کے پاس تو ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ وہ شاید اپنی روحانی کرامات سے اس مسئلے کا بھی کوئی حل نکالنے میں کامیاب ہو جائے۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو میں نے اس بارے میں بھی سوچا ہے پر میں ڈرتی ہوں کہ اگر وہ بھی کچھ نہیں کر سکی تو پھر یہ بات راز نہیں رہ سکے گی اور پھر.....''

اس کے آگے زلیخاں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اچانک دبیز اندھیرے میں اسے ایک چیخ سنائی دی جو سلمان کی

طرف سے ہی آئی تھی۔ وہ شاید سوتے سے ڈر گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس کی طرف دوڑے پر انھوں نے جو منظر دیکھا وہ ان کی حیرتوں کے لیے کافی تھا۔ ان کا سلمان تو سوتے میں ہنس رہا تھا۔ جبکہ انھوں نے تو خود اپنے کانوں سے ابھی کچھ دیر پہلے ایک دلدوز چیخ سنی تھی اگر یہ ہنس رہا ہے تو وہ چیخ پھر کس کی تھی۔ دونوں یہی ایک بات سوچ رہے تھے۔ دونوں نے گہری فکر مندی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں!''

''کیا...؟'' ایک دبی ہوئی سی سرگوشی میں زلیخاں نے ڈر اور خوف کی دبیز چادر سے نکل کر کہا۔

''یہی کہ کہیں ہمارے بیٹے میں انسانوں والی خصلتیں تو نہیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ کہیں پاگل تو نہیں ہو رہا۔ یہ بیماری انسانوں میں عام ہے بلکہ میں تو کہوں گا مجھے اپنی ساری زندگی میں ایسا کوئی انسان نہیں ملا جو تھوڑا بہت پاگل نہ ہو۔ پاگل پن انسانوں کی بڑی گہری پہچان ہے۔''

''یا اللہ ہمارے بیٹے کے حال پہ رحم کر۔ اسے انسانوں کے شر سے محفوظ رکھ میرے مولا!'' زلیخاں نے بڑی دل گرفتگی سے یہ دعا مانگی اور دونوں کچھ دیر تک وہیں اپنے بیٹے کے پاس بیٹھے رہے لیکن کافی دیر بیٹھنے کے بعد بھی اور کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو ان کی پریشانی میں اضافے کا سبب بنتی۔ دونوں کچھ دیر اور بیٹھنے کے بعد خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

''تم بزرگ ماں سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کرنا چاہتیں تو یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ ایک نہ ایک دن تو کسی نہ کسی کو اس بات کی خبر ہو جائے گی اور پھر ہم اپنے بیٹے کو سزا سے نہیں بچا سکیں گے۔''

''میں بھی یہی سوچ کر ڈر سے کانپ رہی ہوں۔ بس اب تو ایک ہی دعا کی جا سکتی ہے کہ صبح جب ہمارا بیٹا نیند سے جاگے تو اس کے ذہن و دل سے یہ انسان بننے کا فتور نکل چکا ہو اور وہ پھر پہلے جیسا ہو جائے۔''

ابراہیم نے آمین کہا اور ساتھ ہی وہ بولا ''ایسا نہ ہوا تو کیا ہوگا؟ اس بارے میں بھی کچھ سوچو۔ خدا بے شک اپنے بندوں اور اپنی مخلوق کی پروا کرتا ہے۔ ان کے کام آتا ہے پر پھر بھی اسی دنیا میں اس کی مخلوق کو سزائیں بھی ملتی ہیں۔ وہ برباد بھی ہوتے ہیں اور بے موت بھی مارے جاتے ہیں۔''

زلیخاں نے شوہر کی تشویش کو ڈوبتی نگاہوں سے دیکھا اور کچھ دیر تک بالکل خاموش ہو گئی۔ ابراہیم نے بھی اصرار نہیں کیا، وہ سمجھ گیا زلیخاں کے پاس اس کی بات کا جواب نہیں ہے اور اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اس ساری مصیبت اور تباہی سے گزریں اور جو خدا ان کی مدد کو آ گیا تو شاید ان کی مشکل حل ہو جائے اور وہ اور ان کا بیٹا اس ساری مصیبت کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کے بھول جائیں۔ پر یہ دونوں باتیں ان کے دلوں کو تسلی دینے کے بجائے ان کے دکھ اور پریشانی میں اضافہ کرتی رہیں اور رات دھیرے دھیرے اپنی ساری ہولناکی سے ان کے وجود کو نگلتی رہی۔ خوف اور رنج و الم ان کی رگوں میں ایسے اترنے لگا جیسے انسانوں کی نسوں میں لہو دوڑا کرتا ہے۔ دیر تک کی خاموشی اور رنجور فضا میں سانسیں لینے کے بعد پھر ایک بار زلیخاں نے بات شروع کی۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہم اسے.... انسانوں کی دنیا میں جانے کی......''

''چپ... چپ کر جاؤ... زلیخاں چپ کر جاؤ.... جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو تم؟'' ابراہیم کو ایک دم جیسے اس کی بات سن کر طیش آ گیا۔ ''ایسی انوکھی اور جن جاتی کے دائروں سے باہر کوئی بات تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔ یہ ناممکن ہے بالکل ناممکن... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... سمجھ گئیں تم...!''

''تو کیا اپنے اکلوتے بیٹے کو یوں سسک سسک کر دھیرے دھیرے مرتے ہوئے دیکھتے رہو گے۔ یا ظالم قبیلے والوں کے حوالے ہو جانے دو گے تاکہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسے موت کی وادی میں دھکیل دیں... بھول گئے کیسے خوش ہوئے تھے تم اس کے پیدا ہونے پر۔ کہتے تھے میں سردار نہیں بنا تو کیا میرا بیٹا قبیلے کا سردار ضرور بنے گا۔''

''ہاں کہا تھا میں نے پر یہ.... کیا بن رہا ہے۔ اور تم مجھ سے کیا کرنے کا کہہ رہی ہو۔ کیا یہی تھا میرا وہ سپنا؟'' ابراہیم کی آواز رندھ سی گئی۔ اس کا دل منوں بوجھ سے بوجھل ہو رہا تھا۔

''اللہ کی مرضی کے سامنے ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''کیا مطلب تم اسے اللہ کی مرضی کہتی ہو، ایسا ہوتا تو خدا اسے جن کے روپ میں پیدا ہی کیوں کرتا۔ وہ کسی انسان کے ہاں بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ خدا کے لیے ایسا کرنا کیا مشکل تھا'' ابراہیم کو بیوی کی بات سن کر غصہ آنے لگا تھا۔

''ابھی تم غصہ ہو اور تمہیں میری بات ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کے امتحان بھی تو لیا کرتا ہے۔ کیا معلوم یہ ہمارا امتحان ہو!''

''بس بس اب چپ کر جاؤ... مجھے ایسی کوئی بات بالکل نہیں سننی... اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ کوئی جن کبھی انسان نہیں بن سکتا۔ یہی اس مالک کا فیصلہ ہے جس نے یہ ساری کائنات بنائی ہے۔'' ابراہیم نے حتمی انداز سے کہا۔

زلیخاں کے پاس اپنے شوہر کی بات کا جواب بھی تھا اور وہ دینا بھی چاہتی تھی۔ پر اس وقت وہ سمجھ چکی تھی کہ ابراہیم کو غصہ آ چکا ہے اور اس وقت کوئی سیدھی بات بھی اسے اوندھی معلوم ہوگی اس لیے مصلحتاً وہ خاموش ہوگئی اور غار کے طویل اور گہرے ماحول میں موت کا سا سکوت طاری ہوگیا۔

............☆☆☆............

صبح کا سورج جیسے گہری اداسی میں لپٹا ہوا طلوع ہوا تھا۔ فضا میں ایک عجیب سی یاسیت گھلی ملی ہوئی تھی اور دور دور تک جیسے کوئی ماتمی جلوس بے زبان اور بے آواز گزر رہا ہو۔ ابراہیم کے غار نما گھر میں بھی ایسا ہی ماحول تھا۔ زلیخاں نے ابراہیم کو یہ سوچ کر ناشتا دیا کہ شاید اسے قبیلے کے سردار کے پاس کام پر جانا ہوگا۔ پر ابراہیم نے ستے ہوئے منہ سے ناشتے کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ اس کا دل بھی اسی طرح بوجھل تھا جیسے زلیخاں محسوس کر رہی تھی۔ اس کی سوچیں شل ہو چکی تھی پر کوئی راستا، کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر تھک چکا تھا اور صبح سے ہر آہٹ، ہر دھڑ کے پر اس طرح چونک چونک پڑتا جیسے قبیلے والے اس کے سلمان کو اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔ ساتھ ہی اس کا دل یہ دعا بھی مانگ رہا تھا کہ اس کا سلمان سو کر اٹھے تو وہ بالکل ایسا ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور وہ سب کچھ تیز ہوا کے ساتھ خس وخاشاک کی طرح بہہ جائے جس نے اس کے من میں بے کلی کو جنم دیا تھا۔ وہ بار بار غار کے اندرونی حصے کی طرف دیکھنے لگتا اور اس کی امید بھری آنکھوں میں ایک ہی آرزو مچل رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا تھا بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ پہلے تھا۔ جیسے سب جنات ہوا کرتے ہیں۔ جب کافی دیر ہوگئی اور اس کے سامنے ناشتا بھی پڑے پڑے اپنی قدر کھو چکا تو اس نے زلیخاں سے پوچھا۔

''کیا سلمان اب تک سو رہا ہے؟''

''نہیں...'' زلیخاں نے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے غصے کو ناپ تول رہی ہو کہ اس کے شوہر کی اب حالت کیسی ہے اور کیا اس حالت میں اسے کوئی بات بتائی جا سکتی ہے جو اس کی سمجھ میں بھی آئے۔

''نہیں کا کیا مطلب ہے؟ سو نہیں رہا تو کہاں ہے؟''

''تمہاری آنکھ لگ گئی تھی سو گئے تھے تم۔ میں جاگ رہی تھی۔ وہ بہت سویرے اٹھا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا''

''اور تم نے اسے روکا بھی نہیں؟''

''روک تو کب سے رہی ہوں پر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ رک جاتا تب بھی ایسا ہی معلوم ہوتا جیسے وہ یہاں ہے ہی نہیں، کسی اور ہی دنیا میں نکلا ہوا ہے''

''وہ کچھ کر بیٹھا تو... کمال کرتی ہو تم؟'' ابراہیم فکر مندی اور عجلت میں اٹھا اور باہر کی طرف جانے لگا۔

''اطمینان رکھو ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ اس نے وعدہ کیا ہے مجھ سے۔ اپنی ماں سے کہ وہ اپنا بہت خیال رکھے گا''

زلیخاں کی بات کو ایک لمحے رک کر ابراہیم نے سنا اور پھر بنا کوئی ردعمل ظاہر کیے غار سے باہر نکل گیا۔ زلیخاں نے ناشتے کی طرف دیکھا جو اسی طرح دھرا تھا جیسے اس نے دیا تھا۔ اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی اور سارے وجود میں پھیل گئی۔

............☆☆☆............

باہر نکل کر ابراہیم نے دور تک دیکھا مگر اسے سلمان کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اِدھر اُدھر اسے دیکھنے لگا اور جب ایسی کسی جگہ پر اسے سلمان دکھائی نہ دیا تو اسے یکلخت ڈھیروں پریشانی نے گھیر لیا۔ جب اسے سلمان کہیں نظر نہیں آیا تو وہ تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑ کر اسے ڈھونڈنے اور آوازیں دینے لگا۔ پھر پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنے لگا نیچے سے جس کا منظر صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جیسے جیسے وہ اوپر چڑھ رہا تھا ویسے ویسے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ انجانے وسوسے اس کے دل کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے اور اسے اپنے بیٹے کی اس بالک ہٹ پر کبھی زوروں سے غصہ آنے لگتا اور کبھی وہ اس کی محبت میں خدا سے دعا مانگنے لگتا کہ خدا اس کے بیٹے کی حفاظت کرنا۔ یہی سب سوچتا ہوا اور اسی قسم کی کیفیت میں جب وہ پہاڑ کی اونچی چوٹی پر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر ایک لمحے کو حیرانی ہوئی کہ اس کا سلمان ایک خطرناک چوٹی پر اس طرح سو رہا تھا جیسے وہ کوئی مخمل کا آرام دہ بستر ہو۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ ایسا کیا روگ ہے جس نے اس کے سلمان کا دل یوں پکڑ لیا ہے کہ اس کے من سے موت کا خوف بھی نکل چکا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، اسے اس بات کی پرواہ نہیں رہ گئی کہ اگر وہ سوتے ہوئے بے خیالی میں پہاڑ کی چوٹی سے لڑھک جائے تو کیا ہوگا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے...ابراہیم نے جلدی سے اس کو جا کے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا ہو کہ اگر اس نے ذرا بھی دیر کر دی تو سلمان کو وہ پھر کبھی دیکھ نہیں سکے گا...لیکن جیسے ہی ابراہیم نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تو آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے بنا سلمان بولا "بابا میں جاگ رہا ہوں" ابراہیم چونکا۔

"اچھا جاگ رہا ہے اور بنا آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے۔ یہ کیسے جانا کہ یہ میں ہوں تیرا بابا؟"

"کمال کرتے ہو بابا! کیا میں اپنے بابا کے ہاتھوں کو بھی نہیں پہچانوں گا۔ بچپن سے ان ہی ہاتھوں میں کھیل کے بڑا ہوا ہوں اور پھر اتنی اونچی چوٹی پر چڑھ کے آنے اور مجھے اپنے ہاتھوں کے جھولے میں بھرنے کی کون جرأت کر سکتا ہے" سلمان نے لبوں پر ایک تبسم لاتے ہوئے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ سلمان کو مسکراتے دیکھ کر ابراہیم کا غصہ جیسے پل کی پل میں کافور ہو گیا اور اس نے اسے ہموار سطح پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے تو پھر مجھے ایک بات کا جواب دے۔"

"پوچھو!"

"تجھے اپنے بابا سے کوئی محبت بھی ہے یا بس اس کے ہاتھوں کو ہی پہچانتا ہے؟"

"ارے بابا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دنیا کی ایسی کون سی مخلوق ہے جو اپنے ماں باپ سے محبت نہ کرتی ہو۔ اور جو بابا تیرے جیسا ہو تو محبت کرنا نہ بھی چاہو تب بھی محبت خود بخود دل میں جگہ بنا لیتی ہے" سلمان کی بات سن کر ایک لمحے کو ٹکٹکی باندھ کر ابراہیم نے اسے دیکھا اور پھر بولا۔

"ایسی بڑی بڑی باتیں کس نے سکھائیں تجھے۔ وہ بھی اتنی چھوٹی سی عمر میں؟" وہ رکا "دیکھ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا" ابراہیم نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"بابا میں سچ بولوں گا تب بھی تمہیں وہ سچ نہیں لگے گا، اس لیے اس بات کا مجھ سے جواب نہ مانگو۔" سلمان نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا اور پہاڑی کی سطح سے اٹھ کر ایک کنکر دور گہرائیوں میں پھینکتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ کافی دیر سے وہاں کھیل رہا تھا۔ اسی دوران کسی نے اس سے کوئی بات کی اور اس نے اسی مصروفیت میں اس بات کا جواب کچھ بے نیازی سے دیا۔

"اچھا ادھر آ، یہاں بیٹھ میرے پاس...اور یہ ایسی گھپاؤں میں پتھر کنکر پھینکنے کا کیا فائدہ ہے۔ کیا تجھے دکھائی دیا کہ تیرا پھینکا ہوا کنکر کہاں سے کہاں جا کے گرا؟" اپنے بابا کی بات سن کر سلمان ایک لمحے کو رکا اور اس نے بابا کی طرف دیکھا اور بولا "بابا تو کیا جو چیز نظر نہیں آتی وہ اپنا وجود بھی کھو دیتی ہے؟"

"اب یہ کیا بات ہوئی، میں ایک بات کروں اور اور تو دوسری بات کرے۔ اس طرح تو یہاں پورا دن گزر جائے گا اور ہم اپنی اصل بات بھی نہیں کر سکیں گے، جو ہم ایک دوسرے سے کرنا چاہتے ہیں۔" ابراہیم نے جھنجلا کر کہا اور اسے یہ بھی حیرت ہوئے چلی جا رہی تھی کہ اس نے آخر کب سے اپنے بیٹے سے بات نہیں کی تھی۔ اسے کیوں پتا نہیں چلا کہ اس کا

اپنا سلمان ایسی بڑی بڑی اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں کرنے لگا ہے۔ پر وہ تو اس سے ہر روز اور جب جب گھر پہ ہوتا تھا بات کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اس وقت کوئی مصروفیت ہوتی ہی کب تھی۔ پھر یوں بھی اسے اپنے بیٹے سے بات کرنا دنیا میں سب سے اچھا لگتا تھا اور وہ تو یہ چاہتا تھا کہ ہر وقت اپنے بیٹے کی باتیں سنتا رہے اور اس سے باتیں کرتا رہے۔ وہ تو سرداری کی لگائی ہوئی ڈیوٹیوں کی وجہ سے اسے کبھی کہیں اور کبھی جانا پڑتا تھا۔ قبیلے کے سردار کی بات ٹالنے کا کوئی قانون تھا نہ روایت۔ اس کا مطلب قبیلے سے بغاوت لیا جاتا تھا اور ایسے جن کو بڑی کڑی سزا دی جاتی تھی۔ سزا بھی ایسی کہ اسے پھر جنات کا کوئی قبیلہ اپنے گروہ میں شامل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ روایت جانے کتنی صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

''بابا کہاں کھو گئے؟'' سلمان نے اسے محویت میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

''کہیں نہیں بس یہ سوچ رہا تھا کہ میں تو روز ہی تجھ سے باتیں کرتا تھا اور گھنٹوں ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہا کرتے ہیں۔ پر ایسی باتیں تو تُو نے کبھی مجھ سے نہیں کیں، میں یہ سوچ کر اور جان کر بھی حیران ہوں کہ اس عمر میں یہ تو بہت چھوٹی عمر ہے کبھی کسی جن بچے نے ایسی باتیں نہیں کیں۔ پھر تجھے یہ باتیں کس نے سکھائیں؟''

''کون سی باتیں؟''

''ایسی گھور اور گہری باتیں جو ابھی تُو نے کیں!''

سلمان کو ہنسی آ گئی ''ارے بابا آپ بھی کمال کرتے ہو۔ یہ کون سی ایسی گہری بات ہے۔ یہ تو روز کی بات ہے اور سامنے کی بات ہے۔ ہماری ایک دنیا ہے پر یہ انسانوں کو نظر نہیں آتی پر ان کی دنیا ہمیں نظر آتی ہے۔ تو کیا وہ یہ نہیں مانتے کہ ہم بھی ہیں اسی دنیا میں؟''

''جو قرآن مجید میں یہ نہ بتایا جاتا کہ جنات ہوتے ہیں تو مجھے یقین ہے انسان کبھی اس بات کو نہ مانتے کہ جنات ہوتے ہیں اور اب بھی بہت سے انسان ایسے ہیں جو اس بات کو نہیں مانتے۔ کوئی دوسرا مانے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں'' ابراہیم نے سلمان کی بات کے جواب میں کہا۔

''اور اللہ... اسے تو وہ بنا دیکھے ہی مانتے ہیں۔ اسے بھی تو کسی نے نہیں دیکھا!''

سلمان کی یہ بات سن کو ابراہیم پھر لاجواب ہو گیا اور ایک بار پھر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا جیسے وہاں اسے کوئی اجنبی سی روشنی پھوٹتی نظر آ رہی تھی، جو اس کے لیے بالکل انجان تھی۔ اور وہ بار بار اپنے بیٹے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ پھر یکا یک ایک خیال برق کی سی تیزی سے اس کے دماغ میں کلبلایا ''اگر وہ اسی طرح سلمان کے سامنے کمزور پڑتا رہا تو پھر وہ اس سے اپنی بات نہیں منوا سکے گا۔ اس لیے اسے خود کو اسی طرح مضبوط بنائے رکھنا ہو گا جیسا کہ وہ ہے اور سلمان تو کیا سارا قبیلہ اس کی تنومندی اور بہادری کی مثالیں دیا کرتا ہے۔

''اچھا چھوڑ ان باتوں کو گھر چلتے ہیں۔ تیری ماں پریشان ہو رہی ہو گی اور اب تو یوں بھی کافی وقت بیت چکا ہے۔''

ابراہیم نے اٹھتے ہوئے کہا ساتھ ہی سلمان بھی اٹھ کر چلنے کو تیار ہو گیا۔

''آپ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے؟'' سلمان نے اپنے والد کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے کہا۔ وہ چاہتا تھا اس کے والد اس سے بات کریں تا کہ اس کی خواہش کی تکمیل کا کوئی راستا نکل سکتا ہو۔ ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلمان نے سر اٹھا کر اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ بھی خاموشی سے چلنے لگا۔ راستے میں وہی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ جو ان راستوں کی پہچان ہے۔ آج سے پہلے کبھی سلمان نے اس ویرانی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اب وہ پھر کہیں کسی ایسی دنیا میں کھو چکا تھا جس کے دروازے سے داخل ہونے میں اسے کوئی اختیار نہیں تھا اور وہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے بھی کبھی کسی بھی وقت وہاں جا نکلتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا اور ابراہیم چلتے چلتے چونکا اس نے زور سے سلمان کا ہاتھ دبایا پر سلمان نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور پھر ابراہیم کو لگا جیسے سلمان کے وجود میں کوئی طاقت ہی نہیں رہی ہو۔ اس نے ہاتھ نہ پکڑا ہوتا تو سلمان ضرور وہیں زمین پر ڈھیر ہو جاتا۔ ابراہیم نے اسے جلدی سے اپنی گود میں اٹھایا اور غار کی طرف دوڑ لگا دی۔

............☆☆☆............

وہ بہت دیر سے اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے ہوسٹل کا راستا کیسے بھول گیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ بھٹک کر وہ کہاں آنکلا تھا۔ رات بھی ایسی گہری اور ڈراؤنی تھی کہ سنسان پڑی گلیوں اور آبادیوں پر اندھیرے کی چادر تنی ہوئی تھی۔ اسے ساری عمارتیں اندھیرے میں اپنے علاقے کی طرح اونچی نیچی پہاڑیاں ہی معلوم ہو رہی تھیں۔ پتا نہیں کتنی دیر ہو چکی تھی اور اسے اپنے ہوسٹل کا راستا نہیں مل رہا تھا۔ ان گزرے بارہ سالوں میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ آج کیوں ہوا اسے تو ہمیشہ ہی اپنے ہوسٹل کا راستا بنا تلاش کیے ہی مل جاتا تھا۔ بلکہ اسے تو یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے وہاں پہنچ سکتا ہے۔ پھر یہ آج کیا افتاد پڑی۔ کیا ہوسٹل اپنی جگہ سے کہیں اور چلا گیا ہے...؟ اس نے سوچا اگر ایسا ہوتا بھی تو ہوسٹل کی عمارت کو راتوں رات تو اٹھا کر کہیں نہیں لے جایا سکتا۔ پھر کیا وجہ تھی۔ ہوسٹل آخر گیا تو گیا کہاں۔

اس کے عقب میں پہاڑی پر بنا ہوا کوئی پبلک پارک تھا۔ پارک بھی اسی طرح اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا جیسے باقی کا سارا ماحول... اسے خیال آیا کہ اس کی ماں نے کتنا روکا تھا کہ آج کی رات وہ اس کے پاس رک جائے۔ یوں بھی وہ غار میں اکیلی تھی۔ اس کا باپ ابراہیم سردار کے کسی کام سے کسی ایسی جگہ گیا ہوا تھا۔ جہاں سے اس کی واپسی دو روز سے پہلے نہیں ہو سکتی تھی۔ پر اسے خوف تھا کہ اگر وہ ایک رات اور ٹھہر گیا اور اس کا باپ واپس آ گیا تو وہ اسے ایک ہفتے سے پہلے جانے نہیں دے گا اور یوں اس کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔ دو دن بعد تو اس کا امتحان تھا۔ پہلے ہی اسے یہ سوچ کر اداسی نے گھیرا ہوا تھا کہ اس امتحان کے بعد شاید اسے مدرسے سے فارغ کر دیا جائے گا اور اسے نہ چاہتے ہوئے بھی واپس اپنے گھر جانا ہوگا۔ جو وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ پر ابھی جتنے دن اس کے مدرسے میں باقی تھے انھیں تو چین سے گزار لے، باقی کی پریشانی کے بارے میں بعد میں سوچے گا۔ یہ سوچ کر وہ خود کو مطمئن کر چکا تھا۔ لیکن اب اس نئی مصیبت کا کیا کرے، اسے اپنا مدرسہ یا اس کا ہوسٹل کچھ بھی تو سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتنی بار وہ گول گول گھوم چکا تھا اور ہر بار ذہن پر زور ڈالتا تھا کہ اس طرح اس رستے پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا اور یہاں سے جو گلی اندر کی طرف جاتی تھی اس کے سامنے ہی ہوسٹل کی بڑی سی عمارت تھی لیکن آج وہ اپنی پہچان کے رستے پر کئی بار جا چکا تھا۔ سب کچھ اسی طرح تھا لیکن جیسے ہی وہ مدرسے کے سامنے پہنچتا تو وہاں اسے مدرسے کی جگہ بنگلوں کی ایک وسیع قطار دکھائی دیتی اور ہوسٹل یا مدرسے کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ آبادی بھی ایسی تھی کہ یہاں سب ہی لوگ اپنے گھروں میں جا دبکے تھے اور ہر طرف سناٹے کی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ اسی وقت اسے دور ایک بنگلے میں روشنی جلتی ہوئی نظر آئی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے اپنا قد احتیاط سے بجلی کے پول سے بھی لمبا کر لیا اور اس بنگلے میں جھانک کے دیکھنے لگا۔ بنگلے کا چوکیدار تھا جو اپنے کیبن سے نکل کر باہر کی طرف جا رہا تھا۔ سلمان نے سوچا اس سے پوچھنا چاہیے اور یہ سوچ کر وہ جلدی جلدی چلتا ہوا اس چوکیدار کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلدی ہی سلمان نے اس چوکیدار کو جا لیا۔

"بھائی صاحب ذرا بات سنیے!" چوکیدار ٹھٹکا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر جیسے ہی اس کی نظر سلمان پر پڑی اس کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی اور وہ ایک دم خوف سے کانپنے لگا۔ اس سے پہلے کہ سلمان اس سے کوئی اور بات کرتا وہ اپنی پوری طاقت جمع کر کے بھاگ کھڑا ہوا اور اس تیزی سے اس نے اپنے بنگلے کے اندر چھلانگ لگائی کہ سلمان اس کی پھرتیاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں کسی انسان کو اتنی تیزی سے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت اسے اس بات پر تھی کہ اس چوکیدار نے ایسا کیا کیوں۔ میں نے بس ایک بات ہی تو کی تھی، اس پر ایسا خوفزدہ ہو جانا... بڑا عجیب لگا سلمان کو۔ اس نے سنا تھا پیسے والے بڑے لوگ ڈرپوک ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ بندوق بردار چوکیدار رکھتے ہیں لیکن چوکیدار بھی ان ہی کی طرح ڈرپوک اور بزدل ہوتے ہیں تو انھیں رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ کیا ان پیسے والوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ یہی سوچتے ہوئے وہ واپس ہونے لگا تو ایک جھکے ہوئے درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بچا معاً اس کے لبوں پر ایک طویل مسکراہٹ بکھر گئی اور اسے چوکیدار کا خوف زدہ ہو جانا سمجھ میں آ گیا جلدی اور گھبراہٹ میں وہ خود کو انسانی قد کے برابر لانا بھول گیا تھا اور چوکیدار نے اسے جن کے لمبے بلکہ بہت لمبے قد کے ساتھ دیکھا تھا اسی لیے اس بے چارے کے اوسان جواب دے گئے اور وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ سلمان نے خود کو پھر سے اسی چھ فٹ والے قد میں واپس قید

کیا، جس کے بعد اسے درخت کے نیچے سے بنا جھکے ہوئے اور بنا ٹکرائے نکل جانے کا راستا مل گیا۔
ابھی اس نے چند قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ اسے قریب کے ایک گھر کے ٹیرس پر کسی انسان کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ رکا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں دیکھنا دشوار تھا اور اپنے جن بننے والی حرکت کا خمیازہ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی بھگتا تھا اس لیے وہ آنکھیں جما جما کے اس ہیولے کو انسانی روپ میں ہی دیکھنے لگا۔ اسے اتنا تو پتا چل چکا تھا کہ وہ کوئی عورت تھی۔ پھر جیسے ہی وہ عورت سلمان جہاں کھڑا تھا اس جانب مڑی تو سلمان کی آنکھیں جیسے پلک جھپکنا ہی بھول گئیں، خیرہ ہو گئیں... وہ عورت نہیں بلکہ کوئی اٹھارہ انیس سال کی لڑکی تھی اور لڑکی کیا تھی کوئی اپسرا تھی یا کوئی جنت کی حور تھی۔ سلمان نے اتنی خوبصورت لڑکی اپنی ساری زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ جیسے بس دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ اندھیرے میں اس اپسرا کا حسن دو آتشہ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بجھے ہوئے سے رنگ کا کوئی ٹراؤزر اور ایک سفید رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پتا نہیں رات کے اس پہر وہ کیوں اس طرح اپنے ٹیرس پر بے چینی سے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ جب آس پاس کے سب ہی لوگ سو رہے ہیں، خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں، تو وہ اس طرح کیوں جاگ رہی ہے اور مسلسل مگر آہستہ آہستہ ٹہل رہی ہے۔ ایسا کیا ہوا، کون سی بات اسے پریشان کیے ہوئے ہے۔
سلمان کے ذہن میں سوالات کی بوچھار تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی... اس کا دل بری طرح مچلا اور وہ اس حسن کی دیوی کے سامنے جانے اور اس کا دیدار عین اس کے روبرو ہو کے کرنے کا سوچنے لگا لیکن اسی وقت اس کے قدم تھم گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے، ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے جن بن کر کسی انسان کے سامنے پہنچنے کا تماشا دیکھ چکا تھا۔ تو کیا کیا جائے، انسان بن کر کسی کے گھر میں اور وہ بھی کسی کے گھر کے ٹیرس پر کس طرح پہنچا جا سکتا ہے... ایک کشمکش تھی جس نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اور پھر جیسے اس کی سمجھ میں کوئی بات آ گئی.... اطمینان اس کے چہرے پر پھیلنے لگا۔

...........☆☆☆...........

لڑکی پتا نہیں کس دھیان میں اس طرح ٹہل رہی تھی کہ اس کے شعور کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا ایک طرف کا چکر کتنے قدموں کے بعد پورا ہو جاتا ہے اور اسے واپس مڑنا ہوتا ہے ورنہ وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹکرا سکتی ہے۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور رنگ گورا تھا۔ اس کا ناک نقشہ ایسا تھا جیسے حسن کی ساری تعریفیں اس پر آ کر ختم ہو چکی ہوں۔ وہ ضرور کسی عالمی مقابلہ حسن میں حصہ لینے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا جسم بلا کا پرکشش تھا اور وہ کوئی ایسا مجسمہ دکھائی دیتی تھی جسے کسی مصور نے برسوں کی محنت کے بعد تراشا ہو۔ صراحی دار گردن میں ایک باریک سی چین میں کوئی لوکٹ پڑا ہوا تھا اور وہ ایسی ادا اور تمکنت سے چل رہی تھی کہ لوکٹ لہرا کر اس کے سینے کے ابھاروں سے ٹکراتا تھا۔ کوئی فیشن ماڈل بھی ریمپ پر کیا چل سکتی ہے، جس قیامت کی اس کی چال تھی۔
اتنا سب کچھ اگر کسی ایک جگہ جمع ہو جائے تو کوئی انسان ہی کیا کوئی جن بھی اس اس نشے میں مسحور ہو کر دیوانہ ہو سکتا ہے اور سلمان کو ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اسے عشق کے زہر نے ڈس لیا ہے۔ اس کے روم روم میں سرسراہٹ ہو رہی تھی چیونٹیوں کے قافلے ہلا مچاتے ہوئے اس کے وجود کو تہ و بالا کیے دے رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا اگر یہ لڑکی اسے مل جائے تو وہ ساری زندگی اس کے لیے انسان بنے رہنے کی شرط کو ایک لمحہ بھی بنا سوچے مان سکتا ہے۔
لڑکی اپنی محویت میں جیسے ہی اس کی طرف پلٹی تو اسے اپنے سامنے ایک کالا سیاہ بلا بیٹھا دکھائی دیا۔ اور وہ اسی طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسیت تھی کہ لڑکی کو اپنے رگ و پے میں خوف تیرتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کسی بلے کی آنکھوں میں ایسی چمک پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکی کہ اس بلے کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے۔ وہ اسے کیا نام دے۔ لڑکی کے حرکت کرتے ہوئے پاؤں ایکا ایکی تھم چکے تھے۔ اور وہ مسلسل اس بلے سے خوفزدہ سی ہو کر یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں بلا اس پر حملہ تو نہیں کرنے والا۔ عین اسی وقت بلے کی "میاؤں" گونجی اور ساتھ ہی خوف اور ڈر سے لرزتی ہوئی لڑکی کی ہولناک چیخ سے آس پاس کا سارا علاقہ دہل سا گیا!!

([illegible] کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں)

زہر بھری دنیا سے 3 سنسنی خیز ناگ بیتیاں



محمد سلیم اختر

سانپ کی بددعا سے وجود میں آنے والی وہ حقیقت، جو آج بھی عبرت نگاہ ہے

رات کے ایک بجے کا وقت تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی نے مجھے گہری نیند سے جگا دیا۔ میں نے بیڈ پر لیٹے اور آنکھیں بند کیے ہی فون سنا.... ہیلو ڈاکٹر رضوی! میں سکندر علی بول رہا ہوں۔ اتنی رات گئے فون کرنے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں اس وقت کراچی آیا ہوں۔ تمہاری بھابی کی طبیعت خراب ہے۔ پریگنسی کیس ہے۔ ایک احسان کرو۔ اس کو اپنے اسپتال میں داخل کرادو۔ میں صبح پہنچ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے سکندر! میں کچھ کرتا ہوں۔'' میں نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

میں اٹھا گاڑی نکالی۔ پہلے میں سکندر کے گھر گیا وہاں سے اس کی بیوی کو لیا اور اسپتال میں داخل کر دیا۔ لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں کو ہدایت دے کر گھر لوٹ آیا۔ اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اگلی صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی تو اسپتال پہنچنے میں بھی دیر ہوگئی۔ ابھی میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ گائنی وارڈ کی ایک نرس میرے کمرے میں داخل ہوئی اور گھبراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ نے جس خاتون کو رات ڈلیوری کے لیے داخل کیا تھا۔ اس نے ایک عجیب الخلقت بچے کو جنم دیا ہے۔''

نرس کی بات سن کر میں پریشان سا ہو گیا۔ میں اٹھا اور اس کے ساتھ ہولیا۔

میں گائنی وارڈ کے کمرے میں پہنچا تو سکندر کی بیوی بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے پہلو میں جو بچہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر، چہرہ، آنکھیں، منہ اور گردن تو انسانی شکل میں تھے۔ مگر اس کا باقی نچلا دھڑ سارا کا سارا سانپ کی شکل میں تھا۔ پہلے تو میں خوفزدہ ہوا اور پریشان بھی ہوا۔

سکندر کی بیوی کے چہرے پر بھی خوشی اور سکون کا تاثرات نہ تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اس موقع پر کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔

''میں سکندر کو فون کرتا ہوں کہ وہ جلد آ جائے'' میں نے اس کی بیوی کو مخاطب کر کے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا اور پھر سکندر کو فون کر دیا کہ وہ آج لازمی آ جائے۔'' میں نے صرف اسے اتنا بتایا کہ ڈلیوری خیریت سے ہوگئی ہے۔ فون بند کر کے میں ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

☆......☆......☆

میں اور سکندر کلاس فیلو اور روم فیلو بھی تھے۔ میری اور سکندر کی پہلی ملاقات کالج کے ایک ہوسٹل میں ہوئی تھی۔ میں گجرات کے ایک نواحی قصبے سے آیا تھا۔ جب





کہ سکندر کا تعلق منڈی بہاؤالدین کے ایک گاؤں سے تھا۔ میرے ابا جان ڈاکٹر تھے، اس لیے وہ مجھے بھی ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ میں بھی ڈاکٹر ہی بننا چاہتا تھا۔ ہمارے مالی حالات بہتر تھے۔ ہمارا پورا خاندان ہی شریف لوگوں کا خاندان کہلاتا تھا سب اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی اور ناراضگی نہ تھی۔ سکندر کا تعلق ایک زمیندار خاندان سے تھا۔ اس کا باپ بہت بڑی جائیداد کا مالک تھا۔ سکندر ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ خود سر اور ضدی ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے ایک ہفتہ قبل ہی کالج آ گیا تھا اور رہائش ہوسٹل میں رکھی تھی۔ ایک کمرے میں دو طالب علم رہ سکتے تھے۔ یہ اتفاق تھا کہ مجھے اسی کمرے میں بیڈ الاٹ کیا گیا...... میں شام ڈھلنے سے قبل ہی ہوسٹل پہنچا تھا۔ میں اپنے کمرے کے بارے میں پوچھ ہی رہا تھا کہ سینئر اسٹوڈنٹس نے مجھے...... ’’فرسٹ ایئر فول ‘‘کا نشانہ بنالیا...... سکندر کو جب معلوم ہوا کہ اس کے روم میٹ کو لڑکوں نے فول بنایا ہوا ہے تو وہ ان سے ٹکرا گیا۔ اس نے کئی کی ایسی درگت بنائی کہ اس کے بعد انہوں نے کسی اور کو فول نہ بنایا ہوگا۔ میں پہلے دن سے ہی سکندر کی بہادری کا قائل ہو گیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ بس پہلے دن سے ہی ہم دوست بھی بن گئے۔

میرے اور سکندر کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ جھگڑالو تھا۔ جبکہ میں امن اور صلح پسند تھا۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی وہ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا جبکہ میں کتابی کیڑا بنا ہوا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی ہماری دوستی برقرار تھی اور کامیابی سے چل رہی تھی۔ ہماری پسند ناپسند مختلف تھی۔ سکندر کے لہجے میں بناوٹ نہ تھی، بلکہ تختی تھی۔ وہ سچ بات منہ پر کہنے کا عادی تھا۔ مجھے اس کی ایک عادت بہت بری لگتی تھی۔ وہ انسانوں سے تو لڑائی جھگڑا کرتا تھا۔ مگر انسانی کے علاوہ جو جاندار ہیں پالتو جانوروں کے علاوہ دیگر تمام جانداروں سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ ان کو جان سے مار ڈالنے کا عادی تھا۔ اسی لیے وہ ایک بہترین شکاری بھی تھا۔

☆......☆......☆

ان دنوں کالج میں چھٹیاں تھیں۔ تو وہ مجھے اپنے ہمراہ اپنے گاؤں لے گیا۔ گاؤں میں بھی اس کے وہی انداز اور اطوار تھے۔ میں اس کے ہمراہ شکار پر دو تین بار گیا تھا۔ وہ ایک ماہر نشانے باز بھی تھا۔ اس کا کوئی بھی نشانہ خطا نہ ہوتا تھا۔ اس کے گاؤں کے قریب ہی دریا بہتا ہے۔ سردیوں کے دن تھے۔ سردیوں میں دریا اپنے پاٹ سے بہت کم حصے میں نہر کی طرح بہتا ہے اور اس کے کنارے بہت ہی اونچے ہو جاتے ہیں۔ جن کی اونچائی پندرہ بیس فٹ تک ہو جاتی ہے۔ ان دنوں بھی ایسی صورت حال تھی...... میں اور سکندر دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ سکندر کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ دریا کے کنارے بنے ہوئے مٹی کے بڑے بڑے تودوں کو اپنے پاؤں سے دھکا دے کر پانی کے اندر گرانے لگا جب بہت بڑا مٹی کا تودا دریا میں گرتا تو اس سے پانی میں ایک طلاطم سا برپا ہو جاتا اور آندھی کی مانند مٹی کا غبار سا پھیل جاتا۔ اس کھیل سے سکندر بہت خوش ہو رہا تھا جبکہ مجھے یہ سب کچھ بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی سکندر اس کھیل کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ میں بے چارگی سے اسے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی خوفزدہ بھی ہو رہا تھا۔ کہ کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ پیش آ جائے۔

اسی طرح بڑے بڑے مٹی کے تودوں کو گراتے ہوئے سکندر نے مٹی کے ایک بڑے ڈھیر کو دھکا دیا...... وہ تو دریا میں گرا طلاطم بپا ہوا، غبار جب بیٹھ گیا...... تو ہمیں اس مٹی کے تودے کی تہہ میں نہایت ہی چمکیلے سانپ کے بچے دکھائی دیے۔ سکندر کے دماغ میں نہ جانے کیا سمایا کہ اس نے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کو اٹھایا اور بلندی سے زور لگا کر سانپ کے بچوں کے اوپر پھینک دیا۔ وہ پتھر اتنا بھاری تھا کہ تینوں سانپ کے بچے دب کر مر گئے۔ سردی کے موسم میں سانپ لمبی نیند سوتے ہیں اور موسم بدلنے کے بعد تازہ دم ہو کر باہر آتے ہیں۔

جب ہم واپس گھر لوٹنے لگے تو میں نے دیکھا کہ ایک ناگن کیچڑ والے پانی سے نکلی اور اس پتھر کے گرد چکر کاٹنے لگی، جس کے نیچے اس کے بچے دب کر مر

گئے تھے۔ میں اور سکندر واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ میں بادل نخواستہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن میرا دھیان پتھر کے نیچے دبے ہوئے سانپ کے بچوں کی طرف تھا۔ جبکہ سکندر کو اس کی بالکل پرواہ نہ تھی اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کا یہ ایڈونچر اس کی زندگی میں تلخ تجربے کی شکل دھار لے گا۔ اور ان معصوم جانوں کی موت اس کی آئندہ زندگی میں زہر گھول دے گی۔

میں تین دن اس کے گاؤں میں گزار کر لوٹ آیا اور باقی چھٹیاں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاریں۔ میں نے گھر والوں کو بھی سکندر کی اس حرکت کے بارے میں بتایا تھا۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میں اس واقعے کو بھی بھول گیا۔

☆......☆......☆

پھر چند برس اور بیت گئے۔ میں ڈاکٹر بن گیا اور ایک سرکاری اسپتال میں جاب کرنے لگا۔ سکندر نے ایف ایس سی تھرڈ ڈویژن میں کی اور پھر اپنے والد کے تعلقات کی بنا پر ایک سرکاری ادارے میں بطور انسپکٹر ملازم ہو گیا۔ اب ہماری ملاقات کبھی کبھار ہوتی تھی کیوں کہ ہم دونوں کی مصروفیات کافی بڑھ گئی تھیں۔ ہم دونوں نے ہی شادی کر لی تھی۔ پہلے سکندر کی شادی ہوئی تھی۔ جو اس کے والدین کی پسند تھی۔

زینت...... سکندر کی برادری کی تھی۔ صورت کے ساتھ ساتھ اس کی سیرت بھی خوب تھی۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حافظہ قرآن تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ نماز، روزہ اور دیگر دینی احکامات کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں بہت ہی پیار تھا۔ ان کی جوڑی بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ سکندر اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا مگر وہ نماز روزے کی پابندی نہ کرتا تھا۔ زینت اسے کہتی ہی رہتی تھی۔ مگر وہ اس کی طرف توجہ نہ دیتا تھا۔

میں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ بشریٰ میڈیکل کالج میں میری کلاس فیلو تھی۔ وہاں سے ہی ہماری محبت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔ بشریٰ ایک ماہر گائنا کالوجسٹ ہے۔ اور اسی اسپتال میں کام کرتی ہے جہاں میں جاب کرتا ہوں۔

یوں ہی آٹھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ میں دو بچوں کا باپ بن گیا تھا جبکہ سکندر اور زینت ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ میں اور بشریٰ بھی ان کے بارے میں فکرمند رہنے لگے۔ سکندر کے کہنے پر بشریٰ نے زینت کا ہر طرح چیک اپ کیا۔ اس کے مختلف قسم کے کئی ٹیسٹ کیے اور اس کو مکمل طور پر فٹ قرار دیا۔ مگر سکندر کو اس پر یقین نہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں تندرست ہوں اگر کوئی خامی ہے تو زینت میں ہے اس بات پر بشریٰ اور سکندر میں کئی بار تکرار ہوئی تو بشریٰ نے اسے ویسے ہی کہا کہ...... سکندر بھائی! آپ بھی ٹیسٹ کرا لیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

مگر یہ بات شاید اسے پسند نہ تھی کہ وہ اپنا معائنہ کرائے۔ وہ زینت کو ہی الزام دیتا تھا۔ ہمارے معاشرے کا یہ عجب المیہ ہے کہ ہر خرابی کے لیے عورت کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اولاد سے محرومی کی وجہ بھی عورت ذات ہی ٹھہرائی جاتی ہے، حالانکہ مرد کی شراکت اس میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ جانے کیوں ہم دونوں میاں بیوی کو یہ شک بلکہ یقین تھا کہ نقص سکندر میں ہی ہے، زینت میں نہیں۔ مگر سکندر کسی صورت اپنی توہین برداشت نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہمارے علاج سے مایوس ہو کر زینت کا دیسی علاج کرایا، تعویذ گنڈوں کا سہارا لیا، درباروں پر منتیں مانیں...... مگر وہ باپ نہ بن سکا۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک روز میرے پاس آ کر کہنے لگا۔ ڈاکٹر رضوی! یار کر لو جو تمہیں کرنا ہے۔''

میں نے سکندر کا SEMEN کا نمونہ لیا اور اسے اپنے اسپتال کے بجائے ملک کی ایک مشہور اور قابل اعتماد لیبارٹری میں بھیج دیا۔ جہاں کا پیتھا کالوجسٹ ڈاکٹر جواد جو کہ میرا دوست تھا۔ وہ ایک ماہر پیتھا کالوجسٹ تھا۔ اور اس لیبارٹری میں بھاری تنخواہ پر کام کر رہا تھا۔ وہ نہایت ہی لگن اور ایمانداری سے کام کرتا تھا۔ رپورٹ اگلے دن ملنی تھی۔ مگر شام کو ہی ڈاکٹر جواد کا فون آ گیا، کہنے لگا۔

''ڈاکٹر رضوی! اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہے تو

لیبارٹری آجائیں۔"

"خیریت تو ہے ناں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سکندر کے SEMEN کے بارے میں آپ سے مشورہ اور DISCUSS کرنی ہے۔"

"او کے میں آرہا ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔" اور لیبارٹری روانہ ہوگیا۔

میں جب ڈاکٹر جواد کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ خوردبین پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی فکر آلود سی لگ رہی تھی۔ اور وہ بار بار انہماک سے خوردبین مین دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کوئی انوکھی چیز نظر آرہی تھی۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے خوردبین سے نظریں ہٹالیں۔ اور مجھے دیکھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اپنی آنکھیں عدسوں سے منسلک کیں اور سلائیڈ کا معائنہ کرنے لگا۔ جو ڈاکٹر جواد نے سکندر کے SEMEN سے تیار کی تھی۔ جدید دور کی یہ ایجاد مختلف سیل کو کئی گناہ، پچاس گناہ، سو گنا بڑا اور نہایت روشن کر کے دکھاتی ہے۔ خوردبین کو اپنی آنکھوں سے لگا کر میں نے جو منظر دیکھا۔ اس نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں نے بے شمار SEMEN کے تجربے دیکھے اور کیے تھے۔ لیکن جو کچھ اس خوردبین میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کم از کم ہم دونوں نے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ اور بقول جواد کے میڈیکل سائنس میں ایسا کہیں نہ دیکھنے میں آیا تھا۔"

سکندر کے SEMEN میں لاکھوں جرثومے ادھر ادھر گردش کرتے اور پھر ختم ہو جاتے اور ان بے شمار جرثوموں میں ایک جرثومہ بڑی جسامت کا نظر آتا تھا۔ جس کی شکل سانپ سے مشابہ تھی۔ وہ ان تمام چھوٹے بڑے جرثوموں کو ہڑپ کر جاتا۔ پھر اور جرثومے نظر آتے اور وہ ان کو بھی کھا جاتا۔

یہ ایک پریشان کن منظر اور بات تھی۔ اس لیے کہ اس کا نتیجہ کوئی بھی پیتھالوجسٹ نہیں دے سکتا تھا۔

میں پریشان سا ہو کر لیبارٹری سے لوٹ آیا مگر آکر میں نے بشریٰ سے کیس DISCUSS کیا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم سکندر کو کچھ نہ بتائیں گے۔ اور یہی کہیں گے کہ اس کا ٹیسٹ مثبت ہے۔

☆......☆......☆

میں نے جب اگلے دن سکندر کو بتایا کہ وہ بالکل تندرست ہے۔ تو وہ خوش ہوگیا اور بولا

"میں اسی لیے کہتا تھا کہ میرا ٹیسٹ کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں! سکندر تم ٹھیک کہتے تھے۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی مگر میں ذہنی طور پر الجھ کر رہ گیا۔ اور مجھے وہ منظر یاد آگیا جب سکندر نے برسوں پہلے سانپ کے بچوں کو بے دردی سے مارا تھا یقیناً یہ اسی ناگن کی زہریلی بددعا کا اثر ہوگا جو اس نے سکندر کو دی ہوگی مگر اب کیا کیا جائے؟ سکندر کا علاج کیسے ہوگا؟ اب تو وہ کوئی دوا بھی نہ کھائے گا کیوں کہ میں ہی نے اسے مکمل مرد ہونے کا سرٹیفکیٹ جو دے دیا تھا۔ مگر یہ صرف میں بشریٰ اور جواد ہی جانتے تھے کہ اگر کوئی خرابی ہے تو سکندر کے SEMEN میں ہی ہے اور یہ بددعا کا اثر ہے۔ اب اس کا ازالہ کیسے ہوگا۔ اب تو وہ زینت کو ہی قصوروار گردانے گا۔ حالانکہ وہ تو بے قصور ہے۔ وہ تو ہمدردی کے قابل تھی۔ حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے برس گزر جانے کے باوجود وہ حاملہ کیوں نہیں ہو سکی؟

☆......☆......☆

یوں ہی دو سال اور گزر گئے۔ اس عرصے میں سکندر سے دو تین بار ملاقات ہوئی تھی۔ جب اس نے بتایا کہ اس نے زینت کو طلاق دے دی ہے۔ تو ہم دونوں کو بہت دکھ ہوا۔ بشریٰ نے تو سکندر سے خوب لڑائی کی کہ اس نے زینت کو طلاق دے کر اس پر بہت ظلم کیا ہے۔ مگر سکندر کو ذرا بھی پروا نہ تھی۔ حالانکہ طلاق کی وجہ سے ان کی برادری میں ناراضگی نے بھی جنم لیا تھا۔ اسی لیے اب اس نے گاؤں جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ اسے ایک اسٹیج کی نووارد اداکارہ سے عشق ہوگیا ہے۔ وہ دونوں جلد شادی کریں گے، اور وہ شادی کے بعد اداکاری چھوڑ دے گی۔

پھر ایک ملاقات میں اس نے بتایا کہ زینت کی اپنی برادری میں ہی شادی ہوگئی ہے۔ ہم نے اس کی اس خبر پر کوئی توجہ نہ دی تھی یوں ہی کئی ماہ بیت گئے۔ سکندر نے

اس اداکارہ سے شادی بھی کر لی اور ہمیں دعوت نامہ بھی بھیجا تھا مگر میں نے جان بوجھ کر اس کی دوسری شادی میں شرکت نہ کی تھی۔ البتہ کچھ دنوں بعد ہم دونوں نے اس کے گھر جا کر اسے مبارک باد ضرور دی تھی۔

اس کی بیوی نادرہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ مگر زینت کے مقابلے میں وہ زیرو تھی۔ نادرہ کے بارے میں اخبارات میں کئی اسکینڈل بھی آچکے تھے۔ کئی کے ساتھ اس کا عشق بھی چلا تھا۔ نہ جانے سکندر کیسے اس کے دام میں پھنس گیا تھا۔ مجموعی طور پر نادرہ اچھی عورت نہیں تھی۔ ہم نے اسے سکندر کی بدقسمتی ہی قرار دیا تھا۔

ایک سال بیت گیا تھا سکندر سے ملاقات ہوئے۔ ایک شام وہ ہمارے گھر ہی آ گیا۔ وہ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''زینت ایک بچے کی ماں بن گئی ہے ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ وہ میرے بچے کی ماں کیوں نہیں بن سکی تھی؟ کہیں میری ٹیسٹ رپورٹ غلط تو نہ آئی تھی یا وہ کسی اور کی رپورٹ سے بدل گئی تھی۔''

زینت کے ماں بننے کی خبر سن کر ہم قطعی حیران نہ ہوئے کیوں کہ اس نے ماں تو بننا ہی تھا۔ ہم اپنے جھوٹ پر شرمندہ ہو رہے تھے ہم نے سکندر کی رپورٹ کو مثبت قرار دے کر ہم نے اپنی غلطی پر معذرت کی اور اس کو SEMEN کے معائنے کی تفصیل بتا دی۔ اس روز میں نے سکندر کو بتایا کہ جس روز تم نے سانپ کے بچوں کو بے دردی سے مارا تھا۔ میں اسی دن سے خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اب نہ جانے آنے والے وقت میں کیا ہوگا۔ تمہاری زندگی کے زہریلے لمحے خود تمہاری کرنی کا نتیجہ ہیں۔ شاید وہ زہریلے جانور تمہیں باپ نہ بن سکنے کی بد دعا دیتے ہوں گے۔ انسان کسی سے بھلا کیا نقصان اٹھائے گا جتنا نقصان وہ خود اپنی ذات سے اٹھاتا ہے لیکن اس سے اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ ایسے ہی واقعات احساس پشیمانی میں وقت کے ساتھ ساتھ بڑے ہو جاتے ہیں اور ایک تناور درخت بن جاتے ہیں۔ جنہیں کاٹنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ بد دعا...... ایک مظلوم کی آہ کے اثر سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔''

سکندر کو اپنے ماضی کے بارے میں جان کر کوئی شرمندگی اور پریشانی نہ ہوئی۔ کہنے لگا۔

''تمہاری تمام دلیلیں غلط ہیں۔ تمہیں یہ جان کر حیرانی ہوگی ڈاکٹر رضوی! کہ اب میری بیوی نادرہ امید سے ہے۔ اگر بد دعا اور مظلوم کی دعا اتنا اثر رکھتی تو آج نادرہ امید سے نہ ہوتی۔ چند ماہ بعد وہ ماں بن جائے گی اور اس کی ڈیلیوری میں تمہارے ہی اسپتال میں کراؤں گا۔ تاکہ تمہیں یقین آ جائے۔''

یہ کہہ کر سکندر چلا گیا۔

اور پھر آج اس کا کہا سچ ثابت ہو گیا۔ کہ وہ باپ بن گیا تھا ایک عجیب الخلقت بچے کا باپ...... مجھے یوں لگا جیسے وہ بچہ کہہ رہا ہو۔

''ہم نے اپنا انتقام لے لیا ہے ڈاکٹر صاحب! دیکھ لیں ہماری بد دعا کی معراج۔''

میں مکافات عمل کے اس مظاہرے سے خوف زدہ ہو گیا کہ سکندر آئے گا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔

☆......☆......☆

سکندر کہیں شام کو کراچی سے پہنچا تھا۔ وہ ایئرپورٹ سے سیدھا اسپتال گیا تاکہ اپنے بچے کو دیکھ لے اسپتال پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اس نے اس کے حواس چھین لیے۔ اس نے اسپتال میں ہی نادرہ اور بچے کو اپنے پستول کی گولیوں سے مار ڈالا۔ اور پھر اپنے حواس کھو بیٹھا۔

سکندر ان دنوں جیل میں ہے۔ مگر اب وہ نارمل انسان نہیں ہے۔ وہ دیوانہ اور پاگل ہے۔ میں کبھی کبھار اس سے ملنے جیل جاتا ہوں۔ مگر اب وہ مجھے پہچانتا ہی نہیں ہے۔ جیل والے اس سے اچھا سلوک کرتے ہیں مگر وہ ہر وقت خلاؤں میں گھورتا ہے۔ اس کا کھانا پینا دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ دن بدن موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں اور بشریٰ کبھی کبھی اس نقطے پر بحث کرتے ہیں کہ زینت، سکندر کی اولاد کو کیوں جنم نہ دے سکی۔ یہ اس کے حافظہ قرآن ہونے کا ہی فیض ہے۔ ورنہ وہ اگر سکندر کے بچے کی ماں بنتی تو اس کا بچہ بھی نادرہ کے بچے کی طرح ہو سکتا تھا پھر اس کا انجام بھی نادرہ جیسا ہی ہوتا۔

☆......☆......☆......☆



وفا ہے شرط



شعبان کھوسہ

سو سال بعد انسانی روپ میں آجانے والے ایک ناگ کی وفاداری کی حکایت

خالصہ رنداں پوٹھوہار کے پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک قدیمی گاؤں ہے۔ تقسیم ہند پاک سے قبل یہاں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت تھی۔

آزادی کے بعد ہندو اور سکھ یہاں سے ہجرت کر گئے۔ گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک کنواں تھا۔ جہاں سے سب گاؤں والے پانی بھرا کرتے تھے۔ کنویں سے کچھ فاصلے پر ایک برگد کا بڑا سا درخت تھا۔ اس درخت پر سانپوں کے ایک جوڑے کا بسیرا تھا۔ مگر وہ بے ضرر سانپ تھے۔ انہوں نے کبھی کسی ذی روح کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر پھر بھی گاؤں کے لوگ اس درخت کے نیچے جاکر آرام کرنے یا اس کی ٹہنیاں وغیرہ کاٹنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ برگد کا درخت بہت ہی پرانا تھا اور سانپوں کا جوڑا بھی برسوں سے وہاں رہ رہا تھا۔ برگد کا تنا اتنا بڑا تھا کہ سانپ اس کے اندر گھر بنا کر رہ رہے تھے۔ ساون کے موسم میں وہ جوڑا زمین پر اترتا تو لوگوں کو نظر آتا۔ تب بھی لوگ ان سے ڈر کر دور بھاگتے تھے۔ وہ زمین جس پر کنواں اور درخت تھا، ایک ہندو کی تھی۔ ہجرت کے وقت اس نے وہ زمین گاؤں کے ایک زمیندار عباس خان کو دے دی تھی۔ عباس نے کئی بار ایندھن کی غرض سے برگد کے درخت کو کاٹنے کا سوچا مگر سانپ کے خوف نے اس کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کچھ عرصے بعد مادہ سانپ مرگئی تو نر سانپ اکیلا رہ گیا۔ اس کی جسامت دیکھ کر ہی لوگوں کو خوف آنے لگتا تھا۔

گاؤں کے لوگ کہتے تھے اس سانپ کی عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے اور یہ سانپ اگر سو سال کا ہوجائے گا تو وہ انسانی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مگر ایسی باتوں پر کم ہی لوگ یقین کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے اس سانپ کی عمر سو سال کے قریب ہی ہوگی۔

☆......☆......☆

عباس خان تھوڑا پڑھا لکھا تھا اس لیے اس نے اپنی اولاد کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ انہیں شہر کے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا۔ ان پر محنت کی۔ روپیہ خرچ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا بڑا بیٹا نواز فوج میں کمیشن لے گیا۔ اور دوسرا بیٹا کسی سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوا۔ اسی دوران عباس خان کا انتقال ہوگیا۔ گاؤں میں اس خاندان کی عزت اور زیادہ بڑھ گئی۔ کیوں کہ ان کے پاس جائیداد اور دولت سب سے زیادہ تھی۔

☆......☆......☆

نواز جب فوج سے ریٹائرڈ ہوا تو اس نے بقیا زندگی گاؤں میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کنویں

والی زمین میں باغ لگایا۔ جس میں پھلوں پھولوں کے علاوہ سبزیاں بھی اگتی تھیں۔ اس نے کئی کنال زمین کو باغ کی شکل دی۔ اور اس کے گرد چار دیواری بھی بنوا دی۔ کنواں اور برگد کا درخت اس چار دیواری کے اندر ہی رہے۔ نواز محنتی انسان تھا۔ اس لیے اس کا باغ نہایت ہی خوبصورت اور پھل دینے والا بن گیا۔ اس نے کنویں کو مزید گہرا کیا اور اس میں موٹر لگا کر پانی کی کمی کو مسئلہ بننے نہ دیا۔ انہی دنوں ساون کا موسم آ گیا۔ خوب بارش ہوئی۔ مگر ساون کی اس رت میں سانپ نظر نہ آیا۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے سانپ یقیناً یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہوگا۔ کئی نے نواز کو مشورہ دیا کہ وہ برگد کا درخت کاٹ دے کیوں کہ اس نے بہت ساری زمین گھیر رکھی تھی۔ اس کی چھاؤں تلے کسی قسم کی فصل یا پودے نہ اگ سکتے تھے...... مگر نواز نے ان کے کہنے پر عمل نہ کیا۔ وہ یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ سانپ واقعی یہاں سے چلا گیا ہے جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا اس نے برگد کے درخت کو نہیں کاٹنا تھا...... ایک سال گزر گیا پھر سے ساون آ گیا۔ مگر کسی نے بھی سانپ کی شکل نہ دیکھی۔ اب گاؤں والوں کو یقین ہو گیا کہ یا تو سانپ مر گیا ہے یا وہ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔

☆......☆......☆

ان ہی دنوں ایک شخص پھرتا پھرتا نواز کے گاؤں آیا۔ اور نواز کا باغ دیکھ کر بہت ہی متاثر ہوا۔ اس نے باغ کی خوبصورتی کی تعریف کی اور نواز سے کہا وہ ایک تجربہ کار مالی ہے۔ اور یہ پیشہ اسے وراثت میں ملا ہے۔ اگر وہ اسے موقع دے تو وہ اس کے باغ کی رکھوالی کے ساتھ اس کی تراش خراش کا کام بھی کرے گا۔

نواز اس شخص کی باتوں اور ذہانت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اجنبی کو باغ کی رکھوالی کے لیے ملازم رکھ لیا۔ نواز نے باغ کے اندر ہی اس کے لیے ایک کمرہ تعمیر کروایا۔ اس نے وہاں رہائش رکھ لی۔ اس کے لیے کھانا حویلی سے بھیجا جاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ خود حویلی میں آ کر کھا لیتا تھا۔ اس اجنبی کا نام فضل دین تھا۔ فضل دین نے باغ کی خوبصورتی، پودوں کی تراش خراش، صفائی ستھرائی، گوڈی کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ نواز اس سے بہت ہی خوش تھا۔ فضل دین کی حویلی کے ایک ملازم گلزار



سے دوستی تھی۔ گلزار کبھی فضل دین سے ملنے باغ میں چلا جاتا اور کبھی فضل دین اس سے ملنے حویلی آ جاتا۔ فضل دین کو ہر لمحہ باغ کی ہی فکر رہتی۔ باقاعدگی سے پودوں کو پانی دینا وہ کبھی نہیں بھولتا تھا۔ باغ کے پودوں اور بیلوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ وہ برگد کے درخت کی بھی تراش خراش کرنے لگا تو نواز نے اسے منع کر دیا۔ اور اسے کہا کہ وہ برگد کے درخت کو کاٹنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔

مگر فضل دین نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ اور نواز کو مشورہ دیا کہ وہ اس درخت کو نہ کاٹے۔ اس نے برگد سے کئی فوائد گنوا دیے۔ یوں نواز اس کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے برگد کو کاٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ حویلی کے ملازم کو یہ بات نہ بھائی تھی کہ نواز...... فضل دین کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ اسے فضل دین سے خواہ مخواہ کا سیر ہو گیا ہے۔

فضل دین نے اب اسی وجہ سے حویلی میں آنا بند کر دیا اور اب وہ کھانا بھی باغ کے اندر اپنے ڈیرے پر ہی بنانے لگا۔ گرمیوں کے موسم میں فضل دین کا زیادہ تر وقت برگد کی چھاؤں میں ہی گزرتا تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ فضل دین ایک دو دن کے لیے باغ سے غائب ہو جاتا اور پھر خود ہی لوٹ بھی آتا۔ نہ جانے کیوں نواز نے کبھی اس سے باز پرس نہ کی تھی کہ وہ کہاں اور کیوں جاتا ہے۔

☆......☆......☆

اُن ہی دنوں نواز تمام فیملی کے ہمراہ شہر میں کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس دوران اس کی حویلی میں چوری ہو گئی۔ اس میں نقدی اور زیورات شامل تھے جن کی مالیت لاکھوں میں بنتی تھی۔ چوری کرنے والا ان کا قابل اعتماد ملازم گلزار تھا۔ وہ چوری کرنے کے بعد ایسا غائب ہوا کہ پولیس انتہائی بھاگ دوڑ کے باوجود اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ نواز کو نقصان سے زیادہ گلزار کی نمک حرامی کا دکھ ہوا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ نواز نے اپنے طور پر بھی گلزار کو بہت تلاش کیا مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ نواز نے تھانے والوں سے کہا وہ اس کیس کو داخل دفتر کر دیں مگر وہ نہ مانے اور تفتیش جاری رکھی۔ تھانیداروں اور گاؤں کے ایک دو اور لوگوں کو یہ بھی شک تھا کہ چوری کی واردات گلزار اور فضل دین نے مل کر کی ہے۔ فضل دین نے گلزار کو بھگا دیا ہے۔ اور اب یہ خود بھی بھاگ جائے گا۔ لہٰذا تھانے والوں نے شک کی بنیاد پر فضل دین کو گرفتار کر لیا۔ اور اسے تھانے لے گئے۔ فضل دین نے ان کو یقین دلایا۔ دہائی دی۔ واویلا کیا کہ اس چوری میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ مگر پولیس والے نہ مانے۔ انہوں نے جب فضل کو مخصوص کمرے میں چھتروں کے لیے لے جانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔ انسپکٹر کو غصہ آ گیا۔ اس نے فضل کو ایک غلیظ سی گالی دی اور ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ فضل دین پر اس کی ٹھوکر کا کوئی اثر نہ ہوا۔

”انسپکٹر! میں ملازم ہوں مجرم نہیں۔ مجھے گالی مت دو۔!!“ فضل دین نے التجائیہ لہجے میں کہا مگر انسپکٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے فضل دین کو ایک اور گالی دی اور اسے حوالات میں دھکیل دیا۔

جب پولیس اہلکاروں نے فضل دین پر تشدد کرنا چاہا تو حوالات میں دھواں سا بھر گیا۔ جلد ہی دھواں بھی اڑ گیا...... تو پولیس کے سپاہی یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے کہ اب حوالات میں فضل دین تو موجود نہ تھا بلکہ وہاں ایک بڑا سا ناگ لہرا رہا تھا۔ ناگ نے ایک سپاہی کو ڈس لیا اور وہ حوالات کے اندر ہی فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ دیگر اہلکاروں نے ساتھی کا یہ حشر دیکھا تو بھاگ گئے بلکہ ان کا ساتھی دم توڑ گیا۔ تھانے والوں نے دیکھا کہ اس ناگ نے پورے تھانے میں ایک چکر لگایا اور سب کو خوفزدہ کر کے وہاں سے کہیں چلا گیا۔

اس کے بعد لوگوں نے اس ناگ کو ابھی تک کہیں نہیں دیکھا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی حیران تھے اور کہتے تھے کہ یہ وہی سانپ تھا جو برگد کے درخت میں رہتا تھا۔ سو سال کا ہونے کے بعد وہ فضل دین کی شکل میں انسانی روپ میں سامنے آیا تھا۔

جلد ہی لوگ اس واقعے کو بھول گئے ...... مگر پھر حالات نے غیر متوقع طور پر پلٹا کھایا...... گلزار نہ جانے کہاں سے آ نمودار ہوا......

آدھی رات سے زیادہ بیت چکی تھی۔ نواز اپنی خواب گاہ میں میٹھی نیند سو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی جس سے نواز کی آنکھ کھل گئی۔

وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اس نے سامنے گلزار کو کھڑا پایا اور پھر حقیقت کو خواب سمجھتے ہوئے کروٹ بدل کر سو گیا

۔لیکن اس طرح آخر کب تک حقیقت سے آنکھیں چرائی جاسکتی تھیں۔

دوسری رات پھر گلزار خواب گاہ میں آدھمکا۔نواز کو اب بھی یقین نہ آیا اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب ہی میز پر رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کیا تو کمرے کا دروازہ بھی اندر سے مقفل تھا نواز کو یقین ہوگیا کہ یہ سب اس کی لاشعوری وہم کا نتیجہ ہے ورنہ کوئی اور بات نہیں۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔تھوڑی دیر میں وہ پھر نیند کی وادیوں میں جا پہنچا۔

تیسری رات پہلی دو راتوں کے برعکس بڑی ہی بھیانک ثابت ہوئیں۔ نواز اپنے ملازم گلزار کو دیکھ کر کانپ گیا۔گلزار زخمی حالت میں نہ جانے کہاں سے آیا تھا۔اس کے کپڑے خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور سر کٹی ہوئی گردن کے ساتھ اس کے سینے پر پینڈولیم کی طرح جھول رہا تھا اور زندگی کے ان آخری اور مایوس کن لمحات میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں، جن میں بڑی ہی خوفناک چمک تھی۔ اس نے نواز کو بڑے حاکمانہ انداز میں باہر چلنے کا اشارہ کیا۔نواز نے انکار کرنا چاہا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اس نے شور مچا کر گھر والوں کو مدد کے لیے پکارنا چاہا تو زبان خشک لکڑی کی طرح حلق میں سخت اور کھردری ہو کر اٹک گئی۔ ان حالات میں اس کے لیے گلزار کا حکم ماننے کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔اب گلزار آگے تھا اور نواز اس سے دو قدم پیچھے چل رہا تھا۔تھوڑی دور جانے کے بعد نواز ٹھہر گیا ۔تاکہ دونوں کا درمیانی فاصلہ بڑھ جائے۔لیکن اس کا خیال غلط نکلا گلزار کے آگے بڑھتے ہوئے قدم بھی رُک گئے اس نے پلٹ کر خشمگین نظروں سے نواز کو گھورا اور کچھ کہے بغیر ہی چل دیا۔نواز کی حالت یہ تھی کہ وہ غیر ارادی طور پر گلزار کے پیچھے ہوگیا۔گلزار کا رخ برگد کے درخت کی طرف تھا وہاں پہنچ کر وہ رُک گیا اس نے ایک نظر نواز کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

نواز مبہوت کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ وہ حیران تھا کہ گلزار کو زمین نگل گئی ہے یا وہ ہواؤں میں تحلیل ہوگیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب نواز کے ہوش بحال ہوئے تو وہ سوچوں میں مبتلا گھر لوٹ آیا وہ اب بہت ہی پریشان تھا کہ اسے اپنی خواب گاہ میں دکھائی نہ دینے والی ہستی کے موجودگی کے احساس نے مزید پریشان اور خوف زدہ کر دیا۔اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر میز کی دراز سے پستول نکالا کر جیب میں رکھ لیا اور کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا اور رات کا بقیا حصہ اس نے جاگ کر گزار دیا۔

صبح تک وہ برگد کے درخت کو کاٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

صبح ہوئی تو وہ اپنے ہمراہ دو آدمی لے کر برگد کے درخت کو کاٹنے کے لیے وہاں جا پہنچا۔ اسے یہ یقین ہوگیا تھا کہ برگد کا درخت بدروحوں کا مسکن ہے اس لیے اسے جلد از جلد کاٹ کر ختم کر دینا چاہیے۔اسے بدروحوں کے انتقام کا بھی خوف تھا مگر پھر بھی اس نے درخت کو کٹوانا شروع کیا۔

درخت کا تنا کھوکھلا ہونے کی وجہ سے وہ جلد ہی کٹ کر زمین بوس ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی کھوکھلے تنے سے ایک گٹھڑی لڑھکتی باہر آگری۔ وہ گٹھڑی اٹھا کر نواز کے حوالے کی گئی جسے کھول کر دیکھنے پر معلوم ہوا یہ تو خون آلود کپڑے ہیں۔......بس پھر کیا تھا۔ درخت کے کھوکھلے تنے کی اچھی طرح تلاشی لی گئی تو انسانی ہڈیوں کے علاوہ لوہے کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ برآمد ہوا۔

نواز نے پولیس کو اطلاع دی ان کی موجودگی میں صندوقچہ کھولا گیا تو اس میں سے نواز کے تمام مسروقہ زیوارات اور نقدی برآمد ہوئی۔ نواز تو خوش ہوگیا اس کے نقصان کا ازالہ ہوگیا تھا۔

مگر ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہوسکا کہ گلزار کی لاش کی گلی سڑی ہڈیاں اور نواز کے زیورات اور نقدی کس نے چرائے تھے۔ کیا فضل دین نے......لیکن اس بات کو کسی کا ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ جب کہ کچھ لوگوں کی بات دل کو لگتی ہے کہ گلزار زیورات اور نقدی لے کر بھاگا تو فضل دین نے ہی اس کا راستہ روکا ہوگا اور ناگ بن کر نہ صرف اس کو ڈسا۔ بلکہ اسے مسروقہ مال سمیت برگد کے درخت کے تنے میں داخل کر دیا۔

اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ راز ابھی تک کوئی نہیں جان سکا......کیا آپ ہی بتا سکتے ہیں۔

☆......☆......☆......☆



موت کا پروانہ



نصرت سرفراز

اُس عورت کا قصہ، جس نے بیٹی کو آسیب سے بچانے کے لیے بھائی کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے تھے

وہ آتی بہاروں کی ایک سہانی صبح تھی۔ ہواؤں میں ہلکی سی خنکی کا احساس نمایاں تھا۔ پھولوں کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں پر سورج کی تمازت سے چمکتے سفید برف کے تودے گویا ایسے لگ رہے تھے جیسے چمکتی چاندی کے بنے ہوئے ہوں۔

لندن میں موجود ہوٹل کی پرشکوہ عمارت کچھ ایسی جگہ واقع تھی جہاں ہر کمرے کی کھڑکی سے ایک طرف ساحل سمندر نظر آتا تھا تو دوسری طرف حد نظر تک بلند و بالا برفانی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ اس صبح سورج کی تمازت شروع ہوتے ہی ہوٹل کے کوریڈور، لابی، ڈائننگ روم اور کچن کی رونقیں عروج پر پہنچنے لگیں۔

ہوٹل ریسپشن پر موجود ریٹا نے رجسٹر پر لکھی ہدایت پڑھیں۔ نمبر ایک پر درج تھا کہ کمرہ نمبر 22 میں موجود شبیر صاحب کو صبح گیارہ بجے انٹرکام کر کے جگانا تھا اور ٹھیک 12 بجے بیرے کے ہاتھوں ان کا آرڈر کیا ہوا ناشتا ان کو پہنچانا تھا ریٹا نے انٹرکام اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ایک دو تین بارہ پندرہ بیل ہوتی ہیں مگر فون اٹینڈ نہ کیا گیا وقفے وقفے سے کئی بار کی گئی مگر جب اس کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو اس نے ہوٹل کے مینیجر کو مطلع کیا۔ مینیجر کی موجودگی میں دو بیروں نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر بے سود۔ ایسا لگتا تھا اندر کوئی ذی روح موجود ہی نہیں۔ شبیر صاحب کا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔ ہوٹل ریکارڈ کے مطابق وہ کمرے میں تنہا ہی تھے۔ مجبوراً ہوٹل

مینیجر کو اضافی چابی کی مدد سے کمرے کا دروازہ کھولنا پڑا۔ مینیجر اور اسٹاف اندر کا منظر دیکھ کر انتہائی دہشت کا شکار ہو گئے۔ کمرے کے وسط میں موجود بیڈ پر شبیر صاحب مردہ حالت میں پڑے تھے۔ ان کا تمام جسم نیلا ہو چکا تھا۔ جب کہ گردن پر سانپ کے ڈسے جانے کے واضح نشانات موجود تھے۔ مینیجر ہکا بکا رہ گیا تھا وہ حیران تھا کہ ہوٹل کی بارھویں منزل پر صاف ستھرے بند کمرے میں سانپ کس طرح پہنچا؟

آناً فاناً پولیس پہنچ گئی اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ ان کی موت کسی زہریلے ناگ کے کاٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ ناگ اس قدر زہریلا تھا کہ شبیر صاحب کا پورا بدن نیلا ہو گیا تھا اور زہریلے ناگ کے کاٹنے کے بعد انہیں دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہ ہو سکا۔

شبیر صاحب عرصہ بائیس سال سے لندن میں مقیم تھے۔

ان کی میت جب نواب شاہ سندھ میں مقیم ان کے والدین کے گھر لائی گئی تو ان کی بیوی آمنہ یہ کہتے ہوئے صدمے سے بے ہوش ہو گئیں کہ میں اور اماں کبریٰ سے

کہتی تھیں ’نہ گراؤ اس دیوار کو رک جاؤ‘ تین سال اور مگر وہ نہ مانی۔ ’لے لی ناں ناگ دیوتا نے میرے شوہر کی جان۔‘ خود کبریٰ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

ایک طرف بیٹی جان سے گئی اور دوسری طرف بھائی بھی ناگ دیوتا کی دشمنی کا شکار ہوگیا۔ کیا یہ وہی ناگ تھا جو ناگی شاہ نے دفن کیا تھا؟؟؟

بائیس برس ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ کبریٰ آمنہ کی نند تھی جو ویران نظروں سے تابوت سے نظر آتے بھائی کے نیلے چہرے کو تک رہی تھی۔ جب کہ ان کے ذہن کے پردے پر بائیس سال پہلے ماضی کے ان شب و روز کی سلائیڈ چل رہی تھی جب ان کی اپنی بیٹی مہوش بائیس سالہ الہڑ دوشیزہ تھی اور وہ سب اپنے دادا کی بوسیدہ قدیم حویلی میں رہتے تھے۔ جس کے ایک حصے کو منہدم کروا کر چند ماہ قبل ہی انہوں نے جدید طرز پر گھر تعمیر کروایا تھا۔ اور اس انہدام کے دوران نند اور بھاوج کے دونوں پورشنز کے درمیان موجود وہ دیوار بھی گرا دی گئی تھی جس کی جڑ میں ناگی شاہ نے ناگ دیوتا کو دفن کیا تھا۔ کیا ان کے بھائی کو ڈسنے والا ناگ وہی تھا جو بائیس برس سے یہاں مدفون تھا؟

☆......☆......☆

مہوش کی خوبصورتی مثالی تھی۔ پورے خاندان میں اس جیسی کوئی اور لڑکی نہ تھی۔ ستواں ناک، نازک بدن، نیلی جھیل سی گہری آنکھیں، رنگ ایسا جیسے چمکتی ہوئی چاندی اور سونے پر سہاگہ کمر سے نیچے لٹکتے سیاہ گھنیرے بال۔

ایک شام جو وہ نہا کر صحن میں بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ دو وقت مل رہے تھے۔ آمنہ ممانی نے آواز لگائی۔

مہوش اندر آ جاؤ بیٹا۔ جب دو وقت ملتے ہیں تو تمام روحیں، آسیب اور بلائیں اپنے ٹھکانوں پر واپس جا رہی ہوتی ہیں۔ راستے میں کوئی خوبصورت بشر نظر آ جائے تو ان کا دل اس پر آ جاتا ہے پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔“

مہوش اندر آ گئی۔ اندر آتے ہوئے پھوپو نے دیکھا وہ عجیب لڑکھڑاتی سی چال چل رہی تھی۔ اس کے گھنیرے سیاہ بال ماتھے سے لٹک کر پورے چہرے پر پھیل رہے تھے۔ اندر آ کر وہ سو گئی۔

صبح جب بیدار ہوئی۔ تو اس کی سرخ انگارہ ہوئی آنکھیں دیکھ کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ خود مہوش بھی بے چین تھی۔ اگلی شام پھر وہی جھٹپٹے کا وقت تھا۔ مہوش ایک بار پھر بستر پر بیٹھے بیٹھے مدہوش ہو گئی۔ بال کھل کر بکھرے اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں۔ سر کو دائیں بائیں گھماتے وہ



بھرپور مردانہ آواز میں بولی۔
"جب تک میں یہاں ہوں کوئی کمرے میں داخل نہ ہو۔ میں ایک گھنٹے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" آمنہ ممانی ہمت کر کے کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں۔
"مہوش ہوش میں آؤ۔" ان کا یہ بولنا تھا کہ انہیں ایسا لگا کہ کسی بہت بڑے مردانہ ہاتھ نے ان کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارا ہے۔ انگلیوں کے نشانات ان کے چہرے پر ثبت ہو گئے۔ چہرہ ایسے جلنے لگا جیسے ان کے رخسار میں آگ لگ گئی ہو۔ اس کے بعد مہوش کی ماں نے جو کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو نہ جانے کس طرح پھسل کر کہ اس بری طرح گریں کہ سر پھٹتے پھٹتے بچا۔ مگر ٹخنے کی ہڈی تڑوا بیٹھیں۔
ابا میاں ہمت کر کے مہوش کے بیڈ تک جا پہنچے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔
"مہوش بیٹا کیا ہوا۔" اور وہ ہاتھ جو انہوں نے اس کے سر رکھا تھا ایسا لگا کہ کسی نے پکڑ کر ایسا مروڑا کہ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ کئی ہفتے وہ اپنے مجروح بازو کو لے کر پھرتے رہے۔
جب مہوش نارمل ہوتی تو اسے کچھ یاد نہ رہتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ مگر اس کی آنکھیں مستقل سرخ رہنے لگیں اور وہ شدید سر درد کا شکار رہنے لگی۔
ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو وہ بولا کہ یہ شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہیں۔" دوائیں دی گئیں۔ مگر بے سود۔ ہر شام اسی طرح مہوش کو دورے پڑتے اور وہ بد حال ہو جاتی۔ یہ بات یقینی تھی کہ کوئی آسیب ہے یا کوئی جن، جس نے مہوش کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ کئی طرح کے عاملوں، کاملوں اور جن بھگانے کے علمبردار مولویوں نے مہوش کا علاج کرنا چاہا مگر ان میں سے کوئی اپنا سر تڑوا کر، تو کوئی ٹانگ تڑوا کر کمرے سے نکلا۔
ایک شاہ جی کے سامنے کے چار دانت اس بری طرح ٹوٹے اور ایسا گھائل ہوئے کہ جن نکالنے کا جملہ سامان کمرے میں چھوڑ چھاڑ آئندہ کے لیے پیری فقیری سے توبہ کرتے ہوئے بھاگے۔ یہ تمام تو وہ جعلی لوگ تھے جو ان معصوم لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ جن کی بچیاں، بیٹیاں کسی دماغی امراض کا شکار ہوتیں یا ان پر مرگی یا ہسٹریا کے دورے پڑتے تھے۔ کچھ حالات کا شکار بہو، بیٹیاں جو ڈپریشن میں مبتلا ہو کر سفاکیوں اور عیاشیوں کا نشانہ بن جایا کرتی تھیں۔ مگر مہوش کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ کبریٰ بی بی نے ناگی شاہ کے بارے میں سنا جو جن نکالنے کے عمل کے ماہر تھے۔ انہیں بلایا گیا۔ ابھی وہ گھر کے اندر داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ مہوش کے کمرے سے سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ناگی شاہ نے کبریٰ بی بی سے کہا کہ یہ بڑا خطرناک ناگ جن ہے جو بغیر کسی کے نام کے نہیں اترے گا اپنے کسی رشتہ دار کا نام جلدی سے بتا جس کے نام پر میں اس جن کو اتاروں۔ کبریٰ بی بی نے جو کہ مہوش کی حالت کی وجہ سے ازحد پریشان تھیں اور پھر انہیں یہ یقین بھی نہ تھا کہ یہ ناگی شاہ بھی مہوش پر سے ناگ جن کو اتار سکے گا یا نہیں۔
انہیں لگ رہا تھا کہ مہوش پر ناگ جن عاشق ہے جب کہ انہوں نے ناگی شاہ کو ابھی تک یہ بات بھی نہیں بتائی تھی کہ مہوش کے کمرے الماری حتیٰ کہ بیڈ کے اطراف سے انہیں بھی اکثر نادیدہ ناگوں کے پھنکارنے اور سانس لینے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ مہوش کے حسین گھنے اور کالے بالوں پر انہیں کئی بار چھوٹے باریک سانپ لہراتے ہوئے دکھائی دیتے تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔
ناگی شاہ نے گلے میں ایک بل کھاتا سانپ لٹکایا ہوا تھا جب کہ ایک سانپ کی گردن ہاتھ پکڑے تھا، جس کا دھڑ اس کے بازو پر لپٹا ہوا تھا۔
"اے عورت جلدی بتا! تیری لڑکی پر عاشق جن کس کے نام پر اتارا جائے؟"
"شبیر احمد عثمانی!" کبریٰ بی بی نے جلدی سے اپنے بھائی کا نام لے لیا۔ آمنہ بیگم اپنی نند کے منہ سے اپنے خاوند کا نام سن کر دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ناگی شاہ دھاڑے۔
جلدی سے دو مٹی کی کوری ہانڈیاں منگواؤ اور دو کلو دودھ بھی منگواؤ۔" سامان منگوایا گیا اور ناگی شاہ مہوش کے کمرے میں داخل ہو گئے۔
کھلے دروازے سے سب نے دیکھا مہوش ناگی شاہ کے بین کی لے پر بالوں کو لہرا رہی تھی کہ کھڑکی سے ایک ناگ کمرے میں داخل ہوا اور مہوش کے گرد چکر لگاتا رہا۔ ناگی شاہ کی بین کی دھن تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ پھر وہ ناگ دودھ سے بھری کوری مٹی کی ہانڈی کے اندر منہ ڈال کر دودھ

پینے لگا۔ دودھ کے ختم ہوتے ہی وہ اس بڑی مٹی کی ہانڈی کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر ہانڈی سے باہر تھا۔ ناگی شاہ نے دوسری کوری مٹی کی ہانڈی سے اسے ڈھانک دیا۔ اس دوران مہوش بیہوش ہو چکی تھی۔

بعد ازاں ناگی شاہ نے اس دہری بند ہانڈی کو حویلی کے دونوں پورشنز کے درمیان کی دیوار کی جڑ کھود کر دفن کر دیا اور کہا۔

"یہ خطرناک ناگ دیوتا تھا جو تمہاری بیٹی پر عاشق ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ہانڈی میں بند کر کے تمہارے بھائی شبیر احمد عثمانی کے نام پر اتار کر بند کر دیا ہے۔ اس ناگ دیوتا کی عمر پچیس سال باقی ہے پچیس سال بعد یہ مر جائے گا۔ فنا ہو جائے گا اور اگر پچیس سال سے پہلے یہ ہانڈی کسی نے نکال لی یا کسی وجہ سے خود نکل گئی تو ناگ دیوتا نکل کر شبیر احمد عثمانی کو ڈس لے گا اور وہ مر جائے گا۔ میں نے یہ ناگ دیوتا شبیر احمد عثمانی کے نام موت کے پروانے کے طور پر نکالا ہے۔ جب تک یہ مدفون ہے شبیر احمد عثمانی محفوظ ہے۔ ہانڈی سے نکلتے ہی وہ ناگ شبیر احمد عثمانی کے خون کی بو سونگھتا ہوا اُس تک پہنچ جائے گا۔ اور مار ڈالے گا۔ چاہے وہ دنیا کے کسی کنارے جا بسے۔

"بہر حال اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی۔ مہوش جو کہ بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی ماں کے چہرے پر پانی ڈالنے سے ہوش میں آ گئی۔ کچھ دن کمزور رہی پھر تندرست ہو گئی۔ دن موتی بن بن کر وقت کے تھال میں گرتے رہے۔

اس واقعہ کو سات برس بیت گئے۔ مہوش ستائیس برس کی ہو گئی رشتے تو بہت آئے مگر کہیں بات نہ بنی۔ خوبصورتی میں اعلیٰ مثال تو تھی ہی مگر تمام آنے والوں کے کان میں کہیں نہ کہیں سے آسیب والی بات پڑ ہی جاتی تھی۔ جسے سن کر وہ بھاگ جاتے۔

خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ خاندان کی کسی شادی میں عمر بن عبدالعزیز کی نظر جو مہوش پر پڑی تو دل دے بیٹھے۔ شہر سے دوست کی شادی میں گاؤں آئے تھے۔ نواب شاہ کی دوشیزہ کی نیلی آنکھوں کے اسیر ہو گئے۔ رشتہ لگا۔ بات آگے بڑھی۔ مہوش کی ماں تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھیں۔

گاؤں کے ماحول میں 27 سال کی لڑکی کا بوجھ سو من کا ہو جاتا ہے۔ اوپر سے ماضی کا آسیب پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

عمر چونکہ آزاد خیال شہری ماحول کا پروردہ لڑکا تھا۔ اس نے آسیب واسیب اور جنوں ناگوں کی کہانیوں کی پروانہ کرتے ہوئے مہوش کو شریک سفر بنا کر ہی دم لیا۔

☆......☆......☆

سہاگ رات اپنی دلہن کے ہاتھوں کو تھام کر انگوٹھی پہناتے ہوئے اسے ایسا لگا جیسے آس پاس بہت سے ناگ سرسرا رہے ہوں۔ سر جھٹک کر اس نے اس احساس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ مہوش اتنی خوبصورت نازک اور حسین تھی کہ عمر تو شوہر سے زیادہ اس کا عاشق ہی بن گیا۔

شادی کے بعد وہ لوگ ہنی مون منانے مری نتھیا گلی اور بھوربن کے کوہساروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہر بار جب وہ اپنی شریک حیات کے لمس کو محسوس کرتا تو اسے ایسا لگتا آس پاس بہت سے ناگ پھنکار رہے ہوں۔ سرسرا رہے ہوں۔ یا کنڈلی مارے بیٹھے اسے گھور رہے ہوں۔ مگر آج تک کبھی اسے کسی سانپ نے نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے اس خیال سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کرتا۔

جس سے محبت ہو جائے بلکہ عشق ہو جائے اور وہ بنا کسی مسئلے کے شریک سفر بھی بن جائے تو زندگی کا سفر حسین ہی نہیں حسین تر ہو جاتا ہے۔

شاہراہ زندگی پر ساتھ ساتھ چلتے ایک سال گزر گیا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ عمر کی مہوش کے لیے دیوانگی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

ایک سال گزرنے کے باوجود اسے ایسا لگتا جیسے ابھی ان کا ہنی مون پیریڈ ہی چل رہا ہے۔ کالے، ریشمی، سلکی گھنے اور لمبے بال جب لہرا کر مہوش کی کمر پر پھسلتے تو عمر کو ایسا لگتا جیسے کوئی ناگ کنڈلی مار کر بیٹھا ہے اور لہرا کر چل رہا ہے۔ مہوش کے ریشمی بالوں سے اٹھتی مدہوش کر دینے والی خوشبوئیں عمر کو دیوانہ کر دیتیں۔

جب وہ مہوش کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا ہر ہر بال ایک بل کھاتا باریک سانپ ہے جو بل کھا کر کمر سے نیچے لٹک رہا ہو۔ بالوں سے نکلتی خوشبو ایسی مسحور کن ہوتی جو مہوش کے حسن کو دوبالا اور دو آتشہ کر دیتی اور عمر اس کے سحر میں کھو سا جاتا۔"

اُس دن تو عمر سچ مچ مجھو دیوانہ ہی ہو گیا جب ڈاکٹر نے اسے وہ خبر سنائی جس کو سننے کے لیے ہر شادی شدہ جوڑا بے

چین رہتا ہے یعنی باپ کے عہدے پر فائز ہونے کی نوید۔ ہاتھوں کا چھالا تو اس نے مہوش کو پہلے ہی بنا رکھا تھا اب تو اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے زمین پر قدم نہ رکھنے دے ۔ ویسے اس حالت میں کئی لڑکیوں پر روپ بڑھ جاتا ہے تو کئی بالکل بے رونق نظر آتی ہیں۔ مہوش تو پہلے ہی خوبصورت اور حسین تھی اب جو ممتا کا الوہی روپ چڑھا تو حسن دو آتشہ ہو گیا۔ نیلی جھیل سی گہری آنکھیں مزید حسین ہوتی چلی گئیں اور عمر شوہر سے عاشق اور عاشق سے مجنوں بنتا چلا گیا۔

جیسے جیسے ڈیلوری کا وقت قریب آتا جا رہا تھا عمر کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ساس کبریٰ بیگم کہتیں بیٹا ہر شادی شدہ جوڑے پر یہ وقت آتا ہے۔ تم تو کچھ زیادہ ہی دیوانے ہوتے جا رہے ہو۔''

زندگی بہت پر سکون تھی۔ سب لوگ آٹھ سال پرانے واقعے کو یکسر بھلا بیٹھے تھے۔ ایک رات پچھلے پہر مہوش بے چین ہوئی تو عمر اسے شہر کے بہترین اسپتال لے گیا جہاں وہ ریگولر چیک اپ کرانے جاتے رہتے تھے۔

سب کچھ نارمل تھا۔ نرسیں اسے لے کے آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گئیں۔ عمر اکیلا باہر کھڑا رہ گیا۔ بس 30 منٹ لگے جب عمر کی دنیا لٹ گئی ڈاکٹر نے باہر آ کر بتایا کہ اچانک بی پی شوٹ کر گیا اور ہم نہ دنیا میں آنے والی نئی جان کو بچا سکے نہ ہی اس کی ماں کو۔۔۔ ویری سوری!!!''

عمر کے تو جیسے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ابھی تو وہ مسکراتے ہوئے اندر گئی تھی۔ ایسا کیا ہو گیا۔'' اس نے اپنا سر دیوار پر دے مارا۔ لہو اس کے ماتھے سے ہوتا ہوا آنکھوں میں داخل ہو گیا۔ گرم گرم لہو چہرے پر ایسے بہہ رہا تھا جیسے لہراتے ہوئے سانپ ہوں۔ عمر ہوش و خرد سے ایسا بے گانہ ہوا کہ اسے آخر کار چند سالوں بعد پاگل خانے میں ایڈمٹ کرانا پڑا جہاں وہ ہر وقت ''سانپ!! سانپ!! ناگن!!! اور انتقام!!'' جیسے الفاظ چلاتا رہتا۔

☆......☆......☆

وقت نے مرہم لگایا کبریٰ بیگم نے بیٹے کی شادی کرنے کی ٹھانی۔۔ بھائی اور بھاوج آمنہ تو سالوں پہلے سات سمندر پار جا بسے تھے۔ گھر خالی ہی پڑا تھا۔ انہوں نے سوچا بیٹے کی شادی ہے گھر کو منہدم کروا کر نئے سرے سے تعمیر کروایا جائے ۔ ان کی اماں نے لاکھ منع کیا۔ دیوار نہ گراؤ یہاں ناگ مدفون ہے مگر آمنہ کے بیٹے نے ایک بات نہ سنی۔

وقت کی گرد نے تمام گزرے حالات و واقعات کو دھند میں لپیٹ دیا تھا۔ بائیس طویل سالوں میں سب بھول گئے تھے کہ دیوار کی جڑ میں مدفون ہانڈی میں کبریٰ کے بھائی کی موت کا پروانہ دفن ہے۔ ان کی بھاوج نے بھی منع کیا مگر نند کے بیٹے کو اس فرسودہ اور افسانوی باتوں پر کوئی اعتبار نہ تھا۔

''بیٹا۔ تین سال اور رک جاؤ'' اماں نے بہت سمجھایا۔

''اماں۔ آپ نہ جانے کون سے زمانے کی بات کر رہی ہیں بائیس برسوں میں تو وہ ناگ اور ہانڈی سب مٹی میں مل گئے ہوں گے۔ مر کھپ گئے ہوں گے۔'' اماں بولی۔

''ناں بیٹا وہ ناگی شاہ بہت پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے ناگ دیوتا کو نکال تو دیا مگر مہوش کو موت سے نہ بچا سکے۔''

مگر ان کی ضعیفانہ سوچ کی ایک نہ سنی گئی کہا گیا کہ ماموں تو ایک عرصے سے لندن میں مقیم ہیں اور کیا وہ ناگ نواب شاہ کی دیوار سے نکل کر سات سمندر پار لندن پہنچ جائے گا؟؟؟ ''ہنستے ہوئے اس نے اماں کو سمجھایا۔ کھدائی شروع ہوگئی پرانی بوسیدہ عمارت کی جگہ نئی جدید عمارت وجود میں آ گئی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ اب تو ماموں بھانجے کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے آنے والے تھے کہ اطلاع آئی کہ وہ لندن کے ہوٹل کے کمرے میں مردہ پائے گئے۔۔ لگتا تھا کہ ان کو کسی ناگ نے ڈسا ہے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی یہی کہتی تھی۔

کبریٰ بیگم تابوت میں موجود بھائی کا نیلا چہرہ دیکھ دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ کاش کہ وہ اپنے بیٹے کو منع کر دیتیں۔ تین سال اور رک جاؤ مت ڈھاؤ دیوار کو۔ مگر جو ہونا تھا ہو چکا تھا کبریٰ بی بی کے دماغ میں کئی سوالات جنم لے رہے تھے۔

''کیا واقعی یہ وہی ناگ تھا جو دیوار کی جڑ میں بائیس سال تک مدفون رہا تھا؟ کیا یہ وہی ناگ تھا جو بائیس سال پہلے ان کی بیٹی پر عاشق ہوا تھا؟؟ کیا کوئی مدفون سانپ سات سمندر کا سفر طے کر کے لندن کے ہوٹل میں بھائی کو ڈس سکتا ہے؟؟

کیا واقعی یہ وہی ناگ تھا جسے ناگی شاہ نے بائیس سال قبل کوری ہانڈیوں میں بند کیا تھا؟؟

کیا موت کا پروانہ ناگ کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے؟؟؟

☆......☆......☆

کارِ جہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں
دل سوز تحریریں، جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

مؤکل پیر خانے کا



جاوید راہی

پیر خانے کے مؤکل کو قابو میں کرنے کے لالچ میں دوہرے قتل کے موجب بننے والے ایک نادان کی پُراسرار جرم کتھا

میں کلہوڑا اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ اِکا دُکا مسافر میرے سمیت اُتر کر اپنی اپنی منزل کی جانب چل پڑے تھے۔ مجھے جو نام نوعمر لڑکے لیاقت علی نے گنوائے تھے وہ کچھ یوں تھے دولت پور سیکھو ماتا ہیجو، بار وجو باغ۔ سافان اور اس طرح کے کئی نام تھے۔ چھوٹے بڑے اسٹیشنوں کے۔ لیاقت علی نے جو کچھ کہا تھا اُس کی سزا تو اُسے بہر صورت بھگتنا تھی مگر اُس کی باتوں نے مجھے تصدیق کے روح فرسا سفر پر روانہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے ٹکٹ لیا اور چل پڑا۔ اب مجھے بارو جو باغ جانا تھا اور گاڑی کا کوئی ٹائم نہیں تھا۔ میں اسٹیشن بابو سے یہ سن کر چلتا ہوا انگریز کے زمانے کا نصب کیا ہوا لوہے کا جنگلا کراس کر کے باہر نکل آیا۔ چھوٹے سے بازار کا منظر انتہائی دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ آتے جاتے اور خریداری کرتے لوگوں کا مناسب سا ہجوم شہر کی بھیڑ بھاڑ سے مبّرا تھا۔ ایک ڈھابے نما چھپر ہوٹل پر رکتے چائے کا کہا اور پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھتے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔

میں لیاقت علی کی بتائی ہوئی کتھا کے بارے میں بھی غور کرتا جاتا جس کا لفظ لفظ پراسراریت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیاقت علی نے دو قتل کر ڈالے تھے اور وہ بھی بڑے سفاکانہ انداز میں۔ پولیس بے بس ہو چکی تھی تفتیش کرتے کرتے مگر مرنے یا قتل ہونے والوں کی لاشیں بر آمد نہیں کر پائی تھی۔ چائے پی کر میں دوبارہ اسٹیشن کے اکلوتے آہنی بینچ پر آ بیٹھا اور جناب امجد رؤف خان کی دی ہوئی بک 'میں ہوں تیمور' اپنے سفری بیگ میں سے نکال کر پڑھنے لگا۔ امیر تیمور کی داستانِ حیات کی ہر لائن نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ کی مثال ہے۔ کوئی گھنٹہ بھر کا تھکا دینے والا انتظار خود اسٹیشن ماسٹر کا بجایا ہوا لائن کا ٹکڑا تھا جس کی آواز پر اِدھر اُدھر بکھرے مسافر پلیٹ فارم پر اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ اس جدید دور میں بھی پرانی طرز کا سال خوردہ انجن سست رفتار میں رینگتا ہوا اسٹیشن پر آ رُکا تھا۔ کوئی درجہ بندی نہیں تھی بس لکڑی لوہے کے بنے ایک ہی وضع کے پھٹے نما بینچ تھے اور چند ایک مسافر۔ کافی دیر رُکنے کے بعد ہیبت ناک سیاہ انجن چار پرانے ڈبوں کا قافلہ لیے رینگنے لگا۔ اردگرد اونچے نیچے ٹیلے اور دور دور پہاڑوں کے سائے گول چکر میں انجن اور ڈبوں کے آگے پیچھے بھاگنے لگے۔

میں دوبارہ جناب امجد رؤف کی دی ہوئی بک 'میں ہوں تیمور' نکال کر پڑھنے ہی لگا تھا کہ ایک لمبا چوڑا مقامی لباس میں ملبوس آدمی میرے قریب آ بیٹھا چند لمحے

وہ بیٹھا رہا پھر کھنکار کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''پہلی بار دیکھ رہا ہوں آپ کو کس کے ہاں مہمان جا رہے ہیں۔'' میں نے کتاب بند کر کے اس نو وارد کا جائزہ لیا جو شاید پچھلے ڈبے سے ہوتا ہوا میرے پاس آن بیٹھا تھا۔

''کسی کے پاس نہیں جانا 'سابورا ہو' جا رہا ہوں۔ وہاں ندوی شاہ کے آستانہ پر جانا ہے مجھے۔

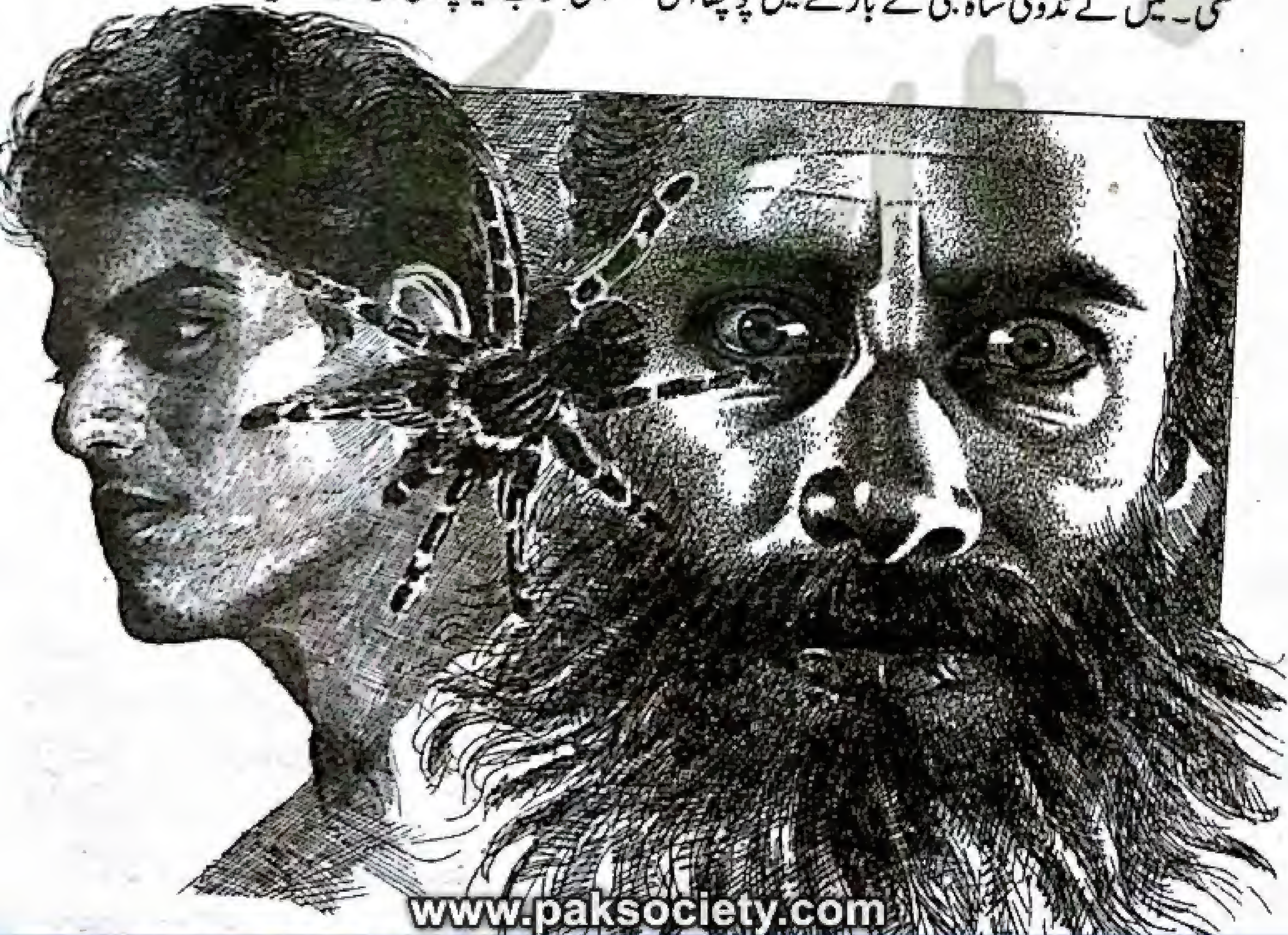
''وہ تو قتل ہو چکا ہے۔ اس کی لاش بھی نہیں ملی ابھی تک۔ پولیس نے قاتل تو پکڑ لیا ہے مگر وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ ایک نہیں، دو دو قتل کر دیئے تھے اس نے۔ اس لمبے تڑنگے آدمی نے جیب سے نسوار کی ڈبیہ نکالتے اُسے کھولا اور میری طرف بڑھائی، جس کی تیز اور کرخت بُو نے مجھے بے حال کر کے رکھ دیا۔

''جی نہیں جناب! میں اس نعمت سے ابھی تک محروم ہوں۔''

اُس نے چٹکی بھر کر اپنے دائیں ہونٹ کے اندر دباتے کھڑکی سے باہر کی طرف تھوکا، جو پیچھے کی طرف جاتی ہوا کے دوش پر شاید کسی بدنصیب کے منہ پر پھیل چکی تھی۔ میں نے ندوی شاہ جی کے بارے میں پوچھا اس آدمی جس نے اپنا نام افضل خان بتایا تھا صرف اتنا ہی جواب دیا کہ میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ بڑا پہنچا ہوا سید تھا۔ جنات، پریاں اور بھوت وغیرہ ان کے مریدوں میں شامل تھے اور باقاعدہ ان کے آستانہ مبارک پر حاضر رہتے تھے۔ میں تو 'ہالا' کا رہائشی ہوں، کبھی ان کے آستانہ پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا میرا۔'' بتا کر وہ اُٹھا اور شاید اگلے ڈبے کی سیر کرنے چل پڑا۔

میں نے دوبارہ بک کھول لی اور امیر تیمور کی سوانح عمری پڑھنے میں محو ہو گیا۔ دوپہر ڈھلنے سے پہلے ہچکولے کھاتی ریل گاڑی بارو جو باغ کے قدیمی چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر آ رکی۔ صرف مجھ سمیت دو اور مسافر اُترے تھے۔

ریل گاڑی سے، ایک ادھیڑ عمر بوڑھی اماں اور چار پانچ مسافر جو پتا نہیں کب کے منتظر تھے ریل گاڑی اُن کے سوار ہوتے آگے بڑھنے لگی۔ شاید حکومت کی یہ دریا دلی تھی جو اس خوفناک مہنگائی میں بھی اس طرف ریل گاڑی رواں دواں تھی۔ چاہے اس روٹ پر ایک ہی گاڑی چل رہی تھی، مگر مسافروں کو سہولت تو تھی نا۔ انگریز بہادر کی اس صواب دید پر میں دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔



اُترنے والے دونوں مسافروں کو روک کر میں نے ندوی شاہ مرحوم کے آستانے کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے نیچے کی جانب دیکھتے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بتایا وہ اس ٹیلے کے پار جو درختوں کا جھنڈ دکھائی دے رہا ہے۔ وہی درگاہ شریف ہے۔ اُدھر ہی درس اور آستانہ بھی ہے سرکار کا۔'' بتا کر وہ دوسری طرف بڑھ گئے۔

اسٹیشن سے وہ جھنڈ یوں تو تھوڑے فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا مگر پیدل چلتے چلتے میرا حال برا ہو گیا۔ کچا راستہ چھوڑ کر میں پگڈنڈی پر ہو گیا جو ٹیلے کے اوپر چڑھ رہی تھی۔ جب میں آستانے کی طرف مڑا تو کئی خونخوار کتے میری طرف بھونکتے ہوئے لپکے مگر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک درویش جلدی سے اُٹھا اور ان کو للکارا تو وہ پیچھے کی طرف لوٹ گئے۔ میں تیز تیز بڑھتا ان بیٹھے ہوئے آدمیوں کے پاس آ رکا۔

کافی سارے لوگ تھے۔ جو آستانہ کے باہر بچھی صفوں پر بیٹھے ہونے والے ذکر کو سن رہے تھے میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ ذکر پڑھنے والا خوبرو نوجوان پڑھا لکھا لگ رہا تھا جس کا لہجہ مقامی نہیں تھا وہ خالص پنجابی اُردو میں مجلس پڑھنے میں محو تھا۔ شاید ندوی شاہ جی کی یاد میں محفل ذکر کا اہتمام تھا۔ رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا اور بھی بہت سے لوگ آرہے تھے نماز سے قبل مجلس ذکر اختتام کو پہنچی اور وہاں موجود لوگ اُٹھ کر وضو کرنے اور کچھ آستانے کی طرف چلے گئے۔ مجلس پڑھنے والا نوجوان جو میرے قریب ہی بیٹھا تھا اپنے موبائل پر کسی کو سی ایم ہاؤس جا کر ایک اور مزید چھٹی کی تاکید کر رہا تھا۔ جب اس نے فون بند کیا تو میں نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھاتے اپنا تعارف کروایا۔ جواب میں انہوں نے اپنا نام سید حسنین عباس بخاری بتاتے کہا کہ میں وزیر اعلیٰ پنجاب آفس میں ان کا پرسنل آپریٹر ہوں۔''

جواب میں میں نے یہاں آنے کے بارے میں انہیں بتایا تو وہ بڑے خوش ہوئے وہ گاڑی میں آئے تھے۔ ان کی گاڑی اسٹیشن والی سائیڈ پر کہیں کھڑی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر سبھی لوگ لنگر خانے میں آ گئے اور لنگر کی تقسیم شروع ہو گئی۔

حسنین عباس صاحب کی وساطت سے میرا رابطہ ندوی شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی سید لقمان شاہ صاحب سے ہو گیا جو اس آستانے کے اب متولی تھے۔ میں نے مطلب کی بات شروع کرتے لیاقت علی کا ذکر چھیڑا تو ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر کر ڈوب گئے۔

''وہ بدبخت بڑے شاہ صاحب کے قتل کا موجب بنا ہے۔ پانچ سال کی عمر تھی اس کی جب وہ درس میں داخل ہوا تھا کم بخت بڑا ذہین اور تابعدار تھا۔ بڑے شاہ صاحب دل و جان سے اس کا خیال کرتے یہاں تک کے اپنی خاص نشت میں بھی اسے بیٹھا لیا کرتے تھے۔''

''جی خاص نشت مطلب؟''

''جب آپ کے ہوائی مریدان حاضری کے لیے آتے تو ہمارے درمیان اُس کو بھی بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی۔'' لقمان شاہ صاحب نے میری بات کی وضاحت کی۔

''اس خبیث نے بڑے شاہ صاحب کے دل میں اپنی خدمت کے بل بوتے جگہ بنائی تھی۔ آپ نے دوبار اُسے حفظ کروایا تھا اور اُسے عالم دین بنانے کی خواہش تھی اُن کی۔'' لقمان شاہ صاحب نے رقت آمیز آواز میں حسنین شاہ کو مخاطب کرتے بتایا۔

''شاہ جی جس بچی کو اس نے قتل کیا ہے۔'' وہ کب سے درس میں حفظ کر رہی تھی۔ اس کی بھی لاش کو لیاقت علی نے اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے اِدھر اُدھر کر دیا جس نے ندوی شاہ صاحب کو قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''وہ بچی دولت پور سے آئی تھی حفظ کرنے۔'' لقمان شاہ جی نے جوابا بتایا۔ ندوی شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی صاحب کی زبانی اس بات کی وضاحت ہو چکی تھی کہ جو باتیں لیاقت علی نے مجھے حوالات میں بتائیں وہی یہاں آ کر سننے کو ملی تھیں۔

رات گئے تک باتیں جاری رہیں۔ حسنین عباس کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کی رہائش ڈیرہ بابا بوٹے شاہ جسوکی گجرات تھی اور ان کے دادا سید فضیلت حسین بخاری شہید المعروف پیر پھل شاہ جنہیں گذشتہ دنوں اپنے ڈیرہ پر موجود چار پانچ دہشت گردوں نے فائرنگ کرتے سات بے گناہ افراد کو اس جرم میں بھون کر رکھ دیا کہ وہ اہل بیت کو ماننے والے تھے۔ پولیس ان پانچ دہشت گردوں تک پہنچ کر بھی آج تک ناکام تھی۔ حالانکہ خود

حسنین عباس بخاری صاحب وزیراعلیٰ پنجاب کے پرنسل سٹاف میں تھے۔ نگران کے ہونے والے سات قتل ابھی تک التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی یہ روح فرسا واقعہ سن کران کے حوصلے کی داد دینا پڑی، جن کے گھر پران کے خوبرو نوجوان کی لاشیں قطار در قطار پڑی اپنے ساتھ ہونے والی خونریزی کا انصاف طلب کررہی تھیں مگر حسنین عباس بخاری ہر پل وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی بے یارومددگار چلا آرہا تھا۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ دادا جی کی شہادت کے بعد اُن کے والد سید سجاد حسنین بخاری اب گدی نشین ہیں۔ ڈیرہ بابا بوٹے شاہ کے جنہیں یہ یقین ہے کہ اُن سات بے گناہ شہیدوں کی شہادت رائیگاں نہیں جائے گی۔ جنہیں اس لیے شہید کر دیا گیا کہ ان کا جرم اہل بیعت کی غلامی تھا۔''

☆......☆......☆

صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر حسنین عباس بخاری کی مہربانی سے مجھے بھی ان کی گاڑی میں جگہ مل گئی۔ وہ تین لوگ تھے اس لیے انہوں نے مجھے بھی گجرات تک لفٹ دے دی اور میں قدم قدم سفر سے بچ گیا۔ گجرات آکر انہوں نے بہت زور دیا جسوکی جانے کا مگر میں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کرتے ان سے اجازت لے لی۔

☆......☆......☆

ایس۔ ایچ۔ او سے رابطہ کرتے میں نے لیاقت علی سے حوالات کے باہر بیٹھ کر بات کرنے کی اجازت لے لی تھی۔ منشی محرر نے اُسے ہتھکڑی لگا کر حوالات سے باہر بٹھا دیا تھا۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے چہرے پر دُکھ پریشانی کے سوا اور کچھ نا دکھائی دیا۔

''لیاقت میں تمہارے پیرخانہ بارو جو باغ گیا تھا۔''

میرے بتانے پر وہ بری طرح چونکا تھا۔

دوسرا حملہ میں نے یہ کہتے کیا۔ مجھے لقمان شاہ صاحب ملے تھے آستانہ پر۔ تمہارے بارے میں پتہ چلا۔ کہ تم ندوی شاہ صاحب کے بڑے چہیتے تھے اور تم نے دوبار قرآن حفظ بھی کیا تھا۔'' میرے منہ سے اتنا سنتے وہ رو پڑا اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

''لیاقت علی تمہارے بارے میں وہاں یہ مشہور ہو



مؤکل کو قابو کرنے والے لیاقت علی کی جیل کے اندر لی گئی ایک تازہ تصویر

چکا ہے کہ تم اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہو۔'' اس بار میں نے اسے کُریدنے جیسے انداز میں کہا تھا؟

''نہیں جی ایسی کوئی بات نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے جو بھی باتیں ان سب کو بتائیں ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ مگر میری کسی بات پر کوئی یقین نہیں کر رہا۔ وہ مجھ سے پیر صاحب اور حافظہ فاطمہ مائی کی لاشیں برآمد کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ میں ان کو بار بار کہہ چکا ہوں کہ میں نے دونوں کو قتل کر کے اُن کی بوٹی بوٹی چیل کوؤں اور کتے بلیوں کو کھلا دی ہیں۔ میں اب ان کی

لاشیں کہاں سے برآمد کروں جی۔" اتنا کہتے ہی اس نے اپنی قمیض کے بازو سے اپنے آنسو پونچھتے میری بات کا جواب دیا۔

"اچھا ایک بات سنو! اگر تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہو تو مجھے وہ سب کچھ بتاؤ جو تمہارے ساتھ پیش آیا اور تم نے دو قتل کر ڈالے۔" ایس۔ ایچ۔ او کی بھجوائی چائے کا دوسرا کپ اسے دیتے تمام واقعات سنانے کے لیے اسے آمادہ کیا۔ چائے کا کپ اُس نے آدھے سے زیادہ خالی کر لیا تھا اور جیسے وہ اس مخمصے میں تھا کہ وہ اس حقیقت کا آغاز کہاں سے کرے۔ باقی ماندہ کپ خالی کرتے اس نے نیچے پڑی ٹرے میں رکھا اور میری جانب متوجہ ہو گیا۔

صاحب جی میرا والد معمولی کسان ہے۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ بڑا بھائی والد کے ساتھ ہی کھیتی باڑی کرتا ہے۔ میں شروع سے ہی کام چور تھا۔ میرا پڑھائی کی طرف بھی کوئی دھیان نہ ہوتا تھا۔ تنگ آ کر میرے والد نے مجھے ندوی شاہ صاحب کے درس میں حفظ کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ میرے سمیت کل لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بائیس تھی۔ ہم آستانہ کے ساتھ بنے کمروں میں اکٹھے رہتے تھے لڑکیاں درس سے فارغ ہو کر اندر چلی جاتیں اور ہم لنگر سے فارغ ہو کر پھر دہرائی میں محو ہو جاتے۔ پیر صاحب کے پاس جب مرید اور لوگ اپنی اپنی حاجات لے کر آتے تو پیر جی مجھے بلا کر حصار کرتے۔ پہلے جو دو لڑکے اس کام کے لیے مامور تھے وہ زیادہ دیر حصار میں ٹھہر نہیں پاتے تھے جبکہ میں گھنٹہ بھر سے زیادہ نکال جاتا۔

پہلی بار جب پیر صاحب نے مجھے حصار کیا تو میں ڈر گیا۔ بہت ہی خوفناک قسم کی کوئی چیز تھی جو میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اتنے میں پیر صاحب کی آواز جو مجھے کہیں دور سے آتی لگ رہی تھی، جو میرے کانوں کے راستے میرے جسم میں مدغم ہونے لگی۔

"لیاقو اسے مخاطب کرو۔"

"لیاقو اس سے بات کرو۔" پیر صاحب بار بار مجھے آوازیں دے رہے تھے مگر میری زبان حلق میں جم کر رہ گئی تھی، جیسے مجھ میں بولنے کی سکت ہی ختم ہو چکی ہو۔ پھر وہ چیز جس کے پورے جسم پر گھنے سیاہ بالوں کی چادر لپٹی ہوئی تھی یکدم مجھے دھکا دیتی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں پیر صاحب کے سامنے اسی طرح زمین پر اندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ پیر صاحب محبت سے مجھے لیاقو کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

"اوئے بندے کے بچے تُو میرا شیر ہے۔ بہادر بچہ ہے تو میرا۔ لے یہ پانی پی لے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پیر صاحب نے گلاس کے پانی پر پھونک مارتے میری طرف بڑھایا۔ میں نے بسم اللہ پڑھتے ان کا دم کیا ہوا پانی ایک دو گھونٹ میں ختم کر دیا۔ پھر انہوں نے مجھے ایک وظیفہ بتایا اور کہا کہ اگر وہ تجھے تنگ کرنے آئے تو وظیفہ پڑھنا شروع کر دینا۔ وہ دفع ہو جائے گا۔"

میں تمام رات کروٹیں بدلتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ پراسرار سا وجود ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح کی سفیدی اندھیرے پر غالب آنے لگی تھی۔ میں نے بادل نخواستہ اُٹھتے وضو کیا اور درس کے ساتھ جہاں چھوٹی سی مسجد پیر صاحب نے بنوا رکھی تھی میں آ کر قرآن کھول لیا مگر میرے اندر وہی خوف دبا ہوا تھا۔ وہ گھنے سیاہ بالوں سے اٹا ہوا مافوق الفطرت وجود، جس نے مجھے دھکا دے کر منہ کے بل گرا دیا تھا اور جاتے جاتے اعصاب پر بھاری بوجھ ڈال گیا تھا۔ جو وظیفہ پیر صاحب نے اس کے آنے پر پڑھنے کے لیے مجھے بتایا وہ گو کہ مجھے ازبر ہو گیا تھا مگر پھر بھی میں نے احتیاطاً اسے لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اذان کی آواز پر میں نے قرآن پاک بند کیا اور فجر کی تیاری میں لگ گیا۔ میں نے نماز پڑھی اور مسجد سے نکل کر درس آ گیا اور دہرائی میں محو ہو گیا۔ پیر صاحب نماز قرآن سے فارغ ہو کر درس میں آ جاتے اور دوپہر تک ہم سب کے ساتھ رہتے۔ ادھر ہی آنے جانے والے حاجت مندان سے مستفید ہوتے پھر وہ اندر اپنی فیملی میں چلے جاتے۔ ہم سب لنگر سے فارغ ہو کر آرام کرتے اور اذان ہوتے ہی ہم نماز کے لیے اُٹھ جاتے۔ نماز کے بعد تھوڑا بہت کام کرتے اور پھر پیر صاحب کے پاس آستانہ آ جاتے۔ جہاں آنے والے مرید اور لوگ موجود ہوتے تھے ہم بھی ان میں شامل ہو کر بیٹھ جاتے۔ یہ سلسلہ شروع سے جاری تھا۔ میری ڈیوٹی پیر صاحب کے تخت پوش کے قریب ہوتی

تھی جب کوئی خاص مرید یا دور دراز سے دکھی آجاتا تو مجھے حصار کرنے کا اشارہ ملتا تو میں دوزانو پیر صاحب کے سامنے رکوع کی حالت میں جم جاتا۔ بار بار حصار ہوتے میں اب ہوائی چیزوں کا عادی ہو چکا تھا۔ مجھے پیر صاحب کے مؤکل سے کوئی ڈر نہیں لگتا تھا۔ جب اس کی حاضری ہوتی تو میں باقاعدہ اس سے ہم کلام ہوتا اور پیر صاحب کے سوالات کے جوابات میری آواز کی وساطت سے وہاں موجود بیٹھے سب لوگ سنتے تھے۔ جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا تو میری آواز بدل جاتی۔ مجھے اپنی کوئی ہوش نہیں رہتی تھی۔ وہاں جو میرے ساتھ درس میں حفظ کر رہے تھے وہی مجھے بعد میں سارے حالات سے باخبر کرتے۔

جو وظیفہ شاہ صاحب نے مجھے یاد کروایا تھا کہ جب مؤکل کبھی تمہیں آکر تنگ کرے تو وہ پڑھنا، وہ چلا جائے گا۔ ابھی تک نہ تو مؤکل نے مجھے تنگ کیا اور نہ ہی مجھے پیر صاحب کا بتایا وظیفہ دہرانے کی ضرورت پیش آئی۔ مگر میرے اندر ایک خواہش نے جنم لیا تھا کہ میں خود پیر صاحب کے مؤکل کو بلاؤں...... مگر کیسے بلاؤں؟ اس بات کی ہمت نہیں تھی مجھ میں کہ اپنے اندر جاگی اس آرزو کا اظہار ان سے کرسکوں۔ مگر میرا شوق اب جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔

☆......☆......☆

ایک رات میری طبیعت بہت بے چین تھی بالکل ایسے جیسے شاہ صاحب کے مجھے حصار کرتے وقت ہو جاتی تھی۔ میں اپنے رہائشی کمرے سے نکل کر باہر آگیا میرے قدم آستانہ سے ملحقہ راستے کی طرف بے اختیار اُٹھ گئے جو نیچی طرف جاتا تھا جدھر بے شمار گھنی جھاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شاہ صاحب نے ہمیں اس طرف جانے سے روکا ہوا تھا کیونکہ ان جھاڑیوں میں جنگلی جانور اور سانپ بچھو کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ہمیں تو منع کرتے تھے اور خود دوپہر کو اور شام کو دوسرے تیسرے دن گھنٹوں کے حساب سے ادھر چلے جاتے تھے۔ میں بلا مقصد آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ جب سے پیر صاحب مجھے حصار کر رہے تھے میرے اندر ڈر نام کی چیز کا خانہ سرے سے ختم ہو گیا تھا۔

جس راستے پر میں آگے بڑھ رہا تھا وہ کوئی پگڈنڈی تھی جو بل کھاتی جھاڑیوں میں آگے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ چاند پورے جوبن پر تھا اور مجھے ہر چیز قدرے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اب جھاڑیوں سے اٹا راستہ کافی حد تک کشادہ ہو گیا تھا اور درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے تھے۔ جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان والا راستہ شاید پہلے کبھی کوئی ندی نالہ ہوتا ہوگا مگر اب وہ خشک ہو کر چھوٹی سی کھائی نما ڈھلوان سی بن چکی تھی میرے قدم اُسی طرف اُٹھ رہے تھے کوئی نامعلوم غیر مرئی قوت مجھے آگے کی طرف لیے چلی جا رہی تھی۔ درختوں کا سلسلہ تا حدِ نظر چاروں جانب پھیلا ہوا تھا اور میرے قدم اُٹھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ چھوٹے بڑے درختوں کی چھتنا در درزوں میں سے مدھم روشنی چھن چھن کر درختوں سے پھیلی تاریکی کو قدرے منور کر رہی تھی۔

چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ کبھی کبھار کوئی پرندہ اپنی جگہ پر پھڑ پھڑا کر اس مہیب ماحول میں زندگی کی رمق اُجاگر کر دیتا ورنہ گہری خاموشی پھیلی تھی چاروں جانب۔ چلتے چلتے میرے قدم ٹھہر گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بڑا سا جھونپڑا تاریکی میں سر اُٹھائے کھڑا تھا اور اندر مدھم روشنی میں کوئی وجود حرکت کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں جلدی سے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا اور وہیں چھپ کر اس بات کا اندازہ لگانے لگا کہ وہاں کیا چل رہا ہے۔ کیا کوئی بندہ یا کوئی فقیر یہاں رہائش پذیر ہے۔ جب کوئی بات ذہن میں نہ آئی تو میں نے وہ جگہ چھوڑ کر اس جھونپڑے کے عقبی حصہ کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کرتے اپنے قدم بڑی آہستگی اور احتیاط سے آگے بڑھا دیئے۔

کافی لمبا چکر کاٹ کر میں جھونپڑے کے عقبی حصہ پر آتے رک گیا اور اس بات کا جائزہ لینے لگا کہ میرے آنے کی اندر موجود جو بھی کوئی ہے اسے آہٹ تو نہیں ہوئی۔ کافی دیر تک میں سُن گن لیتا رہا پھر بڑی احتیاط سے آگے بڑھتا ہوا عین پیچھے کی طرف آتے رک گیا۔ جس جگہ میں کھڑا تھا وہ جنگلی کیکر کے بڑے بڑے ٹہنے کاٹ کر جھونپڑے کے چاروں جانب زمین میں گاڑھ کر اسے محفوظ بنایا گیا تھا۔ ایک ٹہنے کو میں نے بغیر آواز کیے ہٹاتے راستہ بنایا اور آگے رینگ کر جھونپڑے کی پچھلی

دیوار کے ساتھ آلگا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے اس جھری سے آنکھ لگائی جس سے ہلکی ہلکی روشنی کی کرن باہر دکھائی دے رہی تھی۔ جب جھونپڑے کے اندر کا منظر صاف ہوا تو میرے قدم کانپ کر رہ گئے۔

اندر شاہ صاحب اور فاطمہ مائی موجود تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ دونوں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پیر صاحب کے جسم پر صرف برائے نام سا سرخ رنگ کا کپڑا تھا اور فاطمہ مائی کا پورا جسم باریک دوپٹے میں لپٹا، فاطمہ مائی کی نسوانیت کو قدرے اُجاگر کر رہا تھا۔ جس انداز میں فاطمہ مائی کھڑی ہوئی تھی اس سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اُسے اپنے آپ کی کوئی بھی خبر نہیں۔ اس کے گھنے لمبے بال بکھر کر اس کے سینے اور منہ پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ کسی درخت کی مانند تیز ہوا میں ادھر اُدھر جھولتے جیسے انداز میں حرکت کر رہی تھی۔ جھونپڑے کے اندر پیر صاحب دھیمی آواز میں کوئی سمجھ میں نہ آنے والا جنتر منتر پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی چلہ کاٹ رہے ہیں وہ اور فاطمہ مائی جس کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال کی رہی ہوگی پیر صاحب کی جادوگری میں پھنس کر اس کی پکڑ میں نا جانے کب سے تھی اور خدا معلوم یہ سلسلہ اس کے ساتھ کب سے جاری تھا۔

مجھے اس کی حالت دیکھ کر اکثر یہ لگا تھا جیسے وہ کوئی اندرونی مرض میں مبتلا ہے جو ہر وقت ادھ موئی سی رہتی تھی، آج اس کی حالت دیکھ کر مجھے علم ہوا تھا کہ اس کے ساتھ پیر صاحب کیا کھیل کھیل رہے تھے۔

اندر کے منظر نے مجھے انتہائی خوفزدہ کر دیا تھا اور میں گرتا پڑتا واپسی کے لیے چل پڑا۔ جب وہ خشک نالہ عبور کر کے میں جھاڑیوں کی طرف بڑھا تو میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے حصار کے دوران میرے سامنے آنے والا سر سے پاؤں تک گھنے بالوں میں لپٹا وہی وجود کھڑا تھا۔ میں پیر صاحب کا بتایا عمل دہرانے ہی والا تھا کہ اچانک میرے اندر کی دبی ہوئی خواہش اور شوق نے میرے ہونٹ بند کر دیے اور میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے اُس سے مخاطب ہوا۔

”اے خدا کی مخلوق! میرا اسلام قبول کرو اور مجھ سے ہم کلام ہو۔“ مگر وہ خاموش کھڑا رہا اس کے بالوں سے بھرے چہرے پر آنکھوں والے حصہ سے گہرے سرخ رنگ کی ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ کر مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں نے پھر وہی فقرہ دہرایا اور اُسے مخاطب کیا مگر وہ بدستور اسی حالت میں میرے سامنے جما ہوا تھا۔ جب وہ نہ بولا تو میں نے اس کی طرف دیکھتے آخری بار کہا کہ پیر صاحب نے تمہارے جانے کے بارے میں جو عمل مجھے بتایا ہوا ہے مجھے اس پر مکمل عبور ہے اس لیے تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

☆......☆......☆

”مجھے شروع دن سے تم سے یہی خواہش تھی کہ تم براہ راست میرے کہنے پر میرے پاس آؤ اور دکھی لوگوں کے کام کرو۔“ اس بار اس کی طرف سے ایسی آواز ابھری جیسے عید قربان پر ہمارے ذبح ہونے والے بکرے کے کٹے گلے سے خون اور تیز سانس کی خرخراہٹ ہوتی تھی۔

”سنو! اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے پیر صاحب کو راستے سے ہٹانا ہوگا یا پھر مجھے اپنے حکم کی بجا آواری کے لیے آتشی چلہ جس کی مدت معیاد اکیس منگل کی پچھلی راتیں صبح سورج اُگنے تک، ہر منگل کو چلہ کشی کرنا ہوگی۔ اگر کسی بھی رات کو پڑھتے پڑھتے تمہاری آنکھ لگ گئی تو میں تمہاری زندگی کی تمام گھڑیاں تاریکی کے سپرد کر دوں گا یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ آتشی چلہ تمہیں پانی میں ناف تک ڈوب کر کرنا ہوگا۔“ بتا کر وہ رک گیا۔

”مجھے تو چلہ کے بارے میں کچھ بھی خبر نہیں ہے۔“ میں نے اس کی سرخ انگارہ آنکھوں میں جھانکتے اس بات کا جواب دیا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ میں تمہیں بتا دوں گا کہ وہ چلہ تیرے پیر جی نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ نکال کر ساری ترکیب اور عمل کی عبارت یاد کر لینا۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو جو تمہارا حکم ہوا کرے گا۔ میں اس پر عمل کرنے کا پابند رہوں گا مگر یہ فیصلہ کر لینا کہ ذرا سی بھول چوک تیری زندگی کا آخری لمحہ ٹھہرے گی۔ اگر تم نے مجھ پر بغیر چلہ کشی کے قابو پانا ہے تو راستے کی دیوار گرانا ہوگی۔ جب تک تیرے شاہ جی زندہ ہیں میں کسی

اور کے بس میں نہیں آ سکتا۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہو اپنے پیر صاحب کو جو (چھاندروشکتی) چلہ کرنے میں معروف ہے۔ فاطمہ مائی کو چارے کے طور پر اس نے بے سُدھ کر کے اپنے عمل کا حصہ بنا رکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ چھاندروشکتی بھی اپنے بس میں کرلے گا۔"

"یہ چھاندروشکتی کیا ہے۔"

یہ سفلی علم کے ماہر برہمچاری جو مر کر بھٹکتے پھرتے ہیں، ان کی روح اپنے قابو میں کر کے اس سے گھناؤنے کام کروانے جیسے کہ کسی کو مارنا اور تباہ برباد کرنا ہو تو ان سے کرواتے ہیں اس علم پر عبور رکھنے والے۔" یہ بتا کر وہ خاموش ہوگیا۔

"تو کیا تم نہیں کر سکتے یہ سب کچھ مرا مطلب تم بھی تو بہت طاقتور ہونا۔"

"بس میں اتنی حد تک ہی اپنے عامل کا حکم بجالاسکتا ہوں اس سے آگے میں کچھ کر نہیں سکتا۔"

"اچھا مجھے ایک دو روز سوچنے کا موقع دو۔"

"ہاں ہاں جب تم کوئی فیصلہ کر لینا تو مجھے اسی مقام پر آکر آواز دینا کیونکہ مری حد یہاں تک ہے۔" یہ بتا کر وہ میری نظروں سے غائب ہوگیا۔

میں تمام راستے اس ماقوق الفطرت عفریت کے بارے میں سوچتا رہا جو مجھے پیر صاحب کو راستے سے ہٹانے کے بارے میں اُکسا کر گیا تھا۔

اپنے بستر پر پڑے میں پیر صاحب کے بارے میں سوچتا رہا اور پلان مرتب کرتا رہا کہ ان کو کیسے راستے سے ہٹا کر میں اس پراسرار قوت پر کنٹرول کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کی ہلکی سفیدی پھیل رہی تھی۔ جنگل کی طرف کھلنے والی کھڑکی جس کو باہر سے لوہے کی مضبوط جالی لگا کر بند کیا گیا تھا اس سے باہر کا منظر صاف دکھائی پڑتا تھا۔ آگے آگے پیر صاحب اور ان کے پیچھے تھکے ہوئے قدموں سے چلتی فاطمہ مائی آستانے کی طرف آرہے تھے۔ پیر صاحب کے آنے کا انتظار تھا مجھے۔ پیر صاحب اپنے حجرۂ خاص میں چلے گئے جبکہ فاطمہ مائی اندر زنان خانے کا دروازہ کھولتے میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

میں رات بھر کا نیند سے بوجھل اور نڈھال اپنے بستر پر سیدھا ہوگیا۔

دوپہر تک پڑا میں بے خبر سوتا رہا پھر اُٹھ کر لنگر خانے سے روٹی دال لے کر اپنے بستر پر آگیا۔ پیر صاحب کے واپس آنے کا پتا چل گیا تھا مجھے اب ان کے جانے کی خبر رکھنا تھی مجھے۔

درس کا ایک ساتھی مجھے لینے آیا تو میں طبیعت خرابی کا بہانہ بناتے اُسے واپس بھیج دیا۔ کھانے کے بعد میں دوبارہ بستر پر لیٹ کر اس پراسرار مخلوق کی باتوں پر غور کرنے لگا جسے پیر صاحب نے اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔

یہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی شام ڈھلنے جا رہی تھی کہ چھوٹے شاہ جی میرا پتا کرنے آگئے۔ میری تھکاوٹ اتر چکی تھی اور میں رات کے انتظار میں تھا کہ کب پیر صاحب فاطمہ مائی کے ساتھ جنگل کی طرف جائیں گے۔

چھوٹے شاہ میری چارپائی کے قریب آرکے میں مچلا بنا بیماروں کی طرح پڑا رہا۔

"کیا حال ہے تمہارا لیاقت علی؟"

"جی پہلے سے بہتر ہے۔" میں نے کراہنے کی ایکٹنگ کی۔

انہوں نے کھڑے کھڑے مجھ پر دم کرتے پھونک ماری اور آرام کرنے کا کہتے کمرے سے باہر چلے گئے۔

ان کے جانے سے بعد میں نے اپنی چارپائی کھینچ کر کھڑکی کے قریب کرلی اور پڑے پڑے دھیان باہر کی جانب کرلیا۔ کھانا لڑکا مجھے آکر دے گیا تھا۔ جب عشاء کے بعد سب حفظ کرنے والے اور والیاں اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تو چاروں جانب خاموشی طاری ہونے لگی۔ مجھے زنان خانہ کے بڑے گیٹ سے فاطمہ مائی باہر آتی دکھائی دی جو آستانہ کی طرف بڑھ رہی تھی میری آنکھیں اب آستانہ کے صدر دروازے پر مرکوز تھیں۔ زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا کہ آگے پیر صاحب اور پیچھے فاطمہ مائی آستانہ سے باہر نکلتے دکھائی دیے۔ پیر صاحب کا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پیر صاحب رات والا منظر دہرانے جارہے ہیں۔

جب میری آنکھوں سے وہ دونوں اوجھل ہوگئے تو

میں نے اپنی چارپائی چھوڑ دی اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور حفظ ما تقدم سامان والی کھوٹی سے کسی اُٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لی۔ میں نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی مگر میں آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

بڑی احتیاط سے میں نے جھونپڑے کے عقب میں رُکتے ایک جھری سے آنکھ لگاتے اندر کا منظر دیکھا تو مارے شرم کے میری آنکھ جھک گئی۔ پیر صاحب ہمارے عالم تھے اور ہم ان سے اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر ان کا یہ روپ میرے لیے باعث ندامت تھا۔ جس آگ میں فاطمہ مائی کو جلا کر وہ کندن بنا رہے تھے خدا معلوم اس راستے کتنی بچیاں گزری ہوں گی۔ یکدم اندر کے منظر نے مجھے اندھا کر دیا اور میں گھوم کر سامنے والے حصہ میں آ گیا اور لات مارتے وہ دروازہ جو لکڑی کے چھوٹے بڑے ڈنڈوں کو آپس میں باندھ کر بنایا گیا تھا اندر جا گرا۔

پیر صاحب اور فاطمہ مائی خود کو سنبھالتے گھبرا گئے۔ اس سے پہلے کہ پیر صاحب سنبھلتے میرا 'کسی' والا وار پیر صاحب کی گردن پر پڑا اور اُن کا سر فٹبال کی طرح تن سے کٹ کر جھونپڑے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ پیر صاحب کی کٹی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ فاطمہ مائی برہنہ حالت میں جھونپڑے کے ٹوٹے کھڑکے سے چیختی چلاتی باہر کی طرف بھاگی۔ میں 'کسی' سنبھالتا ہوا اس کے پیچھے لپکا اور تھوڑی دور جا کر اُسے جا لیا۔ اگر وہ بھاگتی نا تو شاید میں اس کی حالت پر ترس کھاتے اُسے چھوڑ دیتا۔ مگر اس نے میرے اندر سے اُٹھنے والے ہمدردی کے احساس کو اپنی چیخ و پکار کے شور میں دبا دیا اور میرے ایک ہی وار میں اس کا بھی سر کٹ کر میرے قدموں میں گرا چند پل وہ تڑپی اور پھر ٹھنڈی ہو گئی۔ میں نے اس کا کٹا ہوا سر بالوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور اس کی لاش کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا جھونپڑے میں لے آیا۔ دونوں کی لاشوں کو ایک دوسرے پر گراتے دونوں کے سر 'کسی' کے کئی بھرپور وار کرتے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بدل دیے۔ میری تمام رات دونوں کے ٹکڑے کرتے گزر گئی۔ میں نے ان کو اسی طرح کاٹ ڈالا تھا جیسے قصائی بکرے کو کاٹ کر گوشت کا ڈھیر لگاتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ان کے کٹے جسم کے ٹکڑوں پر ان دونوں کے اترے کپڑے ڈالتے میں نے ٹوٹا کھڑکا اُٹھا کر دوبارہ جھونپڑے کا کھلا حصہ بند کیا اور کسی' اُٹھا کر باہر نکل آیا۔

میرے قدم تیز تیز آستانے کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ چاروں جانب ادھ رنگا اجالا نمودار ہو رہا تھا اور میں مسجد کے غسل خانے میں آ کر کپڑوں سمیت ٹونٹی کے نیچے بیٹھ گیا۔ میرے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا۔ مسلسل پانی گرانے پر وہ ڈھل گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے 'کسی' کو دھویا اور دوبارہ کپڑے نچوڑ کر پہنتے ہوئے کسی اپنی جگہ پر رکھی اور خاموشی سے چلتا ہوا۔ اپنے کمرے میں آ گیا۔ سب سے پہلے گیلے کپڑے اُتارے، ان کو شاپر میں باندھ کر چارپائی کے نیچے چھپایا اور دوسرے کپڑے پہن کر اپنے بستر پہ بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔

میرے پورے وجود پر چھایا ہوا دوہرے قتل کا خمار اُتر چکا تھا اور میں ڈرا سہا پڑا اس انتظار میں تھا کہ پیر صاحب اور فاطمہ مائی کو زنان خانہ میں نا پا کر پورے آستانے میں کہرام برپا ہو جائے گا مگر حسب معمول اذان بھی ہوئی۔ سب نے نماز بھی پڑھی اور ناشتا بھی کیا۔ اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گئے۔ حفظ کرنے والے مسجد کی طرف آ گئے۔ آستانے کے لوگ پیر صاحب کے نکلنے کے انتظار میں ادھر اُدھر بیٹھ گئے۔ میں بھی نیند سے بوجھل آنکھوں کو زبردستی کھولتے اُٹھ کر نقاہت آمیز قدموں سے چلتا مسجد کے حصہ میں آ بیٹھا، جہاں دوسرے حفظ کرنے والے اپنے اپنے پارے دہرا رہے تھے۔ کوئی بھی غیر معمولی بات ابھی تک نہیں اُٹھی تھی۔ لنگر خانے میں کھانے کا بندوبست جاری تھا چھوٹے شاہ صاحب روزمرہ کی طرح کھانے کے انتظام میں لگے ہوئے تھے۔ میں بظاہر تو نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹے شاہ صاحب نے میری طبیعت کا پوچھا تو میں نے جواباً کہا کہ آپ کے دم کی برکت سے کافی بہتر ہوں۔

انہوں نے دوبارہ کچھ پڑھ کر میرے جسم پر پھونک ماری اور مجھے آرام کرنے کا کہتے ایک مرید کی طرف پلٹے جو بڑے پیر صاحب کے آستانے میں موجود نا ہونے کا پوچھ رہا تھا۔

جواباً انہوں نے بتایا کہ ایک حفظ کرنے والی بچی کی

طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ جسے وہ لے کر شہر چلے گئے تھے۔ صبح فجر سے پہلے شاید شام تک آجائیں۔ آپ لوگ انتظار کریں۔ لنگر تیار ہونے میں ابھی تھوڑا وقت ہے آپ ذکر کریں اس وقت تک۔" "جی بہتر حضور!" کہتے مرید آستانے کی طرف پلٹ گیا۔ میں چھوٹے شاہ صاحب کے اس جواب پر تذبذب میں مبتلا ہوگیا کہ یہ بات انہوں نے کیوں کہی۔ بظاہر میں پارہ دہرا رہا تھا مگر میرے اندر طرح طرح کی قیاس آرائیاں چل رہی تھیں۔

لنگر مکمل چکا تھا میں نے بھی زہر مار کیا اور آستانے میں آ بیٹھا۔ چھوٹے شاہ صاحب دیکھنے کو تو بالکل صحیح حالت میں تھے۔ سب سے بڑی محبت سے پیش آتے مگر میری طرح ان کے اندر بھی شاید کئی وسوسے تھے کہ پیر صاحب فاطمہ مائی سمیت غائب تھے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ان کا سارا پیرخانہ برباد ہوجائے گا۔

اُدھر میں اپنے پلان میں لگا ہوا تھا میں نے کھاد والا خالی پلاسٹک کا تھیلا قابو کر رکھا تھا۔ جو میں نے سوچ کر کہ تھوڑا تھوڑا ان کا کٹا ہوا گوشت روز اس طرح ادھر اُدھر پھینکوں گا کہ چیل کوے اور جنگلی جانور ان کو اپنی خوراک بنا ڈالیں گے۔

رات کے پچھلے پہر میں اُٹھا۔ پلاسٹک کا تھیلا سنبھالا اور گرتا پڑتا جھونپڑے میں آ گیا۔ بڑی احتیاط سے کٹے ہوئے انسانی گوشت کو تھیلے میں بھرا اور باقی پر پھر ان کے کپڑے ڈالتا کمرہ کا بند کیا اور جنگل میں آگے کی طرف چل پڑا۔ میرے اندر کے خوف نے اس سنسناتی تاریک رات کا ڈر بھی ختم کر دیا تھا۔ میں بے پروائی سے چلتا آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا اور تھیلے میں سے تھوڑا تھوڑا گوشت نکال کر ادھر اُدھر بھی پھینکتا جاتا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر میں واپسی کے لیے چل پڑا۔

میں تمام راستے اس مافوق الفطرت وجود کو بھی محسوس کرنے کی کوشش میں لگا رہا مگر ان دونوں کے قتل سے لے کر اس وقت تک اس کا دور دور تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ واپس آکر میں نے خود کو صاف کیا، کپڑے بدلے اور پہنے ہوئے کپڑے اُتار کر ان کو بالٹی میں ڈبو دیا اور اپنے بستر پر گرتے سو گیا۔ پانچواں دن گزر چکا تھا۔ ان کی لاشیں کب کی فنا ہو چکی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے وہ جھونپڑا بھی جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔ شاہ صاحب ہر پوچھنے والے کو کوئی نا کوئی بہانہ بنا کر مطمئن کر دیتے۔ اب وہ خود آستانے میں بیٹھ رہے تھے۔

فاطمہ مائی کے گھر والوں کو پتا نہیں انہوں نے کیا کہہ کر اپنی جگہ قابو کر لیا تھا۔

اسی دوران میں نے چھٹی لے کر گھر جانے کا فیصلہ کر لیا اور چھوٹے شاہ صاحب سے اجازت لے کر اپنا سارا سامان سمیٹا اور گھر جانے کے لیے اسٹیشن پر آگیا۔

☆......☆......☆

گھر آکر میرا حال برا ہو چکا تھا۔ ہر پل بے چینی، طرح طرح کے خیالات، خوف اور ڈر کی فضا میں میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ دن رات پیر صاحب اور فاطمہ مائی کے قتل کا منظر میرے ذہن کو خوفزدہ کیے رکھتا۔ میری بگڑی حالت پر گھر والے بھی پریشان تھے مگر میں کسی کو کیا بتاتا کہ میں نے لالچ میں آکر کیا کر ڈالا تھا۔

ایک رات میرے گھر آکر چھوٹے شاہ صاحب اور پولیس نے مجھے جگا کر اپنی گاڑی میں لا بٹھایا اور لے کر آستانے پر آگئے۔ تھوڑے سے تشدد پر میں نے پیر صاحب اور فاطمہ مائی کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ پولیس مجھ سے ابھی تک لاشوں اور آلۂ قتل برآمد کرنے پر بضد ہے جبکہ میں ان کو کئی سے دونوں کو قتل کرنے اور جنگل میں جلایا ہوا جھونپڑا دکھا کر بار بار بتا چکا ہوں مگر وہ میرا اعتبار نہیں کر رہے۔

میں نے ان کو قتل کیوں کیا۔ اس کی دو وجوہات بیان کر چکا ہوں۔ ایک پیر صاحب کا گھناؤنا کردار اور دوسرا اس مافوق الفطرت مخلوق کو اپنے تابع کرنے کا طمع، مگر اس لالچ میں آکر میں نے گمراہی کا راستہ خود چن لیا تھا یا اس بلا نے مجھے اپنے بس میں کرکے یہ سارا کھیل رچایا اور پیر صاحب کے قتل ہوتے ہی وہ آزاد ہو کر مجھے قانون کا مجرم بنا کر رسوائی کی دلدل میں زندہ درگور کر گئی۔" کہتے لیاقت علی نے ندامت سے اپنا سر جھکا لیا اور وہ نادیدہ بلا میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ جسے کہہ رہی ہو۔ "لیا تو! تیرا جھکا سر، میرا سر تیرے پیر خانے سے آزاد کرا کے آزاد کرا چکا ہے۔ فکر نہ کر میں جلد تجھے اس کا انعام ضرور دوں گی...... ہاہاہا۔"

☆......☆......☆......☆



خونی پلیٹ فارم



ممتاز احمد

ایک ایسے خونی پلیٹ فارم کی داستان، جسے خبیث ارواح نے عفریت میں جکڑ لیا تھا

وہ ایک دورافتادہ شہر کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ جب انگریز دور میں برصغیر پاک و ہند میں ریلوے لائن بچھائی گئی، پہلے تو اِس شہر کے قریب سے ریلوے لائن گزرتی تھی کیوں کہ پہلے یہ ایک قصبہ تھا مگر جوں جوں آبادی بڑھتی گئی تو اِس شہر نے قصبے سے شہر کا روپ دھارا، سب تحصیل سے تحصیل بنا تو پھر ایک ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا۔ یہ ریلوے اسٹیشن آبادی سے ذرا ہٹ کے تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے داخلی اور خارجی راستے کے سامنے ایک کشادہ سڑک تھی۔ جو سیدھی شہر کو جاتی تھی، پچھلی جانب ایک بہت قدیم قبرستان تھا۔ تھوڑی سی زرعی، بے آباد زمین اور آگے ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ اس ریلوے اسٹیشن پر کچھ پسنجر لوکل ٹرینیں رکتی تھیں اور تین ایکسپریس تیز رفتار نان اسٹاپ ٹرینیں یہاں سے گزرتی تھیں۔ دن بھر کئی منچلے یہاں آکر پلیٹ فارم پر کرکٹ کھیلتے اور اسٹیشن کا عملہ بھی اِن کے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتا۔ اِس ریلوے اسٹیشن کے ساتھ ہی آٹھ سے دس کوارٹرز عملے کی رہائش کے لیے بنے ہوئے تھے۔ اِسی اسٹیشن پر سال بعد کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا جس کی وجہ سے کئی مسافر شدید زخمی ہو جاتے اور کچھ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ مزید یہ کہ اسٹیشن کے عملے میں سے بھی کسی نہ کسی کی اذیت ناک موت ہو جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ اِس اسٹیشن اور پلیٹ فارم کے بارے میں بہت سی پُراسرار باتیں مشہور ہونا شروع ہوگئیں۔ اب صورتِ حال یہ ہونے لگی کہ کسی بھی اہلکار کی ٹرانسفر یہاں ہوتی وہ سفارش یا اثر و رسوخ سے رُکوا لیتا۔ اِدھر آنے کو کوئی بھی تیار نہ ہوتا۔ عامر بھی اِسی اسٹیشن کے عملے کا ایک اہلکار تھا، وہ بوجہ مجبوری یہاں رُکا ہوا تھا کیونکہ اُس کی ترقی ہونے والی تھی اور تین ماہ بعد ایک بڑے ریلوے اسٹیشن پر ایک اہلکار کی ریٹائرمنٹ ہونا تھی، تو افسران کا یہ وعدہ تھا کہ جب وہ سیٹ خالی ہوگی تو اُسے ترقی دے کر وہاں تعینات کر دیا جائے گا۔ اِسی اُمید پر عامر یہاں اپنا وقت گزار رہا تھا۔ اُس کی فیملی اُسی بڑے شہر میں رہائش پذیر تھی جہاں ترقی کے بعد اُس کی تعیناتی متوقع تھی۔ عامر یہاں اکیلا ہی کوارٹر میں رہتا تھا۔ ایک دن عامر اپنے کوارٹر میں لیٹا ہوا تھا۔ گرمیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ رات کے بارہ بجے یہاں سے ایک تیز رفتار نان اسٹاپ ٹرین گزرنی تھی۔ رات کے پونے بارہ بجے عامر اپنے کوارٹر سے باہر نکلا تاکہ لائن، کانٹا وغیرہ چیک کر کے دیگر عملے کے ساتھ آنے والی ٹرین کو کلیئرنس دے سکے۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا پلیٹ فارم کی طرف جا رہا تھا تو اچانک وہ اِس طرح ٹھٹک کر رُک گیا، جیسے کوئی ڈراؤنا اور بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے اِس کی اچانک آنکھ کھل گئی ہو۔ وہ آواز اور منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ عامر کے رونگٹے کھڑے

ہو گئے۔ اُس نے جو منظر دیکھا گو وہ دُھندلا تھا مگر عامر کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک جوان عورت کے جسم کے تین ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور ایک بہت بڑا اژدھا اُن کے اوپر رینگ رہا تھا اور منہ سے لمبی سُرخ زبان بار بار نکال کر ان ٹکڑوں پر پھونک مارتا تو آگ کے شعلے نکلتے اور ایک سیٹی کی آواز نکلتی۔ عورت کے سر سے سسکنے اور کراہنے کی دلخراش آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر اُس کے ذہن کو دوسرا جھٹکا اُس وقت لگا جب عورت کے جسم کے تینوں ٹکڑے ایک دم جڑ گئے اور وہ کھڑی ہو گئی، اژدھا اُس

وہ عورت اور اژدھا اُسی لمحے دھواں بن کر اُڑ گئے۔ دوسری جانب سے ایک اہلکار کلیئرنس کے لیے ٹوکن اور گولا لے کر آرہا تھا تو اُسے دیکھ کر عامر کی جان میں جان آئی پھر چند منٹوں کے بعد ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی اسٹیشن سے گزر گئی۔ عامر اُسی لمحے اپنے کوارٹر کی طرف دوڑا اور چارپائی پر گر پڑا۔ اُس کا جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔

☆......☆......☆

صبح اُس نے رات والا واقعہ سب کو سنایا تو پورے عملے میں خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ اب رات کو گزرنے



کے جسم سے لپٹ گیا اور یہ جھٹکا کسی ننگے تاروں میں دوڑتے ہوئے کرنٹ سے زیادہ شدید اور ہولناک تھا۔ خوف سے عامر کی گھگھی بندھ گئی۔ اُس کا جسم خوف وہراس سے کانپ رہا تھا، جیسے یخ بستہ سرد رات کو اچانک گرم گرم بستر سے ایک دم انسان باہر نکل آئے اور شدید سردی سے کانپنے لگے۔ قریب تھا کہ عامر لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ اچانک دور سے آنے والی ٹرین نے زوردار ہارن بجایا اور ٹرین کی لائٹ نظر آئی تو

والی ٹرینوں کو کلیئرنس دینے کے لیے کوئی اہلکار اکیلا نہ نکلتا تھا، سب مل کر نکلتے اور ٹرینوں کو کلیئرنس دیتے۔ کچھ دن خیریت سے گزرے۔ ایک رات کے آخری پہر عامر شاید کسی کام سے یا ویسے اپنے کوارٹر سے نکلا اور پھر وہ ہو گیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صبح پلیٹ فارم پر عامر کی اُدھڑی ہوئی لاش پڑی تھی، جگہ جگہ سے گوشت نچا ہوا تھا، ہڈیوں کا پنجر تھا صرف۔ چہرے کے خدوخال

سے پتا چل رہا تھا کہ یہ عامر کی لاش ہے۔ فوراً پولیس کو اطلاع دی گئی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دیا گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے تمام ملازمین کے بیان لیے گئے۔ عامر کی دردناک اور ہولناک موت کے بعد پورے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگوں نے ٹرین کا سفر تو بات اسٹیشن کی طرف سے گزرنا چھوڑ دیا۔ ملازمین نے چھٹیاں اپلائی کر دیں، کچھ ٹرانسفر کے لیے تگ و دو میں لگ گئے۔ پورے شہر میں اسٹیشن کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ آسیب زدہ ہے اور جنات کا سایا ہے۔

اِدھر حکومت نے ایک بہت بڑا انڈسٹریل اسٹیٹ یہاں قائم کیا تھا اور اس شہر کو تحصیل سے ضلع کا درجہ دیا جانے والا تھا، تو اِسی سبب سے دو نئی ٹرینیں یہاں سے چلانے کا پلان بھی مکمل تھا مگر اِن حالات میں کوئی بھی ملازم اِس اسٹیشن پر ڈیوٹی کے لیے آمادہ نہ تھا۔ لوگوں کو بھی کافی سفری مشکلات کا سامنا تھا۔ ریلوے اسٹیشن اُجاڑ اور ویران ہو گیا۔ ٹھیلے والے اور دیگر اسٹال والے سب لوگ اسٹیشن چھوڑ گئے۔ اب اسٹیشن پر ویرانی کا راج تھا۔ اِن حالات میں عبدالحفیظ نامی اسٹیشن ماسٹر نے کچھ بہادر، دلیر اور نڈر ملازمین کو ساتھ ملایا اور اِس صورتِ حال سے نپٹنے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ عبدالحفیظ سمیت آٹھ ملازمین کی ٹرانسفر کے آرڈرز یہاں کر دیے گئے۔ اِس پُراسرار خوفناک اور آسیب زدہ اسٹیشن کا چارج لینے سے پہلے عبدالحفیظ اپنے مرشد پاک کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا۔

جب عبدالحفیظ حاضری کے لیے اپنے پیر کے پاس پہنچا تو مرشد سرکار جو کہ سیّد تھے اور سلسلہ قادریہ کے پیر تھے، اپنے آستانے سے باہر ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، نورانی چہرہ اور سفید داڑھی، آنکھیں بند کیے اُن کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر کسی وظیفے کا وِرد کرنے میں مصروف تھیں۔ عبدالحفیظ اُن کے قریب خاموشی سے بیٹھ گیا، چند لمحوں کے بعد اُنھوں نے آنکھیں کھولیں اور عبدالحفیظ کو اپنے پاس بلایا۔ سلام دعا کے بعد عبدالحفیظ نے تمام ماجرا اُن کی خدمت میں گوش گزار کیا تو چند لمحوں کے توقف کے بعد اُنھوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا اور ایک تعویذ لکھ کر عبدالحفیظ کو دیا کہ اسے چاندی کے خول میں پیک کرا کے گلے میں پہن لو اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کرنا۔ اس کے علاوہ اور ضروری ہدایات بھی دیں اور مسلسل رابطے میں رہنے کا کہا۔

عبدالحفیظ نے اپنے مرشد سرکار کی دعا لی اور اللہ کا نام لے کر اپنے عملے کے ہمراہ اِس اسٹیشن کا چارج لے لیا۔ تمام کوارٹرز کی صفائی کروائی، پورے پلیٹ فارم پر تمام پولز پر مرکری بلب لگوائے، سب کو تسلی دی اور ڈیوٹی شروع کر دی۔

رات کو گزرنے والی ٹرینوں کی کلیئرنس، لیمپ جلانا، کانٹا بدلنا، ٹوکن گولا وصول کرنا اور دینا وغیرہ ایسے کام عبدالحفیظ عملے کے ساتھ مل کر سرانجام دیتا تاکہ عملے کا حوصلہ قائم رہے۔ عبدالحفیظ کو آئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے، پورے اسٹیشن اور پلیٹ فارم کی لائٹیں جل رہی تھیں، ٹرین کے آنے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ عبدالحفیظ اپنے دفتر سے اُٹھ کر پلیٹ فارم کی طرف آیا تو اچانک تمام لائٹیں بند ہو گئیں جبکہ بجلی موجود تھی۔ عبدالحفیظ کسی کو آواز دینے لگا تو اچانک اُس کے کانوں میں رونے اور سسکنے کی آوازیں آنے لگیں اور لحہ بہ لحہ یہ آوازیں تیز ہونے لگیں پھر ایک زور کی چیخ بلند ہوئی اور اگلے لمحے عبدالحفیظ کے سامنے انتہائی کریہہ، خوفناک اور ڈراونی شکل والے پتلے آ گئے جن کے لمبے لمبے ناخن چاقو کی طرح تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اُس کے جسم کو نوچ لینا چاہتے ہیں۔ وہ آگے بڑھتے مگر کوئی نادیدہ طاقت اُنھیں آگے بڑھنے سے روک دیتی، وہ عبدالحفیظ کے قریب نہیں آ رہے تھے۔ عبدالحفیظ نے مرشد سرکار کا بتاتے ہوئے وظیفے کا وِرد شروع کر دیا، جب وِرد مکمل ہوا تو اُس نے اُن پتلوں کی طرف زور سے پھونک ماری تو وہ اور پیچھے ہٹ گئے مگر انتہائی غصّے کے ساتھ شور کرنے لگ گئے۔ عبدالحفیظ نے دوسرے وظیفے کا وِرد شروع کیا تو اُس کے کانوں میں آواز آئی کہ آج تو تم بچ گیا مگر آیندہ نہیں بچے گا۔ تیری موت بھی عامر جیسی ہوگی۔" پھر وہ پتلے غائب ہو گئے اور پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی لائٹیں خود ہی آن ہو گئیں۔ اگلے دن عبدالحفیظ نے ساری صورتِ حال سے ٹیلی فون کے ذریعے مرشد سرکار کو آگاہ کیا۔ اُنھوں نے سختی سے ہدایت دی کہ گلے کے تعویذ کا خاص خیال

اور حفاظت کرتا۔

دو دن سکون سے گزرے، تیسری رات جب ٹرین آنے کا وقت ہو گیا تو عبدالحفیظ نے کلیئرنس کے لیے ٹوکن گولا تیار کیا۔ کانٹے والے نے کانٹا تبدیل کیا، ابھی سگنل ڈاؤن نہیں کیا تھا کہ عبدالحفیظ کو پلیٹ فارم پر ایک بڑی سی مرغی نظر آئی۔ پھر اگلے لمحے وہ ایک بکری میں تبدیل ہو گئی اور پھر ایک دم بہت بڑی دیوہیکل بھینس کی شکل اختیار کر گئی۔ اُس کی لال سُرخ آنکھیں اور منہ اور نتھنوں سے انتہائی تیز خوفناک آوازوں کے ساتھ آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور وہ آن کی آن میں عبدالحفیظ کو اپنی ٹانگوں تلے روندنے اور اُدھیڑنے کے لیے بے قرار تھی اور اُس کی طرف بڑھنے لگی۔ عبدالحفیظ نے فوراً مرشد سرکار کے بتائے ہوئے وظیفے کا ورد شروع کر دیا اور اپنے حواس قائم رکھے۔ اُدھر ٹرین کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ دیوہیکل بھینس منہ سے آگ اُڑاتی عبدالحفیظ کے قریب پہنچ کر اپنی اگلی دونوں ٹانگیں زور زور سے زمین پر رگڑنے لگی اور اس کے کھروں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ عبدالحفیظ نے وظیفہ پڑھ کر بھینس پر پھونک ماری تو وہ تھوڑی سی پیچھے ہٹی مگر اور زیادہ غصّے میں خونخوار ہو گئی۔ عبدالحفیظ نے دوسرا وظیفہ پڑھا اور مرشد سرکار کی ہدایت کے مطابق بھینس پر زور سے تھوکا تو وہ پیچھے ہٹنے لگی اور بالآخر دھوئیں میں تحلیل ہو گئی۔

جیسے ہی عبدالحفیظ دوسری جانب پلٹا تو یہ دیکھ کر اُس کے پاؤں سے زمین نکل گئی کہ سگنل ڈاؤن ہے مگر کانٹا خود بخود تبدیل ہو چکا تھا اُدھر ٹرین آ رہی تھی، ہارن بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اگر ٹرین اُسی ٹریک پر آ جاتی جو کہ خود بخود تبدیل ہوا تھا تو ریلوے کی تاریخ کا بہت بڑا حادثہ کہلاتا۔ کئی مسافر موت کے منہ میں چلے جاتے، نہ صرف ٹرین اُلٹ جاتی بلکہ آگ بھی لگ جاتی اور وسیع پیمانے پر تباہی ہوتی۔ عبدالحفیظ نے فوراً کانٹے والے کو آواز دی، ٹرین سگنل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اُس نے دوڑ کر فوراً کانٹا تبدیل کیا، اتنی دیر میں کانٹے والا بھی پہنچ گیا۔ عبدالحفیظ نے اُس کو کہا فوراً ٹریک چیک کرو، وہ خود کانٹا تبدیل کرنے والے لیور کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور وظیفے کا ورد شروع کر دیا کہ کوئی نادیدہ طاقت پھر

فکر مند

ایک صاحب ایک مہینے کے لیے بیرون ملک جا رہے تھے۔ ایئرپورٹ جانے کے لیے وہ گھر سے نکلے تو کچھ لیٹ ہو چکے تھے۔ راستے میں گھڑی دیکھتے ہوئے وہ ڈرائیور سے بولے۔

''گاڑی تیز چلاؤ...... کہیں میری فلائٹ نہ نکل جائے۔''

ڈرائیور جو پہلے ہی گاڑی تیز چلا رہا تھا، فوراً بولا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاحب! میں آپ کی فلائٹ نکلنے نہیں دوں گا۔ کیونکہ بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ اگر آپ کی فلائٹ نکل گئی تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گی۔''

مرسلہ: اسامہ ندیم۔ کراچی

تبدیل نہ کر دے۔

سب کچھ ٹھیک تھا، لائن کلیئر تھی، ٹوکن گولا لگا دیا گیا اور دو منٹ کے بعد ٹرین فراٹے بھرتی ستر کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے خیریت سے گزر گئی۔ سب نے شکھ کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

☆......☆......☆

عبدالحفیظ نے صبح ٹیلی فون پر مرشد سرکار کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا، جس پر اُنہوں نے فرمایا کہ اِن تمام خطرناک حالات و واقعات کے سدِباب کے لیے اُن کا خود آنا بہت ضروری ہو گیا ہے اور وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔''

اُنہوں نے عبدالحفیظ کو تلقین کی کہ وہ وظائف کا وِرد جاری رکھے۔ ریلوے اسٹیشن کو ایک منٹ کے لیے بھی نہ چھوڑے، خود موجود رہے اور ہر کام اپنی نگرانی میں

کروائے اور ہر چیز پر کڑی نگاہ رکھے۔'' کسی معاملے میں ایک لمحے کی غفلت نہ برتے۔

اُسی شام مرشد سرکار پہنچ گئے۔ اُنہوں نے آکر پورے ریلوے اسٹیشن اور پلیٹ فارم کا تفصیلی جائزہ لیا اور گہری سوچ میں مستغرق ہوگئے۔ اُنہوں نے تمام ملازمین کو تعویذ لکھ کر دیے کہ اپنے اپنے گلے میں ڈال لیں۔ پھر ایک تعویذ لکھ کر کانٹا بدلنے والے لیور پر باندھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹرین آئی اور تھوڑی دیر رُکنے کے بعد بخیر وعافیت چلی گئی۔

مرشد سرکار نے بتایا کہ آج کی رات بہت کڑی اور اہمیت کی حامل ہے کیونکہ آج کی رات اماوس کی رات ہے۔ اب رات بارہ بجے سے پہلے کسی ٹرین نے نہیں آنا تھا، اب جو کچھ بھی کرنا تھا یا ہونا تھا وہ رات بارہ بجے سے پہلے پہلے ہو جانا تھا۔

مرشد سرکار نے مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد پلیٹ فارم پر آکر جائے نماز پر بیٹھ کر طویل مراقبہ کیا اور عشاء کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے مراقبہ ختم کیا۔ اب آپ پُرسکون تھے چنانچہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد مرشد سرکار نے کچھ نوافل ادا کیے، قرآن پاک کی تلاوت کی، کثرت سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں درود وسلام بھیجا، پھر قصیدہ بردہ شریف کے بعد قصیدہ قادریہ پڑھا اور پلیٹ فارم پر آکر اپنے گرد حصار کھینچا اور ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔

پانی والا ایک برتن منگوایا اور پانی پر دم کر کے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ آپ نے ایک حد بندی بنا دی اور سختی سے ہدایت کی کہ کوئی شخص اس حد بندی سے آگے آنے کی کوشش نہ کرے۔

سب کے دل تجسس اور خوف سے دھڑک رہے تھے۔ مرشد سرکار نے ایک جلالی وظیفہ شروع کر دیا۔ اچانک کربناک گھٹی گھٹی سسکیوں کی آوازیں اُبھرنی شروع ہوگئیں، جیسے کوئی لڑکی شدید اذیت سے کراہ رہی ہو، تڑپ رہی ہو جیسے اس کے گلے پر کوئی آہستہ آہستہ چھری چلا رہا ہو۔ پھر ایک چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ مرشد سرکار نے اُس جانب زور سے پھونک ماری، جدھر سے آواز آرہی تھی تو وہ آوازیں آنی بند ہوگئیں۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد پورے ریلوے اسٹیشن اور پلیٹ فارم کی لائٹیں خود بخود بند ہوگئیں۔ اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں، ایک بھونچال سا آگیا کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی کرخت آوازیں، بادلوں کی شدید گڑگڑ کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں اب ایک خنزیر کی شکل کا بڑا سا جانور جس کے لمبے لمبے سینگ اور انتہائی نوکیلے دانت تھے وہ پرندے کی طرح اُڑتا ہوا آیا اور مرشد سرکار کے اِردگرد چکر کاٹنے لگا۔ اُس کے منہ سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ چونکہ مرشد سرکار حصار میں بیٹھے تھے تو وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

آپ نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور جیسے ہی اپنا ہاتھ نیچے کیا تو وہ پرندہ نما جانور آپ کے سامنے زمین پر گر گیا۔ مرشد سرکار نے اُسے حکم دیا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر اپنی دنیا میں واپس لوٹ جاؤ مگر اُس نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور بولا کہ انسانوں سے اُس نے انتقام لینا ہے، جب مرشد سرکار کے تیسری بار کہنے پر بھی وہ انکاری ہوا تو اُس وقت مرشد سرکار نے پانی والے برتن میں ہاتھ ڈال کر چلّو میں پانی بھرا اور اُس کی طرف پھینک دیا اور جیسے ہی اُس پر پانی کے چھینٹے گرے، اگلے ہی لمحے اُسے آگ لگ گئی اور وہ چیخنے چلانے لگا۔

مرشد سرکار جیسے جیسے اُس پر پانی پھینکتے تو آگ ایسے بھڑکتی جیسے جلتی آگ پر پیٹرول ڈالا جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے چیخنے کی آوازیں بند ہوگئیں اور وہ جل کر بھسم ہوگیا۔ دھوئیں کے کثیف بادل نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور تھوڑی دیر کے بعد دھواں ختم ہونا شروع ہوگیا اور تمام لائٹیں جل گئیں۔

ماحول پر ایک گہرا سکوت اور سکون طاری ہوگیا۔ جب مکمل طور پر دھواں اور بدبو ختم ہوگئی تو مرشد سرکار حصار سے باہر نکلے اور تمام ملازمین کو آواز دے کر بلایا اور اس خطرناک، خوفناک آسیب اور عفریت کے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے کی مبارک باد دی۔ آپ نے فوراً شکرانے کے نوافل ادا کیے، اس طرح وہ رات صبح کے اُجالے میں تبدیل ہوگئی۔ صبح مرشد سرکار نے شہر کی تمام مقتدر سیاسی انتظامی شخصیات کو ریلوے اسٹیشن پر بلوایا اور پلیٹ فارم کی دوسری جانب جہاں جھاڑ جھنکار تھی،

اُس کو ہٹا کر کھدائی کروائی تو وہاں سے ایک انسانی پنجر برآمد ہوا۔

آپ نے مراقبے میں نظر آنے اور علم کی روشنی میں بتایا کہ ریلوے اسٹیشن تعمیر ہونے سے پہلے یہاں مرگھٹ تھا، ایک چمار جنات کو قابو کرنے کے لیے اور پُراسرار طاقتور شکتی حاصل کرنے کے لیے یہاں بیٹھ کر انتہائی غلیظ اور مکروہ جادوئی عمل کرتا تھا۔ اُس نے ایک معصوم کنواری لڑکی کو کہیں سے اغواء کر کے یہاں لا کر پہلے اُسے بے آبرو کیا، پھر اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر چھری سے ذبح کر کے اُس کا خون پیا تاکہ اگلا عمل کر کے وہ طاقتور شکتی حاصل کر سکے۔ مگر اُس کا عمل غلط ہو گیا، جس کے نتیجے میں وہ کہیں غائب ہو گیا اور بھوت پریت بپھر گئے، جس کی وجہ سے ایسے واقعات رونما ہوئے۔ اب اُس چمار کی خبیث اور پلید روح واصل جہنم ہو چکی ہے۔ بھوت پریت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ یہ انسانی پنجر اُسی معصوم لڑکی کا ہے جسے اُس نے ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی تھی۔ وہ بے چاری پتا نہیں کہاں کی رہنے والی تھی مگر اُس کی بہت بے حُرمتی ہوئی تھی۔

پھر اُس پنجر کو غسل دیا گیا، خوشبو لگا کر کفن پہنایا اور مرشد سرکار نے خود اُس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اُسے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

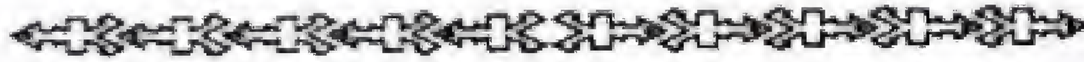
تمام اہلِ علاقہ نے اِس آسیب اور مصیبت سے چھٹکارا دلانے پر مرشد سرکار کا شکریہ ادا کیا۔ اِن تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد وہاں مرشد سرکار نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور دعا کے بعد تمام حاضرین کو نماز پنجگانہ کی تلقین کی اور پھر اپنے آستانے پر واپس تشریف لے گئے۔

چند ماہ کے اندر اندر ایک بہت بڑی، خوبصورت عالی شان مسجد تعمیر ہو گئی۔ شہر کو ضلع کا درجہ مل گیا۔ بہت جلد ترقی کرتا کرتا یہ شہر بہت پھیل گیا۔ انڈسٹریل اسٹیٹ بننے کی وجہ سے لوگوں کو روزگار ملا۔ ریلوے اسٹیشن بھی کافی وسیع اور بڑا کر دیا گیا ہے۔ یہاں مال گاڑیاں بھی آتی جاتی ہیں۔ ملک کے طول و عرض سے دوسری ٹرینوں کی بھی آمد و رفت جاری و ساری ہے اور سکون ہے۔ پھر کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ بھی رونما نہ ہوا ہے۔

☆......☆......☆



ناگن



اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے، جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن۔" آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر:15

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے

ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کران کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔ وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیرلب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ''ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔'' شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔

مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ سامری شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بھی بن چکی تھی۔ شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ شکنتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گرو نرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چمکار سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔ ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران۔ پریہ کو پتا تھا گرو نرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو نرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو نرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کا رحیکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرو نرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرو نرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی

ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی مگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چنکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چنکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوتی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔ شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پا کر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔

دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پر یہ حکمران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز حکمران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بلگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بلگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔ شکنتلا کو چنکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی مگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چنکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں مگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ مگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔ سپیرا کرونڈیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔ دلاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چبوترے پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔ دلاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں سا تھا، وہ دھواں جو کہ حکمران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔ کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادو ٹونے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی بار اس جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں حکمران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ حکمران کوٹھاری کو آزاد کروا دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر مگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔ شکنتلا مگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن مگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ مگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا

ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کر دیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے مکھیا مگن کے پتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔
شکنتلا صحن میں ٹہل رہی تھی۔ صحن کے آگے مندر کی اندرونی عمارت تھی۔ چھوٹے بڑے دروازوں پر سانپوں کی شبیہ نمایاں ہیں۔ بڑے دروازے سے اندر شکنتلا داخل ہوتی ہے۔ بے شمار یاتری ناگ دیوتا کے گرد پوجا پاٹ کرتے نظر آئے۔ اچانک ناگ دیوتا بت کے عقبی دروازے سے ایک پالکی برآمد ہوتی ہے جس پر لکشمن داس براجمان تھا۔ جس کا ناگ مندر بلکہ ناگ بھون میں سکہ چلتا تھا۔ شکنتلا نے دیکھا کہ کامنی اور ایک لڑکے کو زنجیروں میں جکڑ کر ناگ دیوتا کے مجسمے کے عقب سے گھسیٹ کر لایا گیا۔
راجکماری پریہ کو ریاست دھرم پور راجہ کی شادی میں شرکت کا موقع آیا۔ راجہ کا محل دیکھ کر پریہ نے اس سے بڑھ کر خوبصورت محل تعمیر کرنے کا سوچا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اپنی رعایا پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ کر ہر دم کام پر لگا کر آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔
شکنتلا ناگ دیوتا کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میں ناگن دیوی ہوں اور دیوتا کے حکم سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ شکنتلا لکشمن داس کا مکروہ چہرہ یاتریوں کے آگے پیش کرتی ہے جس سے عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑ جاتی ہے پھر شکنتلا کامنی کو مندر کی مہان پجارن بنا دیتی ہے۔
حکمران اور دلاور گہری نیند میں تھے کہ سائیں بابا مرچو کی آمد ہوتی ہے اور وہ دلاور کو آیات قرآنی پڑھنے کی ترغیب دے جاتے ہیں۔ دلاور اُن کے کہنے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا ابلیس کو پوجنے والی قوم کے سردار کی بیٹی کو شیر نے گھیر لیا۔ دلاور نے شیر کو ڈھیر کر کے تمریشیا قبیلے کے سردار کی بیٹی کو بچالیا۔
پریہ شکنتلا کی ذلت سے عذاب کا شکار تھی اور شکنتلا سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے شاہی پروہت سیتارام سے ملاقات کرتی ہے۔ جو اسے شکنتلا کی قید سے رہائی کے عوض شادی کی پیشکش کرتا ہے جو کہ پریہ نے مصلحت جان کر قبول کر لی۔
شکنتلا کو جب پریہ کے فرار ہونے کا پتا چلا تو وہ سامری کے ساتھ پریہ کے تعاقب میں نکلتی ہے۔ سامری اور شکنتلا ایک ہیبت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بستی ہاراکاری کے اسی میدان کی زمین پھاڑ کر نکلنا شروع ہوئے جہاں وحشی دلاور کو سر کاٹنے کے لیے اس جگہ لے جانے کے لیے کھینچ رہے تھے۔ جہاں دوسرے پانچ قیدیوں کے سر کاٹے جا چکے تھے۔
دلاور چٹان کی اوٹ میں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پھر بابا سائیں مرچو نیند سے اسے جگاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کوشاری مر چکا ہے۔ اور تم آزاد ہو اور تم باوضو ہو کر دو نماز پڑھا کرو شکنتلا جب ہوش میں آئی تو اپنے آپ کو ریت کے اندر دھنسے پایا صرف گردن باہر تھی۔ تمریشیا نے اپنے عمل سے اسے زمین سے نکالا۔ دلاور اور شکنتلا کو ایک کوٹھری میں قید کر دیا جاتا ہے۔ دلاور اور شکنتلا کو سانپ بنے دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اتفاق سے شکنتلا اور دلاور بحری جہاز کے سفر میں پھر سے ساتھ موجود ہیں۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

اور جان کی پوری کھلی مردہ آنکھوں میں خوف، دہشت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی شہ رگ ادھڑی تھی۔ پورے جہاز میں شور مچ گیا کہ کسی ڈریکولہ نے اس کا خون پی لیا تھا۔ مسافروں میں سراسیمگی پھیل گئی اور دلاور شکنتلا کو افسوس بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ اور شکنتلا مسکرا کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

ریاست رام گڑھ کا راجکمار ہریتک اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ بھی بحری جہاز میں سفر کر رہا تھا۔ اس کی پتنی اوشا راجکماری ضرور تھی پر اتنی خوبصورت نہ تھی اور قدرے سانولے رنگ کی تھی۔ ایک دن دونوں پتی پتنی عرشے کے ساتھ ساتھ لگی میزوں میں سے ایک میز پر بیٹھے اشیائے خورد و نوش سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ نیلگوں سمندروں کی لہروں کا نظارہ کر رہے تھے کہ شکنتلا جو اکیلی گھومتی رہتی تھی آہستہ آہستہ ان کے پاس آ کر بیٹھنے کی اجازت مانگنے لگی۔ وہ اس وقت امیرانہ روپ اختیار کر کے آئی تھی۔ راجکمار اس کی شخصیت کو دیکھ کر انکار نہ کر سکا حالانکہ وہ عام لوگوں سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتا تھا لیکن شکنتلا کے انداز و اطوار سے سمجھ گیا کہ یہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس نے خوش دلی سے نہ صرف اسے بیٹھنے کو کہا بلکہ کرسی بھی اسے پیش کر دی۔

''آپ دونوں مجھے کسی شاہی خاندان کے فرد لگتے ہیں۔ میرا نام شکنتلا ہے اور میں ایک ریاست تابانہ کی مہارانی ہوں۔'' شکنتلا نے ساری بات ایک ہی سانس میں کہہ دی اور بے تکلفی سے اپنا ہاتھ راجکماری کی طرف بڑھایا۔ راجکماری اوشا جو نئی نویلی دلہن تھی نے شرماتے ہوئے ہاتھ ملایا تو اس کے بعد غیر متوقع طور پر اس نے فوراً ہی راجکمار ہریتک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہریتک نے گڑبڑا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ شکنتلا کی اس حرکت کو راج کماری نے پسند نہیں کیا لیکن خاموش رہی۔

شکنتلا کافی دیران کے پاس بیٹھی بے تکلفی سے باتیں کرتی رہی اور جاتے وقت اس نے اپنے گلے سے بیش وقیمت ہیروں کی مالا اتار کر راج کماری کے گلے میں ڈال دی اور ہولے سے راجکماری کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''یہ میری طرف سے تمہارے لیے شادی کا تحفہ ہے۔'' یہ کہہ کر شکنتلا چلی گئی لیکن راج کمار ہریتک اس کے حسن و جمال کو نہ بھلا پایا۔ اس کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اپنی پتنی اسے شکنتلا کے مقابلے میں نہایت بدصورت لگنے لگی۔ رات گئے جب اس کی بے چینی کم نہ ہوئی تو وہ راجکماری کے سوتے ہی شکنتلا کی تلاش میں کمرے سے باہر نکلنے لگا۔ جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر دیکھا تو اسے دور سے شکنتلا خراماں خراماں آتی ہوئی نظر آئی۔ ہریتک نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا تو شکنتلا بال جھٹک کر مسکرانے لگی۔ مسکراتے ہوئے اس کی گالوں پر بھنور پڑ گئے۔ تو راج کمار کا دل چاہنے لگا کہ اسے دبوچ لے۔ راہداری بالکل ویران تھی۔ لہٰذا شکنتلا نے اس کو قابو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تو اس وقت نکلی ہی شکار کی تلاش میں تھی۔ اس نے قریب آتے ہی بازو کھول دیے۔ ہریتک اس کی بے باکی پر پریشان ہو گیا اور گردن موڑ کر اندر اپنی بیوی کو دیکھنے لگا لیکن وہ بے سدھ سوئی پڑی تھی۔

''ہری تک......'' شکنتلا اس کا چہرہ ہاتھوں میں پکڑ کر اپنی گرم اور خوشبودار سانسیں اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے خماری سے بولی۔

''تمہارا خوبصورت خیال مجھے چین سے سونے نہیں دے رہا تھا۔ میں تو ایک ایک کوٹھری میں تمہیں تلاش کر رہی تھی۔''

''مم......میں بھی......آپ کی یاد میں بے کل ہوں۔ شکنتلا جی۔''

اب دونوں علیحدہ ہو کر کمرے میں آ گئے تو ہریتک بے بسی سے اپنی پتنی کو دیکھنے لگا جو بستر پر آڑی ترچھی معصومیت سے سوئی ہوئی تھی۔

''اس کا بندوبست بھی ہے میرے پاس۔'' شکنتلا معنی خیز انداز میں مخاطب ہوئی؟

''کیا؟'' ہریتک غیر یقینی انداز میں بولا۔

''تم ذرا کمرے سے باہر جاؤ۔ مجھے شرم آتی ہے۔'' شکنتلا لجا کر بولی تو ہریتک حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس چیز سے شرما رہی ہے۔ لیکن شکنتلا نے اسے سوچنے کا موقع نہ دیا اور ہریتک جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا شکنتلا نے پھرتی سے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی اور پھرتی سے سانپ کے روپ میں آ کر راج کماری کے پیٹ پر ہلکا سا ڈسا تو وہ جھٹکا لے کر بے ہوش ہو گئی۔

ہریتک نے اندر آ کر اپنی بیوی کو ہلایا جلایا لیکن وہ اب ہوش میں کہاں تھی۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ شکنتلا نے کیا جادو کیا ہے کہ لمحوں میں اثر کر گیا۔ لیکن شکنتلا اسے سوچنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھی اور نہ ہی یہ موقع اس نے دیا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح جہاز میں دو خون سے نچڑی اور گلا کٹی لاشیں ملیں تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔

ہر شخص دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ کپتان نے حفاظتی سپاہیوں کے دستے کو رات بھر نگرانی کا حکم دے دیا۔ کمرے کی اور ہر شخص کی تلاشی لی گئی۔ دوران تلاشی شکنتلا عام سے کپڑوں میں ڈری ڈری سہمی یوں کھڑی ہو گئی جیسے اس سے زیادہ کوئی شریف ہی نہ ہو۔

چند دن اور گزر گئے۔ اب شکنتلا کے لیے شکار حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔ ہر شخص محتاط اور اجنبیوں سے گفتگو سے پرہیز کرنے لگا۔ سرِ شام ہی عرشے پر سناٹا چھا جاتا۔ لوگ اپنے اپنے کیبنوں میں دبک کر دروازے سختی سے بند کر لیتے۔

کچھ دن تو شکنتلا صبر کرتی رہی تھی اسے لعنت وملامت کرتا رہا۔ لیکن شکنتلا اپنی جبلت کے ہاتھوں بے بس تھی۔ آج اس نے نیا شکار پھانسنے کا تہیہ کر لیا اور سہ پہر ہوتے ہی شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔

اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور خنک لیکن خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ عرشے پر لوگ کرسیاں ڈالے اور بعض کپڑے بچھا کر لیٹے کھانے اور قہوے سے دل بہلا رہے تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں بھی تھیں۔ یہ جہاز افریقہ کی طرف محوِ سفر تھا۔ جہاز کا کپتان جو کوئی گورا معلوم ہوتا تھا۔ دوربین آنکھوں سے لگائے ہوئے وہ سمندر کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

سمندر بظاہر حلیم مزاج نظر آ رہا تھا۔ لیکن کپتان کے چہرے پر قدرے بے چینی تھی۔ شکنتلا بھی ایک کرسی پر بیٹھی شراب سے دل بہلا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر جادو یہاں اپنا کام دکھا سکتا تو سارے جہاز کے مسافروں کو بے بس کر کے پورے سفر کو خوشگوار بناتی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ صرف سانپ بن سکتی ہے اور اگر اس کی اصلیت کا پتا اور لوگوں کو چل جاتا تو پھر جان بچانی مشکل ہو جاتی۔ لہٰذا وہ کن انکھیوں سے سب لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ دلاور بھی اس سے کچھ فاصلے پر اکیلا ہی بیٹھا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شکنتلا آج پھر کسی کو پھانسے گی لیکن آج دلاور نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ کسی بے گناہ کو شکنتلا کی خوراک نہ بننے دے گا۔ چاہے اس کی جان ہی خطرے میں کیوں نہ پڑ جائے۔

اب شکنتلا کی نظر ایک سولہ سترہ سالہ نوجوان پر ٹھہر گئی، جو اکیلا ایک، مستول کے سہارے کھڑا لہروں پر نگاہیں جمائے تھا۔ اب شکنتلا انتظار کرنے لگی کہ شام ذرا گہری ہو یا کپتان یہاں سے ہٹ جائے کیوں کہ وہ عقابی نظروں سے سب کا جائزہ لے رہا تھا۔ شکنتلا کو کئی بار اچٹتی نگاہ سے دیکھ چکا تھا۔

شکنتلا مناسب وقت کا انتظار کرنے لگی کہ اسے تیز ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو بادل گھرے ہو چکے تھے۔ جیسے برسنے ہی والے ہوں۔ شکنتلا نے ایک بار پھر اس نوجون کی طرف دیکھا تو اسے اپنی جانب محویت سے دیکھتے پایا تو خفیف انداز میں مسکرائی نوجوانی بھی مسکرا دیا۔ شکنتلا نے غیر محسوس انداز میں اسے اپنی میز پر آنے کی دعوت دی جو اس نے گردن کے انتہائی خم سے قبول کرنے کا اعلان کیا اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے شکنتلا کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی اثنا میں تیز ہوا کا ایک اور جھونکا آیا تو جہاز کے بادبان پھڑ پھڑانے لگے اور ساتھ ہی ٹپ ٹپ بارش شروع ہو گئی۔ بارش کے قطرے موٹے موٹے تھے۔ تمام لوگ کھلی جگہ سے اٹھ کر سائبان کی تلاش میں جانے لگے۔ شکنتلا اسی اثنا میں نوجوان کے قریب جا کر اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''آئیں میرے ساتھ......'' نوجوان اس رومان پرور موسم میں شاید کسی حسین ساتھی کا متلاشی تھا۔ دونوں عرشے سے نیچے جانے والے راستے کی سیڑھیاں اترنے لگے۔

دلاور بھی ان کے پیچھے لپکا۔ کافی لوگ نیچے جا رہے تھے۔ اس لیے دلاور پیچھے رہ گیا۔ ادھر وہ نوجوان شکنتلا کو کمرے میں لے گیا لیکن جیسے ہی وہ کمرے میں پہنچا تو چیخ مار کر اس نے شکنتلا کی کمر سے ہاتھ نکال کر پیچھے ہٹایا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی شکنتلا کو دیکھنے لگا اور کبھی دیوار کی طرف۔

شکنتلا اس بدلے ہوئے رویے سے حیران ہو گئی اور پھر پھرتی سے پلٹ کر اس نے نوجوان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیوار کی طرف دیکھا تو سارا معاملہ سمجھ گئی۔

دیوار پر ایک قد آدم شیشہ نصب تھا۔ جس میں شکنتلا نے نوجوان کے پاس ایک ناگن کو اصلی روپ میں کھڑے پایا۔ اس نے پلٹ کر نوجوان کو دیکھا تو وہ اس دروازے سے نکل کر راہداری میں بھاگتا نظر آیا۔ شکنتلا نے ایک لمحے میں سوچا کہ اگر اس نوجوان نے بھانڈا پھوڑ دیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ اس کو ختم کر دینا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی اس نے زقند

بھری اور ہرنی کی مانند چوکڑیاں بھرتی ہوئی نوجوان کے پیچھے لپکی جو بھیڑ میں تیزی سے جگہ بناتا ہوا اور سانپ سانپ شور مچاتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ شکنتلا نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس کو زندہ نہیں چھوڑنا۔

ادھر دلاور نے بھی شکنتلا کو نوجوان کے تعاقب میں دیکھ لیا تھا۔ وہ شکنتلا کو روکنے کی غرض سے اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن شکنتلا اور دلاور جیسے ہی دوڑتے دوڑتے کھلے آسمان تلے آئے تو انہیں شدید طوفانی بارش سے واسطہ پڑا۔

آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور شدید ترین بارش ہو رہی تھی اور تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے عملے کے لوگ بادبان لپیٹنے میں مصروف تھے۔ لنگر سمندر میں ڈالنے کی جدوجہد جاری تھی۔ دیوہیکل لہریں آ کر جہاز سے ٹکراتیں تو پورا جہاز ڈول کر رہ جاتا شکنتلا اس نوجوان کو بھول کر خوفزدہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی جہاں سیاہ بادل تیزی سے نقل وحرکت میں مصروف تھے۔ ہوا کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ چنگھاڑتی موجیں جہاز کی دیواروں سے اندھوں کی طرح ٹکریں مارنے میں مصروف تھیں۔۔ لنگر پھینک کر کپتان جہاز روکنے کی کوشش میں تھا لیکن طوفانی ہوائیں اس کام میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ نتیجے کے طور پر جہاز کھلے سمندر میں کٹی پتنگ کی طرح ڈولنے لگا۔ بادبان لپیٹے جا چکے تھے۔ تمام مسافر سراسیمگی کے عالم میں آ چکے تھے۔

جہاز...... سمندری لہروں کے رحم وکرم پر ڈانوا ڈول ہونے لگا۔ ملاح کپتان کی ہدایت پر عرشے پر دوڑ دھوپ میں مصروف تھے۔ شام کی سیاہی بھی تیزی سے پادل کھولنے لگی تھی طوفانی بارش کے ساتھ بجلی کی خوفناک کڑک دلوں کو دہلانے لگی۔ مہیب اندھیرے میں بجلی کوندتی تو سمندر کی لہریں اژدھوں کی مانند جہاز کو دیوانہ وار گھیرے میں لیے ہوئے نظر آتیں۔

دلاور اور شکنتلا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک کونے میں لگے کھڑے تھے۔ جہاں سے وسیع سمندر صاف نظر آ رہا تھا۔ کپتان چیخ چیخ کر مسافروں کو اپنے ٹھکانوں میں جانے کا کہہ رہا تھا مگر خوف کے مارے کوئی مسافر نیچے جانے کو رضامند نہ تھا۔ سب دعائیں کرنے میں مصروف تھے۔ بحری جہاز ایک ہی جگہ لنگر انداز لہروں سے ڈول رہا تھا اور کبھی دائیں جھکتا اور کبھی بائیں۔ ایک دفعہ جیسے ہی جہاز دائیں جانب ڈولا تو پانی کی ایک اونچی لہر آئی اور منوں کے حساب سے پانی جہاز کے عرشے پر آ گرا۔ مسافروں کی گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔ اب کپتان کے چہرے پر بھی پریشانی کی سلوٹیں گہری ہونے لگیں۔ اسی اثناء میں پانی کی ایک اور بلند لہر چھپاک سے عرشے پر گری تو سیکڑوں مسافر بھاگ کر ایک کونے میں ہو گئے۔

اچانک تہہ خانے سے جہاں جہاز کی مشینری ہوتی ہے ایک مکینک پریشانی کے عالم میں دوڑتا ہوا آیا اور بلند آواز سے کپتان کو بتانے لگا کہ زیر آب کوئی نوکیلی چیز چٹان سے ٹکرانے سے جہاز کے پیندے میں چھوٹا سا شگاف پڑ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے پانی تھوڑا تھوڑا کر کے تہہ خانے میں جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔'' اس کی بات سن کر کپتان دوڑتا ہوا اس کے ساتھ نیچے چلا گیا۔ اب دلاور بھی خوف محسوس کر رہا تھا۔ کیوں کہ جہاز ڈگمگانے لگا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کپتان نہایت پریشانی کے عالم میں عرشے پر آ گیا۔ جہاز سمندر کی ایک جگہ پر روک دیا گیا تھا۔ لنگر ڈالے جا چکے تھے۔ ادھر طوفان کی شدت میں اور تیزی آ گئی تھی اور پورے عرشے پر افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا تھا پانی کی اونچی لہریں عرشے پر گرنے سے پھسلن پیدا ہو گئی اور لوگ گرنے لگے۔ ان کے کپڑے بھیگے جا چکے تھے۔

اور پھر جانے کیا ہوا کہ پورے جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا اس کی پچھلی سمت دائیں طرف تیزی سے مڑنے لگی اور پورا بحری جہاز گھوم کر اپنی سمت تبدیل کر گیا۔ زوردار جھٹکے سے کئی مستول اور بادبان نیچے گر گئے۔ مسافر اور عملے کے آدمی بری طرح ایک دوسرے پر آ پڑے اور کئی لوگ شدید زخمی ہو کر چیخ پکار کرنے لگے۔

کپتان نے تھوڑی دیر بعد لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر دیا کہ جہاز ایک بھنور کے بالکل قریب ہے لہٰذا سخت طوفان کے باوجود لنگر اٹھائے جا رہے ہیں تاکہ بھنور سے کچھ دور ہوا جا سکے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جہاز میں افراتفری پھیل گئی۔ عورتیں اور بچے چلانے لگے جبکہ مردوں کی پیشانیوں پر بھی پریشانیوں کے سائے گہرے ہونے لگے۔ دلوں کی دھڑکن

بڑھنے لگی۔

طوفان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس طوفانی کے عالم میں سب لنگر اٹھا دیے گئے۔ بادبان کھول دیے گئے جو کہ ہوا کی شدت سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ غلاموں کی طویل قطاریں چپو چلانے لگیں۔ محافظ دھڑا دھڑ ان کی عریاں پشتوں پر کوڑے مارنے لگے۔ جہاز رینگنے لگا اور بھنور سے آہستہ آہستہ دور ہونے کی سعی شروع ہوگئی۔ لیکن اجل شاید جہاز پر نگاہیں جما چکی تھی۔ بادبان، چنگھاڑتی ہوئی ہواؤں کا دباؤ برداشت نہ کر سکے اور چرچراتے ہوئے پھٹنے لگے۔ اسی اثناء میں پانی کی کئی اونچی اونچی لہریں جہاز کی فولادی دیواروں کے ساتھ سر پٹخنے لگیں۔ ادھر پیندے کا سوراخ بند نہ ہو رہا تھا اور پانی رس رس کر اندر آ رہا تھا۔ شکنتلا بھی دہشت زدہ ہو چکی تھی۔ اسے اور دلاور کو سمندری سفر کا پہلا تجربہ ہی بھیانک محسوس ہو رہا تھا۔ شکنتلا سوچ میں تھی۔ وہ سوائے سانپ کے کوئی دوسرا روپ اختیار نہیں کر سکتی۔ سانپ کے روپ میں وہ کسی بھی بڑی مچھلی کا شکار ہو سکتی ہے۔

جہاز بھنور سے کچھ دور آ گیا۔ لیکن اب حالات دگرگوں ہونے لگے تھے۔ لہٰذا کپتان نے امدادی کشتیاں سمندر میں اتارنے کا عندیہ دے دیا۔ کیوں کہ جہاز میں پانی جمع ہو چکا تھا۔ بادبان پھٹ چکے تھے اور جہاز شتر بے مہار ہو چکا تھا۔ اب اس کی تباہی یقینی تھی۔ کیوں کہ طوفان تھمنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آسمان پر کالے بادل گڑگڑاتے پھر رہے تھے۔ ہر طرف دور تک اندھیرے کا راج تھا۔ پانی کی وسیع دنیا میں بے یار و مددگار، بحری جہاز کا عملہ زندگیاں بچانے کے لیے برسر پیکار تھا۔ شدید طوفان کے باعث روشنیوں کا نظام بے کار ہو چکا تھا۔ جہاز تھرتھرانے کے ساتھ بری طرح ڈول رہا تھا۔ تہہ خانے پانی سے بھر چکے تھے۔ کپتان نے بھانپ لیا کہ اب کسی بھی وقت اسے لہریں الٹ دیں گی یا جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لہٰذا کپتان کے حکم پر امدادی کشتیاں سمندر میں اتاری جانے لگی۔ ہر کشتی میں کھانے کا تھوڑا سا سامان اور پینے کے صاف پانی کی معمولی مقدار بھی رکھی جا رہی تھی۔ ہر مسافر زیر لب دعائیں کر رہا تھا۔

اسی افراتفری اور ہڑبونگ میں دلاور اور شکنتلا بھی ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتیاں دھڑا دھڑ سمندر میں اتار کر ان میں مسافر ٹھونسے جا رہے تھے۔ جس کشتی میں دلاور اور شکنتلا سوار تھے اس میں اور بھی بے شمار لوگ تھے لیکن گھپ اندھیرے میں کسی کو کسی کی فکر نہیں تھی۔ اس افراتفری میں دلاور با آسانی شکنتلا سے جدا ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ شکنتلا کا جسم مسلسل خوف سے کانپ رہا ہے۔ اس نے ایسی حالت میں اسے تنہا چھوڑنا مناسب نہ جانا اور انسانی ہمدردی کے تحت اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔ وہ شکنتلا کی سرشت سے مکمل واقف نہ تھا۔

ان کی کشتی اب جہاز سے کافی دور ہو چکی تھی۔ سمندر اپنی جولانیوں پر تھا۔ تاہم بارش تھم چکی تھی اور چاند بادلوں سے جھانک کر سمندر کے سینے پر بپا حشر کے اس میدان کا نظارہ کر رہا تھا جہاں بے شمار انسان لقمہ اجل بن رہے تھے۔ کشتیوں میں جگہ حاصل کرنے کے خواہش مند عجلت میں اوپر سے ہی چھلانگ لگا دیتے۔

اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی اور شکنتلا سمیت کشتی کے تمام مسافروں نے دیکھا کہ جہاز سمندر میں ایک جانب لڑھک رہا ہے۔ انسانوں کی ڈوبتی ابھرتی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ سب کے چہروں پر مایوسی اور خوف نے ڈیرے جما لیے۔ کشتی سمندر کی دیوہیکل موجوں پر ڈول رہی تھی۔ تھکے ہوئے لوگ نیند کی وادی میں اترنے لگے۔ سردی سے سب لوگ سکڑنے لگے۔

☆......☆......☆

سورج کی تیز روشنی سے جب دلاور کی آنکھ کھلی تو چند لمحے کے بعد اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا شکنتلا اس کے کندھے سے لگ کر سو رہی تھی۔ ہر طرف تیز چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ کشتی سمندر کی گود میں ہچکولے لیتی ہوئی نامعلوم سمت کی طرف رواں دواں تھی یا وہیں چکر کاٹ رہی تھی کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ بیدار ہو رہے تھے کچھ پہلے ہی جاگ رہے تھے چاروں طرف حد نگاہ نیلے پانی کی حکومت تھی۔ جہاز اور دیگر کشتیوں کا نشان تک نہ تھا۔ کشتی میں موجود افراد کی تعداد پچاس کے قریب تھی اور ان میں اکثریت ہندوستانیوں کی تھی۔ سب لوگ ایک

دوسرے میں پیوست تھے۔ جبکہ ایک طرف پانچ ہٹے کٹے افریقی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اور کھانے کا سامان اور پانی ان کے درمیان میں پڑا تھا۔ یہ شکل سے ہی بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ دلاور بھانپ گیا کہ ان کی نیت درست نہیں اور کھانے پینے کا سامان یہ کسی اور کو دینے کے ارادے میں نہیں ہیں۔ ایک بچہ ریں ریں کر کے رونے لگا۔ اس کی ماں نے ان تینوں سے کھانے کا کچھ سامان مانگا تو تینوں حبشیوں نے بری طرح اس کو دھتکار دیا۔۔ وہ عورت سہم گئی تو اس کا خاوند آگے بڑھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس سے قبل کوئی کچھ سمجھتا تینوں حبشیوں نے مل کر اس شخص کو اٹھایا اور چشم زدن میں سمندر میں پھینک دیا۔ ایک دم سناٹا چھا گیا۔ دو تین ڈبکیوں کے بعد وہ شخص پانی کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔ چند لمحے قیامت خیز خاموشی کے گزر گئے۔ اگلے ہی لمحے وہ عورت ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ کشتی کے باقی سوار بھی حیرانی سے باہر آ گئے لیکن ڈوبنے والا ڈوب چکا تھا۔ اب تینوں بدمعاشوں میں سے ایک کھڑا ہو گیا اور چمکتے پھل کا خنجر ہاتھ میں تولتے ہوئے بولا۔

"کھانے پینے کا سامان صرف ہمارا ہے۔ اگر کسی کو اپنے بازوؤں پر اعتماد ہے تو کھڑا ہو جائے یا پھر خشکی نظر آنے کے معجزے کا انتظار کرے۔"

ان کے جارحانہ عزائم دیکھ کر کسی مسافر کو مقابلہ میں آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دلاور بھی نیم وا آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ لیکن ان کا اتحاد دیکھ کر عقلمندی کے تقاضے پر بیٹھا سب کو باری باری دیکھنے لگا۔ کوئی بھی ان ہٹے کٹے بدمعاشوں سے ٹکر لینے کو تیار نہ تھا۔

سورج اب سر پر چمک رہا تھا۔ بھوک اور پیاس اپنا رنگ دکھانے لگی۔ ماؤں کی گودوں میں بچے رونے لگے۔ بھوک اور پیاس سے تڑپنے لگے۔ مائیں انہیں تھپکیاں اور ان کو بددعائیں دینے لگیں۔ لیکن توے کی مانند سیاہ حبشی شاید پتھر دل رکھتے تھے۔ وہ کسی کو پانی کا قطرہ یا خوراک کا ذرہ دینے پر آمادہ نہ تھے۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا گیا بچوں کے بلکنے کی کی آوازیں بڑھتی گئیں۔ کئی بار لوگوں نے حبشیوں سے احتجاج کیا۔ کئی ایک نے معمولی بحث بھی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے الٹا کئی ایک کو کے بھی جڑ دیے۔ اسی جاں بلب عالم میں سورج ڈھلنے لگا اور پھر رات پڑ گئی۔ سب بچوں کی حالت بگڑنے لگی۔ ان کے ساتھ مائیں بھی رونے لگیں۔ لیکن ٹھنڈی ہوا کی تھپکیوں نے سب کو نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ رات گہری ہو گئی۔ دلاور شاید اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور حبشیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جن میں ایک اونگھتے ہوئے، سامان پر پہرہ دے رہا تھا۔ دلاور جب اس کے سر پہنچ گیا تو وہ تھوڑا سا چوکنا ہوا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ دلاور نے خاموشی لیکن پھرتی سے اُسے اٹھایا اور غڑاپ سے سمندر میں پھینک دیا اور پھرتی سے پھر دوسرے حبشی کو اٹھالیا۔ اس سے قبل اس کی آنکھ صحیح طریقے سے کھلتی اسے اپنے قوی بازوؤں پر اٹھا کر ہوا میں بلند کیا اور جھٹکے سے سمندر میں پھینک دیا۔ اب حبشی اور باقی مسافر شور و غل سن کر آنکھیں کھول چکے تھے۔ باقی تینوں افریقی سرعت کے ساتھ صورت حال کو سمجھتے ہی دلاور پر پل پڑے لیکن اب وہ کم ہو چکے تھے۔ جبکہ دلاور تو پوری طرح تیار تھا۔ اس نے ان کے اٹھنے سے پہلے ہی ایک طرف پڑا ہوا خنجر اٹھایا اور پوری قوت سے ایک افریقی جو اس کے قریب آ چکا تھا کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ افریقی حبشی کی چیخوں سے سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ زخم خوردہ حبشی تڑپنے لگا۔ جبکہ دلاور اور دونوں حبشیوں سے نبرد آزما تھا۔ دونوں اس سے لپٹے ہوئے تھے۔

"ارے نادانو! پکڑ لو ان کو جو تمہارے بچوں کی خوراک پر سانپ بنے ہوئے ہیں۔" شکنتلا جو جاگ رہی تھی تمام مسافروں کو متوجہ کر کے چلائی۔ تو کئی نوجوان دلاور کی قوت اور جرات پر حیران ہو رہے تھے۔" اٹھ کھڑے ہوئے اور بقیا حبشیوں پر پل پڑے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ان کو بے بس کر دیا گیا۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں کسی نہ کسی طریقے سے باندھ دیے گئے۔

اب دلاور نے چند بڑوں کی مدد سے خوراک کا حساب لگانا شروع کیا اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں خوراک اور پانی گھونٹوں کے حساب میں بانٹ دیا گیا۔ اور سب کی جان میں جان آئی۔ سب لوگ دلاور کی بہادری کی داد دے رہے

تھے۔

''لیکن بھائیو......'' دلاور سب سے اونچی آواز میں مخاطب ہوا۔ ''یہ تو مصیبت کے اندر ایک مصیبت تھی جس سے ہمیں چھٹکارا مل گیا۔ لیکن اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارے پاس پانی اور خوراک بہت کم ہے جبکہ خشکی کا دور دور تک نشان نہیں۔ ہمیں افہام وتفہیم سے رہنا ہے۔ صبر سے کام لینا ہوگا۔''

اسی طرح باتیں کرتے کرتے پھر رات ہوگئی۔ سورج مغرب کی طرف سمندر میں ڈوب گیا۔ اور اندھیرا چھا گیا۔ تارے چمکنے لگے جبکہ بادبانی کشتی ہوا کے زور پر انجانی راہوں کی طرف گامزن تھی اب پتا نہیں کہاں جا رہی تھی یا وہیں دائرے میں گھوم رہی تھی۔ شکنتلا دلاور کے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ دلاور سوچوں میں گم تھا۔

''دلاور کیا سوچ رہے ہو؟'' شکنتلا نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں کہ......'' دلاور نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ 'خشکی نہ نظر آنے سے پہلے کیوں نہ تجھے سمندر میں اٹھا کر پھینک دوں تاکہ تجھ سے بھی میری جان چھوٹ جائے۔ کیوں کہ خشکی میں آ کر تیرا جادو پھر لوٹ آئے گا اور میں تیرے رحم وکرم پر رہ جاؤں گا۔'' دلاور کی بات سن کر شکنتلا کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔

''زیادہ سے زیادہ تم سانپ بن سکو گی...... لیکن نہ ختم ہونے والے سمندر میں ہزاروں کی تعداد میں موجود سمندری مخلوق میں کسی نہ کسی کی خوراک بن جاؤ گی اور دنیا تیرے وجود سے پاک ہوجائے گی۔''

''نن...... نہیں۔'' شکنتلا کے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی۔ ''تت...... تم ایسا نہیں کرو گے دلاور......'' شکنتلا کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ دلاور ایسا کرسکتا ہے۔

''لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا...... میں تمہاری طرح سنگدل اور کٹھور نہیں کہ تمہیں مجبوری اور لاچاری کی حالت میں ماروں۔ لیکن تالی ایک ہاتھ سے نہیں بج سکتی شکنتلا...... اس کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی اچھی دوست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کہ جیسے بھی حالات ہوں ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور مشکلات کے بھنور سے اگر اللہ کی مرضی سے نکل گئے تو تم میرا راستہ نہیں روکو گی۔''

''مم...... میں سوگند کھاتی ہوں کالی دیوی کی کہ...... تمہاری دوست رہوں گی۔'' شکنتلا نے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا تو دلاور مسکرایا۔

''وہ دیکھو کوئی جہاز ہماری کشتی کی طرف آرہا ہے۔'' ایک شخص کی آواز آئی۔

دلاور اور شکنتلا سمیت سب لوگ آنکھیں سکیڑ کر اس سمت دیکھنے لگے۔ واقعی ایک چھوٹا لیکن تیز بادبانی جہاز ان کی کشتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب لوگ غیب سے ملنے والی اس امداد کو دیکھ کر خوش ہوگئے۔ اور اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ہاتھ اور کپڑے ہلا ہلا کر جہاز والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔

جہاز کا کپتان شاید پہلے ہی اس کشتی کو دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا تھوڑی ہی دیر میں جہاز کشتی کے قریب آگیا۔ تو دلاور اس کے اونچے مستول پر لہراتے سرخ جھنڈے کو حیرانی سے دیکھنے لگا...... جس پر کالے رنگ میں انسانی کھوپڑی کا نشان بنا ہوا تھا۔

''بحری قزاق......'' اچانک کسی شخص کے منہ سے نکلا اور تمام مسافر آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ''یہ تو سمندری ڈاکو ہیں۔ جو جہازوں اور مسافر کشتیوں کا مال واسباب لوٹ لیتے ہیں اتنی دیر میں بحری قزاقوں کا چھوٹا سا جہاز کشتی کے قریب آگیا۔ اور پھر ڈاکوؤں نے رسیوں سے بنی ہوئی مضبوط جال جیسی سیڑھی کشتی میں پھینکی جس کے نیچے لوہے کے کنڈے لگے ہوئے تھے۔ جو کشتی کے پھٹوں میں تو ڈاکوؤں نے رسی والی سیڑھی کو کھینچا تو کشتی ہولے جہاز کے ساتھ جا لگی...... اب تین چار ڈاکو رسی کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے دھپ سے کشتی میں آگرے۔ اور سب کو رسی کی سیڑھی کے ذریعے بحری جہاز میں پہنچ جانے کا حکم دیا تو تمام مسافر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن ڈاکو نے پھر سب کو اٹھنے کا اشارہ کیا تو چند عقلمند خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ باقیوں کی کوڑوں سے تواضع ہونے لگی۔ دھکم پیل شروع ہوگئی۔ رسیوں

کی سیڑھیوں سے چڑھنا آسان نہ تھا نتیجتاً کئی لوگ سیڑھی سے سمندر میں گرنے لگے۔ لیکن انہیں بچانے کے لیے کوئی آگے نہ بڑھا۔ کئی عورتوں سے بچے چھوٹ گئے اور وہ چیخنے چلانے لگیں لیکن رکنے کسی کو نہ دیا گیا۔ شگفتلا اور دلاور شروع میں ہی چپ چاپ رسیوں کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے جہاز کے عرشے پر آ اترے اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ شگفتلا جو عام لباس میں تھی لیکن اس کا قیامت خیز سراپا قزاقوں کے سردار سے چھپ نہ سکا جو عرشے پر ہی کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شگفتلا کا ہاتھ تھاما اور بھیڑ سے نکال کر ایک طرف کھڑا کر دیا اور گہری نظروں سے شگفتلا کے دلکش سراپے کو ناپنے لگا۔ ادھر شگفتلا بھی پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے ہاتھ کو لبوں پر رکھ کر سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہوگئی کیوں کہ وہ یہی چاہتی تھی کہ اسے ایک عام ڈاکو کہ بجائے سردار کے حوالے کیا جائے۔ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو گئی۔ جب سردار نے اسے ایک طرف کر کے دوسروں کو بتا دیا کہ یہ میرے لیے ہے۔

دلاور جیسے ہی عرشے پر چھلانگ لگا کر اترا تو پہلے سے تیار ڈاکوؤں نے دوسرے مردوں کی طرح اسے بھی گردن سے دبوچا اور بلا تاخیر اس کے ہاتھ پاؤں ریشمی ڈوری سے کس کر باندھ دیے اور بے جان وزن کی طرح دھڑام سے ایک طرف پھینک دیا۔ یہی سلوک کشتی کے تمام مسافروں کے ساتھ ہوا۔ البتہ تمام عورتوں کو ایک طرف کر دیا گیا۔ مردوں سے فارغ ہو کر ڈاکو عورتوں کی طرف آئے جس کے ہاتھوں میں بچے تھے۔ بچے چھین لیے گئے۔ عورتوں میں سے بڑی عمر والی بوڑھیوں کو بھی مردوں کی طرح باندھ کر ایک طرف کر دیا اور تمام جوان عورتیں اور لڑکیاں ڈاکوؤں نے آپس میں بانٹ لیں۔ یہ سارا کام دیکھتے ہی دیکھتے انجام پا گیا اور ڈاکو اپنے حصے کی عورتیں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر مختلف سمت میں چل دیے۔ لڑکیاں رونے چیخنے لگی۔ ماؤں سے الگ ہونے والے جگر کے گوشے الگ رو رہے تھے۔ بڑی بوڑھیاں دھائیاں اور بددعائیں دینے لگیں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں عرشہ ویران ہو گیا۔ اب وہاں بندھی ہوئی بوڑھی عورتوں اور مردوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

شگفتلا کو بھی ایک خوبصورت کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ ڈاکوؤں کا سردار فرش پر بچھے بستر پر بیٹھا شراب سے دل بہلا اور غور سے شگفتلا کو دیکھ رہا تھا۔ شگفتلا سردار کے قریب ہی بیٹھی اسے تکے جا رہی تھی تو وہ خود بھی یہی کچھ چاہتی تھی اور تمام مراحل اس کی مرضی کے مطابق طے ہونے شروع ہو گئے۔

☆......☆......☆

اگلے دن ڈاکوؤں کا جہاز ایک جزیرے کی ویران ساحل سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تمام قیدیوں کو چھوٹی کشتیوں کے ذریعے ساحل تک لایا گیا تھا۔ ساحل پر کچھ لوگ پہلے سے ہی قیدیوں کو وصول کرنے کے لیے ہر قسم کے اسلحہ سے لیس موجود تھے۔ لہٰذا ریتیلے ساحل پر قدم رکھتے ہی تمام قیدیوں کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹیاں کس کر باندھ دی گئیں۔ ہاتھ پہلے ہی بندھے تھے۔ تمام قیدی جن میں عورتیں بھی شامل تھیں سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ سب کو ایک قطار میں درختوں کی پتلی ٹہنیاں مار مار کر چلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان میں دلاور بھی شامل تھا تاہم شگفتلا کو نہ باندھا گیا۔ وہ سردار کے پہلو سے لگی چل رہی تھی۔ شاید رات ہی رات اس نے سردار پر اپنی خوبصورت اداؤں کا جادو چلا دیا تھا۔ ایک گھنے جنگل اور کانٹوں بھری نوکیلے پتھروں پر مشتمل مسافت کے بعد سب لوگ ایک سرخ پتھروں سے بنی چار دیواری کے اندر پہنچ گئے۔ جہاں درختوں کی موٹی ٹہنوں اور چھالوں سے بنے پنجرے موجود تھے۔

سب قیدیوں کے ہاتھ کھول کر پنجروں میں دھکیل دیا گیا۔ دلاور نے دیکھا کہ یہ ایک قدیمی طرز کا قید خانہ ہے۔ درجنوں کے حساب سے لکڑیوں کے بنے ہوئے جنگلی طرز کے پنجرے موجود ہیں۔ جن میں بے شمار خستہ حال قیدی موجود ہیں۔ ان میں سے بعض قدرے صاف ستھرے اور بعض تو ایسے برا حال میں کہ داڑھیاں، مونچھیں اور سر کے بال جھاڑ جھنکار کی طرح ہو چکے تھے۔ سب کی ستر پوشی درختوں کے پتوں سے تھی۔ کمزور چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ لوگ سالوں سے یہاں پنجروں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں کا موسم شدید گرم تھا۔ حالانکہ بے شمار درخت تھے۔ دلاور کو بھی پنجرے میں ایک زوردار چھڑی مار کر گھس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور دلاور لمبی آہ بھر کر قسمت

پرشاکر ہو کر پنجرے میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ نیچے بھربھری مٹی تھی جو مٹی کم اور چولہے کی راکھ زیادہ دکھائی دیتی تھی۔
پنجروں میں بیس کے قریب مرد اور عورتیں پہلے سے بھی تھیں اور دلاور کے ساتھ ہی درجن بھر اور قیدی پنجروں میں مقید ہو چکے تھے۔ اب مٹی سے اٹے گرم میدان میں کالی سیاہ شکلوں والے پہرے دار ہی رہ گئے تھے جو چہروں سے ہی ظالم اور بے رحم نظر آتے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں پتلی چھڑی اور کمر پر کمان لٹک رہی تھی ساتھ ہی درختوں کی چھال سے بنا ہوا ایک تھیلا جس میں تیروں کے واضح سر نظر آ رہے تھے۔ یہ سارے بھی پتوں سے ستر پوشی کیے ہوئے تھے اور عجیب سی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ تاہم شکنتلا کو ان کی ساری گفتگو حیرت انگیز طور پر سمجھ آ رہی تھی۔
شکنتلا کی اس خوبی نے اسے پہلے بھی بار ہا فائدہ دیا تھا۔ جہاز اور بحری قزاقوں کا کپتان شمبالا شکنتلا کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اور شکنتلا اسی زبان میں اس سے گفتگو کر رہی تھی۔ رات بھی شکنتلا کو اپنی زبان اور لہجے میں بولتا دیکھ کر کپتان کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ اس کے خمار انگیز حسن پر تو وہ پہلے ہی سے بری طرح فریفتہ ہو چکا تھا۔ اس کو اپنی زبان میں گفتگو کرتا دیکھ کر اس نے وارفتگی پا کر شمبالا نے اسے پیشکش کر دی تھی کہ وہ اس سے شادی پر رضامند ہو جائے تو وہ اسے بوسا کا قبیلے کے حوالے نہ کرے گا۔
شکنتلا نے اسی وقت حالات کو بھانپتے ہوئے اپنی وفاؤں کا اسے یقین دلایا تھا۔ لیکن اپنی اصلیت اسے نہ بتائی تھی۔ مناسب موقع حاصل ہونے تک شکنتلا نے سردار کے ساتھ رہنے کو ہی بہتر جانا۔ یوں اس وقت وہ سردار کے پہلو میں کسی سردارنی کی طرح سر اٹھائے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
دن کی روشنی میں اس کا چہرہ اس کالی سرزمین پر چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ حالانکہ ہر طرف کالی صورتیں گھوم رہی تھیں۔ جبکہ گوری رنگت والے قیدی سیاہ مٹی سے اٹ کر ویسے ہی سیاہ ہو چکے تھے۔ لیکن شکنتلا صاف ستھرے اور دلکش لباس میں کھڑی تھی۔ جو اس کو شمبالا نے جہاز سے مہیا کر دیا تھا۔ گورا چٹا رنگ و روپ جو اس غضب کی تپش میں سرخ پڑ رہا تھا۔ اسے ہر ذی روح سے ممتاز کر رہا تھا۔ لیکن شکنتلا کو سخت گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے شمبالا کو بتایا تو شمبالا اسے لیے ہوئے غار میں آ گیا۔ یہ غار حیرت ناک حد تک نہ صرف خنک تھا بلکہ مختلف ذریعوں سے روشنی بھی آ رہی تھی۔ لیکن جو بات دیکھ کر شکنتلا بری طرح چونکی وہ اس غار کی حالت تھی۔ غار کے اندر داخل ہوتے ہی شکنتلا کو یوں محسوس ہوا جیسے مہذب دنیا کے کسی مالدار شخص کی حویلی کا ملاقاتی کمرہ ہو۔ زمین پر رنگین اور نرم قالین نما چادر بچھی تھی۔ پوری غار سے مہک آ رہی تھی۔ شکنتلا جو طویل سمندری سفر سے تھک کر چور ہو چکی تھی۔ دلاور اور جہاز کے بقیہ مسافروں کے انجام سے لاپروا لمبی تان کر لیٹ گئی اور آرام کی نیت سے آنکھیں موند لیں۔
اسے پتا چل چکا تھا کہ جزیرہ بوسا کا سے نکلنا اتنا آسان نہ تھا شمبالا نے اسے ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا کہ جزیرے پر جولیانا کا راج ہے جو کہ ایک سفید فام عورت ہے۔
بوسا کا افریقہ کا ایک دور دراز جزیرہ ہے جہاں سفید فام انسانوں کے ایک گروہ کا قبضہ ہے۔ جو مقامی کالے حبشیوں پر قابض ہے اور ان کی مدد سے، بحری قزاقی کے ذریعے لوٹ مار کرتے ہیں اور مسافروں کو اس جزیرے پر لا کر سختی کر کے انہیں مختلف کام سکھائے جاتے ہیں اور انہیں سدھایا جاتا ہے اور پھر کشتیوں اور چھوٹے جہازوں پر لاد کر دوسرے ملکوں میں لے جا کر بطور غلام فروخت کیا جاتا ہے۔
سفید فاموں کی ایک بڑی تعداد جزیرے پر موجود تھی۔ جن کو ہر قسم کی جدید سہولیات میسر تھیں جبکہ مقامی آبادی جو سیاہ فام اور مردم خور تھی ان کے اپنے قدیمی طرز کے جھونپڑے تھے۔ یہ لوگ سفید فاموں کے زیر اثر تھے ان کو غلام سدھانے کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس کے بدلے سختیوں سے مرجانے والے لوگوں کی لاشیں کھانے کے لیے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جزیرے پر پانی کا ایک ہی چشمہ تھا جن پر سفید فاموں کا قبضہ اور کڑا پہرا ہوتا تھا۔ یہیں سے سیاہ فاموں کی عورتیں سفید فاموں کی اجازت سے پانی لے کر جاتیں۔
معمولی گڑبڑ کی صورت میں بھی سفید فام مقامی آبادی کو پانی کی فراہمی بند کر دیتے جس سے ان کی آبادی پیاس سے

مرنے لگتی۔ لہٰذا وہ پوری طرح سفید فاموں کے غلام ہی تھے، اور ان کے حکم پر بلا چوں چراں عمل کرتے۔ بنیادی طور پر بوسا کا قبیلہ وحشی آدم خور اور جنگجو تھا اور کسی دیوی کی پوجا کرتا تھا۔

شکنتلا کو یہ ساری باتیں خود شمبالا جو خود مقامی آبادی سے تعلق رکھتا تھا۔ نے بحری سفر کے دوران بتائی تھی۔ لہٰذا شکنتلا مناسب وقت کے آنے تک چپ سادھ گئی تھی۔ کیوں کہ بنیادی طور پر اس کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ شمبالا کی شکل میں مرد کا ساتھ موجود تھا۔ اور انسانی خون ملنے کی اس کو پوری امید تھی۔ لہٰذا وہ لمبی تان کر سو گئی۔

تاہم اگلے دن اس نے شمبالو سے جزیرہ گھوم پھر کر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جس کی اجازت اس نے بخوشی دے دی۔ ہم دو صحت مند اور چوڑے چکلے اور تربیت یافتہ اور ہتھیاروں سے لیس سیاہ فام اس نے حفاظت کی غرض سے شکنتلا کے ہمراہ کر دیے۔ سواری کے لیے شکنتلا کو ایک ہاتھی فراہم کر دیا تھا۔ شکنتلا ہودے میں بیٹھ گئی حفاظتی اہلکار دائیں بائیں چلنے لگے۔

شکنتلا ہودے میں مزے سے بیٹھے ہوئے اردگرد دیکھنے لگی۔ یہ اس کے لیے ایک دلچسپ تجربہ تھا وہ حبشی اہلکاروں سے باتیں کرنے لگی جو یک ٹک اس کے حسن میں جھومے ہوئے تھے۔ انہوں نے اتنی خوبصورت لڑکی شاید پہلی بار دیکھی تھی۔

''اس جنگل میں درندے بھی ہیں۔'' شکنتلا نے ان سے سوال کیا۔

''ہاں جی۔'' ایک وحشی جو اس کو اپنی زبان میں باتیں کرتے دیکھ کر حیران تھا۔ فوراً بولا۔ ''شیر، ہاتھی، بھیڑیے، ہرن سب کچھ ہے۔ لیکن ہم آپ کو محفوظ راستوں سے لے کر گزریں گے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' شکنتلا زور سے بولی۔ ''میں ڈرتی نہیں جو راستہ چاہے اختیار کرو۔''

اب جنگل زیادہ گھنا ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ تاریک ہو گیا ہے۔

اسی لمحے شکنتلا کو ہرنوں کی ایک ٹولی نظر آئی جو قلانچیں بھرتی ایک طرف دوڑ رہی تھی۔ غزالی ڈار دیکھ کر شکنتلا کھل اٹھی اور اس کی آنکھیں دیوانہ وار ہرنوں کا تعاقب کرنے لگیں کہ عین اسی وقت زمین بھاری قدموں کی دھمک سے ہولے ہولے لرزنے لگی تو سیاہ فام چوکنی نظروں سے ایک ہی سمت دیکھنے لگے۔ اور پھر ان میں سے ایک چابکدستی کے ساتھ نہ جانے ہاتھی کی پچھلی ٹانگوں کے ساتھ کیا حرکت کی کہ ہاتھی چلتے چلتے رک گیا۔ اور پھر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ ہاتھی کے بیٹھتے ہی ایک وحشی نے اچک کر شکنتلا کو کمر سے پکڑ کر اٹھا لیا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر تیزی سے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دوسرے شخص نے تیزی سے لوہے کی دو زنجیروں کو ہاتھی کی پچھلی ٹانگوں میں گھما کر آپس میں پھنسا دی اور پہلے شخص کے آگے چل پڑا اور پھر گہری نظروں سے جائزہ لے کر وہ ایک مضبوط ترین اچھی خاصی گیرائی والے درخت چڑھ گیا۔ تو نیچے سے دوسرے نے شکنتلا کو اوپر کیا تو موٹے ٹہنے پر بیٹھے قبائلی نے شکنتلا کو اوپر کھینچ کر ایک موٹی ٹہنی پر بٹھا کر پتوں سے چھپا کر خاموش رہنے کی ہدایت کی وہ دونوں بھی اس کے قریب ہی درخت پر چڑھے ہوئے تھے۔

اب زمین کی لرزش میں اضافہ ہو چکا تھا اور شکنتلا نے دیکھا کہ دائیں طرف سے ہاتھیوں کا ایک غول نمودار ہونا شروع ہوا۔ چھوٹے بڑے بے شمار ہاتھی بچے ہاتھی بڑے ہاتھی سیاہ کالے ہاتھی درختوں کو روندتے ہاتھی، دھول اڑاتے ہاتھی...... ہاتھیوں کے دیوہیکل پیروں کی دھمک سے سارا اس جنگل گونج رہا تھا۔

اتنے بہت سے ہاتھوں کو پا کر شکنتلا کی سواری والا ہاتھی بھی مچل گیا۔ اور اچھل کود کرنے لگا لیکن شکنتلا اور اس کی حفاظت پر مامور سیاہ فاموں کو اپنے ہاتھی کی یاد نہ تھی یاد تو نہیں اس وقت آئی جب آخری ہاتھی بھی چنگھاڑتا ہوا گزر گیا۔ تو وہ تینوں اردگرد پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے لیکن ہاتھی کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ بمعہ ہودے غائب ہو چکا تھا۔

شکنتلا کو نیچے اتارا گیا اور سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ لیکن اب سفر پیدل شروع ہوا تھا۔ سواری تو سمجھو رسہ تڑا گئی تھی۔ لیکن شکنتلا کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ تو بنیادی طور پر حشرات الارض سے تعلق رکھتی تھی۔ مسلسل رینگنا اس کی عادت

ٹھہری۔ اب قدرے اونچائی شروع ہوگئی۔

''میرا خیال ہے اب دوسری طرف چلتے ہیں مادام۔''

''کیوں؟'' شگفتلا بالوں کو جھٹک کر گھورتے ہوئے بولی۔

''آگے پہاڑ ہیں اور اس کے بعد دوسری طرف دلدلی ساحل ہے۔''

''دلدلی ساحل......'' شگفتلا زیر لب بڑبڑائی۔

''ہاں مادام۔'' سیاہ فام ادب سے بولا ''یہاں کے باسی اسی طرف کم ہی جاتے ہیں اور نہ ہی اس طرف کا ساحل استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بہت خطرناک دلدل ہے۔''

''میں تو دیکھوں گی......'' شگفتلا اڑ گئی۔

''لیکن مادام بہت خطرناک ہوگا پہاڑ کے دوسری طرف جانا۔''

''تم غلام ہو اور میں شمبالا کی دوست ہوں۔ تم دونوں میرے حکم کے پابند ہو، سمجھے۔'' شگفتلا گرجی تو دونوں حبشی کسی ان دیکھے خیال سے سہم گئے۔ اور چپ چاپ پہاڑ پر شگفتلا کے عقب میں چلتے ہوئے چڑھنے لگے۔

بھورے رنگ کا یہ ٹنڈ منڈ پہاڑ جو ہر قسم کے سبزے سے محروم تھا تقریباً پچاس درجے کے زاویے پر کھڑا تھا جس پر چڑھنا انتہائی دشوار تھا۔ لیکن شگفتلا بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تھکاوٹ کے چڑھتی چلی گئی۔ حبشی تو خیر اسی علاقے کے تھے لیکن وہ دھان پان سی دوشیزہ جو نازک اندام نظر آتی تھی کی پھرتی پر داد دیے بغیر نہ رہ سکے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی پھرتی کو سراہنے لگے۔

چوٹی پر پہنچ کر شگفتلا ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور سانس درست کرنے لگی اس نے اتنی مشقت پہلی بار کی تھی۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور پرے چست لباس...... دونوں حبشی کن اکھیوں سے حسن کی انگیٹھی پر عشق کی آگ تاپ رہے تھے۔

شگفتلا ابھی سانس درست کرنے میں معروف تھی کہ اسے گرم گرم بھاپ کا احساس ہوا۔ جزیرے پر پہلے ہی حبس زدہ ماحول تھا۔ شگفتلا کی آنکھیں فوراً ہی پہاڑ کی دوسری جانب ڈھلان سے نیچے گرنے لگیں تو مارے خوف و حیرت کے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

پہاڑ کے دوسری طرف تا حد نگاہ لاوا نما دلدل تھی۔ جس سے گرم بھاپ کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ یہ ابلتی دلدل ایک جھیل کی صورت تھی وسیع و عریض لاوا دلدل جو پہاڑ کے دوسری طرف تھی اور شگفتلا نے دیکھا کہ اس طرف پہاڑ تقریباً عمودی تھا۔ جھیل کے بعد ساحل کی چٹانیں دور دور تک پھیلی تھیں۔ چٹانوں سے سمندر کی لہریں سر ٹکرانے میں مسلسل مصروف تھیں۔ ابلتی دلدل سے مسلسل بڑبڑ کی آوازیں اور گرم بھاپ اٹھ رہی تھی اور ادھر سمندر کی بے قابو موجوں کے ساحلی چٹانوں سے سر پٹخنے کی آواز گہرے پانیوں کی سائیں سائیں مل کر ماحول کو عجیب خوفناک بنا رہی تھیں اور شگفتلا ایک ابھری ہوئی چٹان پر ہاتھ رکھے گم صم اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو اچانک ہی اس کے خیالات کے برعکس سامنے آ گیا تھا۔

''یہ اس جزیرے کی سب سے خطرناک جگہ ہے مادام۔ ذرا سنبھل کر رہیں۔'' ایک حبشی کو کہتے شگفتلا چونکی۔

''آں......ہاں''

حبشی کی سو فیصد درست بات سن کر شگفتلا چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور پھر پلٹ کر نیچے اترنے لگی اور حبشی اس کے پیچھے چل پڑے۔ پہاڑ سے اتر کر سمت تبدیل کر لی تھی۔ اب اس کا رخ جنوبی ساحل کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

گھنے جنگل میں وہ جیسے ہی دوبارہ داخل ہوئے ایک طرف سے گرد و غبار کا طوفان اٹھتا ہوا نظر آنے لگا۔ شگفتلا بوکھلا کر محافظوں کو تکنے لگی۔ لیکن ان کے سیاہ چہروں پر کوئی فکر انگیزی نہ ابھری۔ تاہم آہستگی سے وہ ایک درخت کی شاخوں کے پیچھے آ گئے اور شگفتلا کے آگے اور پیچھے کھڑے ہو گئے۔

گردوغبار کا طوفان دراصل نیل گائے نما جانوروں کے قدموں کی دھول تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دشمن فوج حملہ آور ہو رہی ہو۔ اب یہ جانور قریب سے گزر رہے تھے۔ ان کے قدموں کی بے پناہ دھمک اور دھول سے ساری فضا اٹ گئی۔ شکنتلا بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگی یہ ہرن کی شکل گائے جیسے وجود کے دھاری دار عجیب الخلقت جانور تھے ان کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں میں تھی۔ اور وقفے وقفے سے یہ غول درغول اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ شکنتلا کو ان کی شکل سے یوں لگا جیسے یہ زیبرے کے رشتے دار ہوں۔ ان کا غول گزر جانے کے بعد شکنتلا محافظوں کے درمیان پھر چل پڑی۔ اب جزیرہ بوساکا کے اصلی سیاہ فام باشندوں کی آبادی شروع ہو چکی تھی۔

''ہم لوگ یہاں پر مختلف قبیلوں کی صورت میں رہتے ہیں۔ یہ جزیرہ بوساکا کے جاراک قبیلے کی بستی ہے۔''

شکنتلا جو پیدل چل رہی تھی بغور بستی کا مشاہدہ کرنے لگی۔ لیکن اچانک ہی احساس ہوا کہ یہاں مکھیاں بہت زیادہ ہیں۔ بھن بھن کرتی مکھیاں جو اس کے منہ اور ناک پر بیٹھ رہی تھیں۔ اسے الجھن اور کوفت ہونے لگی اور ہاتھ ہلا کر انہیں ہٹانے کے جتن کرنے لگی پلٹ کر حبشیوں کو دیکھا تو انہیں بھی غلیظ مکھیوں کے کمبل میں لپٹے پایا۔ لیکن حیرانی کی بات تھی وہ اطمینان سے یوں چل رہے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

اب بستی سامنے نظر آنے لگی۔ بستی کے وسط میں گول اور بیضوی مٹی کے گھر نظر آنے لگے جن میں سے تنگ سوراخوں میں سے دھواں مرغولوں کی شکل میں اٹھ رہا تھا۔ گلیوں میں سیاہ بھجنگ ننگ دھڑنگ بچے کھیل کود میں مشغول تھے۔ شکنتلا مسلسل پیدل چلنے اور حبس زدہ ماحول اور گردوغبار ناک، منہ اور آنکھوں میں جانے کے باعث اب تھکنے لگی تھی۔ اس کا خوبصورت لباس بھی گندا نظر آنے لگا تھا۔ جبکہ اس کا تمام جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ افریقہ کے جنگل کی سیر اسے مہنگی پڑ رہی تھی لیکن تھی وہ سخت جان، اپنی کمزوری ظاہر کرنے پر آمادہ نہ تھی۔

دونوں حبشی اسے لیے ہوئے ایک مکان میں گھس گئے۔ گھپ اندھیرے مکان میں چند لمحوں کے لیے شکنتلا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی قبر میں گھس آئی ہو لیکن منظر واضح ہوتے ہی اس نے محسوس کیا کہ اندر ایک طرف لالٹین جل رہی ہے جبکہ کمرے کے وسط میں آگ روشن ہے۔ جس کا دھواں چھت کے عین درمیان بنے سوراخ سے باہر جانے کی ناکام کوشش کے بعد کمرے میں ہی بکھر رہا تھا۔ کمرے کی مٹی کے فرش پر ایک عمر رسیدہ جوڑا بھی بیٹھا تھا۔

''کس لیے آئے ہو؟'' شکنتلا نے حبشیوں کو خشمگین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بستی کے سابقہ سردار کا گھر ہے۔ یہاں آپ کو کچھ شربت وغیرہ پلانے کے لیے لائے ہیں تاکہ آپ کی طبیعت بہتر ہو جائے۔''

''نہیں پینا مجھے شربت وربت۔ میرا تو دھوئیں سے دم گھٹا جا رہا ہے۔ پتا نہیں لوگ یہاں کس طرح رہتے ہیں۔'' شکنتلا کے لہجے میں بے زاری نمایاں تھی۔

''چلو نکلو یہاں سے۔'' وہ تحکمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے جھک کر چھوٹے سے دروازے کو پار کر کے باہر آ گئی۔ باہر بستی کے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ شکنتلا بستی کی عورتوں پر طائرانہ نظریں دوڑانے لگی۔ یہ نہایت غریب، محنت کش اور جاہل لگتی تھیں۔ اکثر عورتوں نے کانوں تک کو مروڑ کر ان میں بے شمار گول گول لیکن بڑی بڑی بالیاں ڈال رکھی تھیں۔ سیاہ کالی بھجنگ عورتیں پتوں اور کہیں کہیں کپڑوں سے بمشکل ستر پوشی، ہاتھوں میں تانبے اور موتیوں کے بنے کڑے پیلے پیلے گندے دانت۔ کانوں میں بے شمار چھید اور چھیدوں میں گول گول تاریں، کچھ کی کمر میں شیر خوار بچے بندھے ہوئے تھے۔ پیروں میں جھانجروں کی مانند تانبے کڑے تھے کہ گھٹنوں تک آ رہے تھے۔ تمام مردوں کے سر منڈے ہوئے تھے اور تقریباً ہر مرد کے ہاتھ میں لکڑی کی مٹھ اور لوہے کا طمنچہ تھا۔ تاکہ راہ چلتے چلتے اچانک کوئی جانور سامنے آ جائے تو اسے بھگایا یا مارا جا سکے۔ ہر طرف مکھیوں کی بھنبھناہٹ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر دیکھ کر نازوں سے پلی خوشبوؤں کی ڈلی شکنتلا کو ابکائیاں آنے لگیں۔ اس نے دونوں محافظوں کو فوراً اس جگہ سے نکلنے کا کہا اور پھر وہ لوگ بستی بوساکا کے مکینوں کی بھیڑ کو کاٹتے ہوئے وہاں سے نکلنے لگے۔ وحشی اس عورت کی بے تکانی پر حیران تھے۔ جس نے ابھی تک کچھ کھایا پیا

بھی نہ تھا۔

''یہاں کتنے قبیلے ہیں؟'' شکنتلا نے حبشیوں سے ان کی زبان میں پوچھا۔

''اس جزیرے میں صرف بوسا کا قبیلہ ہی آباد ہے لیکن مختلف بستیوں کی صورت میں ہماری رہائش ہے۔ اس بستی سے کچھ کچھ فاصلے پر باقی بستیاں آباد ہیں۔''

''کتنی آبادی ہے تمہاری؟''

''ہمارے لوگ بے حساب ہیں۔''

''پھر بھی جولیانا اور اس کے آدمیوں کے غلام ہو؟'' شکنتلا نے کریدنے کے انداز میں سوال کیا تو کچھ دیر کے لیے دونوں حبشی خاموش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''میرے سوال کا تم نے جواب نہیں دیا۔'' شکنتلا ان دونوں کے چہروں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ بہت طاقتور لوگ ہیں مادام۔ آپ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔''

''یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ان کا ایک اڈہ ہے۔ جہاں لائے گئے قیدیوں کو غلام بنانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہاں ہی جولیانہ بھی ہوتی ہے آپ خود پوچھ لیجیے گا۔'' حبشی نے جیسے بات ختم کردی۔ ''چلو پہلے تم مجھے وہ دکھاؤ۔''

اور حبشیوں نے اپنی راہ بدل لی۔ اب ان کا رخ جنگل ک اندرونی سمت میں تھا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی ٹہنیاں اور قد آدم گھاس ان کے چلنے میں رکاوٹ تھی۔ لیکن جلد ہی حبشی ایک پگڈنڈی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے کیوں کہ وہ تو وہیں کے باشندے تھے۔ کھلا میدان نظر آنے لگا خاصی دیر چلنے کے بعد جنگل ختم ہو گیا۔ وسیع میدان کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑے دائرے میں درختوں کے تنے زمین میں گاڑ کر لگائے گئے تھے اور ان تنوں پر زمین سے لے کر تنوں کے آخری سرے کی اونچائی تک موٹی خاردار تار لگی تھی۔ یہ اونچائی انسانی قد سے کئی گنا تھی درمیان میں لوہے کا بہت بڑا دروازہ تھا۔ دروازے سے باہر بہت بڑی چارپائی جس پر چند مسلح حبشی بیٹھے تھے۔ پاس ہی ایک افریقی اپنے گھوڑے کی دم پر بار باندھ رہا تھا۔

دونوں حبشی دروازے پر پہنچ گئے اور انہوں نے کچھ کہا تو دروازہ کھول دیا گیا۔ حبشیوں کے جلو میں شکنتلا جیسے ہی اندر داخل ہوئی چند ہولناک چیخوں سے اس کے کان تھر تھرا اٹھے جیسے وحشیانہ تشدد سے کسی عورت پر جانکنی کا عالم طاری ہوا!

☆......☆......☆

تھوڑی دور جانے سے ہی شکنتلا کو منظر نظر آ گیا۔ ایک درخت کی موٹی شاخ سے ایک سفید فام عورت کو الٹا لٹکایا گیا تھا اور حبشی درخت کی پتلی شاخ ہاتھ میں پکڑے مسلسل اس کے عریاں بدن پر برسا رہا تھا۔ عورت کسی ذبیحہ بکرے کی مانند وحشیانہ انداز میں ڈکرا اور تڑپ رہی تھی۔ شکنتلا کے لیے ایسے مناظر کوئی معنی نہیں رکھتے تھے بلکہ ایسے ایسے مناظر سے طمانیت ہوتی تھی اپنے دور حکومت میں تو بعض اوقات فارغ ہوتی تو درجنوں انسانوں کو اپنے سامنے منگوا کر خون میں نہلا دیتی لیکن یہ عورت کچھ ایسے انداز میں تڑپ رہی تھی کہ ایک لمحے کو شکنتلا کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی لیکن یہاں اس کا حکم نہ چلتا تھا۔ آگے بڑھ گئی تو اس نے دیکھا جگہ جگہ ظلم کی صلیبیں گڑی ہیں اور وحشی بری طرح لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ دونوں حبشیوں نے اسے بتایا کہ یہاں قیدیوں کو مختلف کاموں کی تربیت دی جاتی ہے اور معمولی کوتاہیوں پر اسی طرح الٹا لٹکا کر مارا جاتا ہے۔ لہٰذا قیدی جلدی جلدی کام سیکھ جاتے ہیں۔ اور پھر مختلف ملکوں میں لے جا کر انسانوں کی منڈیوں میں انہیں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ تربیت یافتہ غلاموں کی اچھی خاصی قیمت مل جاتی ہے۔

مزید آگے بڑھے تو ایک جگہ دائرے میں بیٹھے قیدی سوئی دھاگے کی مدد سے کپڑے سی رہے تھے اسی طرح ایک جگہ قیدیوں کو چارپائیاں، کرسیاں بننا سکھائی جا رہی تھیں کچھ آگے گئے جہاں کھیتی باڑی کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اور ایک طرف کھلی جگہ پر دائرے میں بہت سے لوگ دائرے میں بیٹھے نظر آئے اور دائرے کے درمیان ایک خوبصورت چارپائی بچھی تھی جس پر سنہرے بالوں والی کوئی بھاری بھر کم عورت بیٹھی تھی۔ شکنتلا کو اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔

شگفتلا اسی طرف چل دی وہ جان گئی تھی کہ یہ جولیانہ ہی ہوگی۔ جس کے بارے میں وحشی اسے بتا چکے تھے کہ ایک طاقتور عورت ہے جس کا پورے جزیرے پر قبضہ ہے۔ شگفتلا اس کے قریب آ گئی سامنے بیٹھے لوگوں کی توجہ اپنی پشت پر پا کر اس عورت نے پلٹ کر دیکھا تو شگفتلا ایک لمحے کو اپنی جگہ پر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔

عورت کیا تھی اچھی بھلی بھینس تھی۔ اونچا لمبا قد، بھاری بھرکم وجود، گوری رنگت نیلی آنکھ جس چیز نے شگفتلا کو چونکا دیا۔ وہ اس کی بائیں آنکھ پر بندھی ہوئی کالی پٹی تھی۔ جس نے تقریباً آدھے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ عورت شگفتلا کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''آؤ اجنبی خوبصورت حسینہ۔'' عورت نے موٹا تازہ ہاتھ شگفتلا کی طرف بڑھایا تو شگفتلا نے اپنا ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ لیکن اس نے شگفتلا کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ وہ کراہ کر رہ گئی۔ شگفتلا کو یوں لگا جیسے اس کا ہاتھ کسی دیو کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ شگفتلا کی سسکی نکل گئی۔

''دس سالوں میں تم یہاں پہلی اجنبی انسان ہو جس نے آزاد حیثیت سے اس جزیرے میں قدم رکھا۔ ورنہ آج تک ہر آنے والی عورت اور مرد چاہے وہ سیاہ فام ہو یا سفید فام اس جزیرے پر غلامی کا طوق پہنائے لایا جاتا ہے۔'' عورت نے شگفتلا کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام؟''

''شگفتلا اور تمہارا جولیانہ ہے نا؟''

''ہاں اس جزیرے کی بلاشرکت غیرے حکمران۔'' جولیانہ فخریہ انداز میں اٹھی اور ہاتھ پشت پر باندھ کر ٹہلنا شروع ہو گئی۔''

''تم شمبالا کی معشوق ہو؟''

''درست۔'' شگفتلا نے زلفیں جھٹک کر کہا۔

''شمبالا کا انتخاب واقعی قابل تعریف ہے۔'' جولیانہ نے گہری اور معنی خیز نگاہیں شگفتلا کے چہرے پر جما کر کہا تو شگفتلا مسکرا دی۔

ابھی جولیانہ اور شگفتلا کی گفتگو جاری تھی کہ ایک وحشی ایک بڑی سی ٹوکری سر پر اٹھائے ہوئے آیا اور پھر ٹوکری جولیانہ کے قدموں میں رکھ کر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

ٹوکری میں بہت سے سانپ کلبلا رہے تھے۔

''تم شمبالا کی معشوق ہو لہٰذا ہماری بھی مہمان ہو تمہارے لیے اس جزیرے کی سب سے مرغوب چیز حاضر ہے۔'' جولیانہ نے ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مرغوب چیز......؟'' شگفتلا نے حیرانی سے پہلے ٹوکری اور پھر جولیانہ کی طرف دیکھا؟

''ہاں کھانے سانپ...... اس جزیرے کی لذیذ ترین کھانے والی چیز ہے۔'' جولیانہ نے ہاتھ بڑھا کر ایک ٹوکری سے سانپ نکالا اور شگفتلا کی طرف بڑھا دیا۔ جسے غیر ارادی طور پر شگفتلا نے پکڑ لیا اب شگفتلا حیرانی سے ہاتھ میں پکڑے سانپ کو دیکھ رہی تھی کہ جولیانہ نے پھر ہاتھ بڑھا کر ٹوکری سے ایک سیاہ موٹا تازہ کالا ناگ نکالا جو اپنی سرخ زبان تیزی سے شوں شوں کی آواز سے اندر باہر کر رہا تھا اور سانپ اٹھاتے ہی اس نے تیزی سے اس کی دم منہ میں ڈالی اور دانتوں سے تھوڑی سی کتر کر تھو...... کی آواز سے کٹی ہوئی دم زمین پر پھینک دی اور پھر سانپ کے سر کو منہ میں ڈالا اس سے قبل کہ شگفتلا کچھ سمجھتی جولیانہ نے سانپ کا سر پھن سمیت منہ میں ڈالا اور دانتوں سے ٹک کی آواز کے ساتھ اس کا منہ بھی کاٹ کر تھو کر کے سانپ کی کٹے ہوئی گردن بھی زمین پر پھینکی۔ سانپ کی کٹی ہوئی گردن اچھلنے لگی لیکن جولیانہ اسی اثناء میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سانپ کے دھڑ کو مزے مزے سے کترتے ہوئے ایسے کھانے لگی جیسے مولی یا گاجر کھائی جاتی ہے جبکہ سانپ کا کٹا ہوا وجود اس کے ہاتھ میں بری طرح حرکت کر رہا تھا۔

جولیانہ کی اس غیر متوقع حرکت اور اپنی نسل کا یہ حشر دیکھ کر شکنتلا بھنا اٹھی۔ اس کا دماغ سانپ کی توہین اور بے بسی دیکھ کر گھومنے لگا ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ٹوکری میں کلبلاتے سانپ تیزی سے باہر نکلنے لگے اور ٹوکری سے باہر آتے ہی شکنتلا کے پیروں کی طرف بڑھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام سانپ اس کے قدموں تلے لوٹنے لگے۔ جیسے ناگن دیوی سے فریاد کر رہے ہوں۔ شکنتلا غصے اور جولیانہ حیرت سے کھڑی ہو گئیں۔

☆......☆......☆

دلاور پنجرے کے باقی قیدیوں کو دیکھ رہا تھا۔ نئے آنے والے تو سخت ہراساں تھے لیکن پہلے سے موجود قیدی بھی اپنی زندگی سے نالاں نظر آتے تھے۔ ان میں سے اکثر کے جسموں پر جا بجا زخم اور تشدد کے نشانات تھے۔ یوں لگتا تھا ان سے سخت مشقت لی جاتی ہے اور انہیں بری طرح مارا پیٹا بھی جاتا ہے۔ اب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ دلاور کی بھوک چمک رہی تھی لیکن پہری داروں کی حرکات سے ظاہر ہوتا تھا کہ کھانے پینے سے شے ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ اسی عالم میں اندھیرا چھا گیا۔ اور دلاور ماضی اور حال میں سوچوں میں گم نیند میں اترتا چلا گیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ تا حد نظر سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ ہر سمت نیلگوں پانیوں کا راج ہے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک ویران ساحل سمندر پر کھڑا بے کراں وسعتوں پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ ساحل پر چھوٹے بڑے کھجور کے بے شمار درخت ہیں۔ وہ ننگے ساحل کی گیلی ریت پر ٹہل رہا ہے رات کا اندھیرا چھٹ رہا ہے اور دور سمندر کے افق پر سرخی نمودار ہونا شروع ہوگئی ہے اچانک اس کی نظر ایک جگہ مرتکز ہو جاتی ہے دیکھتا ہے کہ ایک سفید ریش بزرگ سفید کپڑے پہنے دوزانو بیٹھے ہیں لمبی تسبیح تھامے ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا رکھے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ایک جائے نماز پر بیٹھے تھے اور جائے نماز پانی پر ساکت تھی۔

دلاور کو بڑی حیرت ہوئی کہ پانی کی سطح پر موجود جائے نماز دوزانو بیٹھی یہ پرعظمت شخصیت کون ہے اور یہ کیوں کر پانی کی سطح پر ایسے ساکت بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ڈوب کیوں نہیں رہے۔ وہ کیا راز ہے کہ پانی انہیں اپنے سینے پر اٹھائے رکھنے پر مجبور ہے۔ بااختیار دلاور پانی کی ابتدائی لہروں تک آ گیا۔ اور بے یقینی و بے قراری و بے چینی سے مصلے پر، موجود بزرگ کو غور سے دیکھنے لگا۔

اچانک وہ بزرگ آنکھیں کھول دیتے ہیں اور دائیں ہاتھ کے اشارے سے دلاور کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ دلاور حیرت سے انہیں اور کبھی پانی کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کو دیکھتا پھر وہ بزرگ اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کرتے ہیں۔

''یہ...... یہ...... پانی'' دلاور اضطراری طور پر پانی کی طرف اشارہ کر کے بزرگ کو زیر لب کچھ جواب دیتا ہے۔

''تجھے کچھ نہیں کہتا...... آ جا'' اور پھر اچانک دلاور میکانی انداز میں اپنے قدم پانی کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ اور پھر اسے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اس کے قدم ریت پر نہیں پانی کی سطح پر پڑ رہے ہیں۔ نرم اور ٹھنڈا پانی اس کے پاؤں کے تلوؤں تک ہی رہتا ہے۔ دلاور کے قدم تیز ہو جاتے ہیں اور وہ پانی کی سطح پر آزادی سے چلتا ہوا جائے نماز پر براجمان سفید باریش اور سفید پوش بزرگ کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا تا آنکہ ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

''یہ تیرے ایمان کامل کا ثبوت ہے۔'' بزرگ کی آواز اسے سمندر کی سطح پر گونجتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔

''تو صاحب ایمان مسلمان ہے۔ آزاد پیدا ہوا ہے۔ آزادی تیرا بنیادی حق ہے دیکھ اپنے وجود کو'' بزرگ کے لب ہل رہے تھے۔ آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ دلاور بت بنا صرف سن رہا تھا۔

''تیرے ایک دھکے سے مضبوط پتھروں سے بنی دیوار گر سکتی ہے تو لکڑی کہ یہ بھالے تمہارا راستہ کیسے روک سکتے ہیں۔ یقین اور اعتماد سب سے بڑی دولت ہیں۔ اٹھو اور طوفان بن کر راستے میں آنے والی ہر برائی کو نیست و نابود کر دے۔''

اور پھر دور سمندر کے افق پر تانبے کی مانند چمکتی پرات سورج کی شکل میں ارض و سما کے سینے میں نمودار ہوتی ہے تو اس کی روشنی سے ٹھاٹیں مارتے سمندر کے پانی سے روشنی کی چکا چوند لہریں آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتی ہیں۔

اچانک دلاور کی جھٹکے سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگا تھا جبکہ وہ لکڑی کے پنجرے کی چوبی سلاخوں کو ہاتھ سے تھامے ہوئے پنجرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ پورا خواب اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور بزرگ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔

''سائیں مرچو......'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا ہے اور بے دھیانی میں درختوں کی غیر تراشیدہ شاخوں سے بنی ہوئی پنجرے کی چوبی سلاخوں پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے کہ لکڑیاں کڑکڑانے کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی ہے۔ سلاخوں کے جوڑ اس کے فولادی ہاتھوں میں دم توڑنے لگے گرفت اور پکی ہوئی کڑکڑ کڑ کی آواز نکلنے لگی اور پھر اچانک لکڑی کے جوڑ ہلنے لگے۔ بے اختیار دلاور کے منہ سے اللہ اکبر کی صدا نکلی اور وہ ہاتھوں پر زور بڑھانے لگا۔ لکڑیاں چڑچڑانے لگیں اور زوردار آواز سے لکڑی کہ بھالے جو زمین میں پیوست تھے اکھڑتے چلے گئے۔ لیکن آج تک اس نے اپنی طاقت کا صحیح طریقے سے کبھی امتحان ہی نہ لیا تھا۔ آج اپنی طاقت دیکھ کر وہ خود شرمندہ ہو گیا۔ وہ تیزی سے لکڑی کے پنجرے سے باہر آ گیا۔

☆......☆......☆

سانپ شکنتلا کے قدموں میں بری طرح لوٹ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ قدموں کو بوسہ دے رہے ہوں۔ اس سے فریاد کر رہے ہوں۔ لحہ بہ لحہ شکنتلا کا چہرہ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ رہی تھیں اس کے مسلز غصے سے تن رہے تھے اور آنکھوں میں خون اترنے لگا تھا۔

شکنتلا نے ایک قہر آلود نگاہ جولیانہ پر ڈالی اور پھر جھک کر ایک سانپ کو اٹھایا۔ سانپ اس کے ہاتھ مین آتے ہی جھومنے لگا۔ شکنتلا نے سانپ کا منہ اپنے کان کے قریب کیا۔ سانپ نے اپنی دوشاخہ زبان باہر نکال کر لہرائی۔ شکنتلا کے چہرے کہ تاثرات ایسے تھے جیسے وہ کچھ سن رہی ہو۔ سانپ کہہ رہا تھا۔ ''ہمارے پاس زہر نہیں جس کے سبب ہم کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے...... ہماری اس کمزوری کی بدولت اس جزیرے پر ہمیں کھایا بھی جاتا ہے اور ہم سے رسی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ دیوی ہماری سہائتا کرو۔'' سانپ کی بات سن کر شکنتلا نے اسے زمین پر ڈال دیا اور آہستہ روی سے جولیانہ کی طرف بڑھی۔

جولیانہ ابھی تک بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ شکنتلا اس سے مخاطب ہوئی۔

''میں سانپوں کی ملکہ ہوں۔'' شکنتلا کی بات سن کر جولیانہ یوں ہنسی جیسے شکنتلا نے دلچسپ مذاق کیا ہو۔

''تو سانپوں کی ملکہ ہے......تو میں بوساکا جزیرے کی حکمران ہوں۔ مت بھول کہ اس جزیرے پر میرا حکم چلتا ہے شمبالو کا نہیں...... اگر چند دن آرام سے رہنا چاہتی ہو تو نگاہیں جھکا کر جولیانہ سے بات کیا کرو...... یہ میری طرف سے پہلی اور آخری تنبیہہ ہے۔''

''ایک شرط ہو گی میری'' شکنتلا پلکیں جھپکائے بغیر اس پر نگاہیں جما کر بولی۔

''آئندہ سانپ کو اس جزیرے پر کوئی نہیں کھائے گا۔''

''لگتا ہے تجھے عزت راس نہیں۔'' جولیانہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے غضبناک لہجے میں بولی۔ پھر چارپائی سے اپنا چمڑے کا کوڑا اٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھی اور گھما کر زور سے کوڑا شکنتلا کے شانے پر لگا۔

''آہ!'' وہ کرب سے چلا اٹھی۔ جولیانہ نے دوبارہ کوڑا گھمایا اور دانت پیستے ہوئے بولی۔

''آج کہ بعد تم شمبالو کی مہمان نہیں جولیانہ کی قیدی ہو...... سمجھی......'' یہ کہہ کر جونہی اس نے شکنتلا کے وجود کو نشانہ بنایا تو شکنتلا نے تیزی سے ایک طرف ہٹی اور نہایت پھرتی سے لہراتے ہوئے کوڑے پر جھپٹی۔

اب اس کا سرا شکنتلا کی مٹھی میں تھا۔ شکنتلا نے کوڑا ہاتھ میں آتے ہی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور سے کھینچا۔ جولیانہ کوڑا نہ چھوڑنا چاہتی تھی اس لیے وہ اس کے ساتھ کھنچی چلی آئی۔ یہ دیکھ کر شکنتلا نے یک دم کوڑا چھوڑ دیا...... نتیجے کے طور پر بھاری بھرکم جولیانہ اوندھی ہو کر دھڑام سے زمین پر گری۔ اور خاک چاٹنے لگی۔ اسے شدید چوٹ آئی تھی اور اس

کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔ وہ بری طرح چیخنے چلانے لگی تھی اور شکنتلا کو گالیاں بک رہی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر جولیانہ کے محافظ آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے تیر کمان پر چڑھایا اور کمان کی راسیں کھینچ کر اسے چھوڑا تو تیر سنسناتا ہوا شکنتلا کی طرف بڑھا۔ شکنتلا نے جست لگائی اور کسی گیند کی طرح زمین پر لڑھک گئی۔

"ٹھہرو......" جولیانہ نے ہاتھ کھڑا کر کے محافظوں کو روکنے کا حکم دیا۔ وہ حیرت انگیز تیزی سے زمین سے اٹھ بیٹھی تھی۔ "کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اس کو گستاخی کا مزہ میں خود چکھاؤں گی۔" یہ کہتے ہی اس نے ہتھنی جیسے وجود کے ساتھ شکنتلا پر چھلانگ لگادی۔

شکنتلا کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ اس پر جاگری تھی۔ شکنتلا کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھاری بھرکم چٹان اس پر آگری ہو اس نے زور لگا کر جولیانہ کو پرے دھکیلنا چاہا مگر وہ تو گوشت کا پہاڑ تھی۔ شکنتلا کو اس کے بوجھ سے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ اب جولیانہ اس کے سینے پر چڑھ بیٹھی تھی۔

اس کے رخساروں پر دھڑا دھڑ تھپڑ مار رہی تھی۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے شکنتلا کے بال پکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے دائیں رخسار کو طمانچوں سے لال کرنے لگی۔ اس کے بھاری ہاتھ کی چوٹ سے شکنتلا کا ہونٹ پھٹ گیا اور اس سے خون نکلنے لگا۔ وہ گوشت کے اس پہاڑ کی مضبوط گرفت میں بری طرح تڑپ رہی تھی۔ اس یوں لگا جیسے ابھی ابھی اس کی روح قفس عنصری پرواز کر جائے گی۔

اسی لمحے شکنتلا نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنے تمام حواس مجتمع کر کے اس کے چہرے پر توجہ مرکوز کی اور زور سے پھنکاری، جولیانہ کا چہرہ گرم گرم سانسوں سے یک لخت جھلس گیا۔ اب جو اس نے دیکھا تو اس کے نیچے شکنتلا نہ تھی۔ بلکہ ایک بہت بڑا اژدھا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر دہشت سے اس کے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ لڑکی کو اژدھے کا روپ اختیار کرتے دیکھ کر مخالفین کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ وحشی کی اس بات کو دیوتاؤں کا قہر سمجھتے ہوئے بھالے اور کمانیں پھینک کر سجدے میں گر گئے۔ ادھر غضبناک اژدھا جولیانہ کی کمر کے گرد اپنا شکنجہ کسنے لگا۔ جولیانہ کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ اس کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹ گئیں۔ بازو ہوا میں پھیل گئے۔ شکنتلا اس کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ اس نے پھنکار کر آخری بار گھیرا تنگ کیا اور جولیانہ کی ناک، منہ اور کانوں سے خون جاری ہوگیا۔ اس کے جسم کی تمام ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئیں۔ یہ دیکھ کر شکنتلا نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی۔ اور اس سے الگ ہوگئی پھر وہ واپس انسانی روپ میں آگئی تمام وحشی سجدے میں پڑے اونچی آواز دیوتاؤں سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے۔

اس لمحے ٹوکری سے نکلے ہوئے سانپ کی شکنتلا کی طرف بڑھنے لگے اور اس کے قدموں میں لوٹنے لگے۔

"سب کھڑے ہوجاؤ۔" شکنتلا نے وحشیوں کو حکم دیا۔ وہ اس وقت سبز ریشمی لباس میں تھی اس کے سر پر سونے کا تاج جگمگا رہا تھا۔ وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے بڑی ادا سے کھڑی تھی۔ اس کی آواز سن کر جو وحشیوں نے جو تعداد میں بے شمار تھے...... ڈرتے ڈرتے اپنے سر اٹھائے تو شکنتلا کا نیا روپ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ سینے پر باندھ کر تعظیم سے سر جھکا دیے۔ شکنتلا نے وحشیوں سے اس جزیرے پر موجود سیاہ فام آقاؤں کی تعداد کے بارے میں انفسار کیا اور دیگر باتیں پوچھنے لگیں۔ وحشیوں نے اسے بتایا کہ جزیرے پر سفید فاموں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے لیکن وہ جزیرے کے تمام وسائل پر قابض ہیں۔ اشیائے خوردونوش، ہر قسم کا غلہ، پانی، اسلحہ ان کے قبضے میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کشتیاں بھی صرف سفید فام ہی رکھ سکتے ہیں جس کی وجہ سے سیاہ فام مجبور اور عملاً غلام ہیں۔ شکنتلا نے ان سے سفید فاموں کے جائے رہائش کے متعلق پوچھا۔ وہ مقام قریب ہی تھا پھر وہ وحشیوں سے مخاطب ہوئی۔

"میں ناگن دیوی ہوں...... اس جزیرے کے سانپوں کی فریاد سن کر ناگ دیوتا نے مجھے سانپوں اور تم لوگوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ لہٰذا جیسے میں کہتی جاؤں...... ویسے کرتے جاؤ...... میں تمہیں ان گوروں سے نجات دلادوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے سب وحشیوں کو حکم دیا "قبیلے کے لوگوں کے پاس چلے جاؤ اور ان لوگوں کو مسلح کر کے صبح ہونے سے پہلے پہلے

اسی جگہ واپس آ جاؤ۔ تمہارے آنے تک میں آدھے گوروں کو ختم کر چکی ہوں گی اور باقی پر تم نے حملہ کرنا ہے اور دیکھو کسی گورے کو اس بات کا پتا نہ چلے......'' ابھی اس کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ عقب سے ایک زوردار چیخ سنائی دی۔ وہ تیزی سے پلٹی اس حرکت سے اس کی جگہ تبدیل ہوگئی۔ اسی لمحے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور عین اس جگہ آ کر زمین میں پیوست ہوگیا۔ جہاں شکنتلا ایک لمحہ پہلے کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

بھاگتے بھاگتے دلاور بہت دور نکل آیا تھا۔ اب جنگل ختم ہو چکا تھا اور دھرتی کا اکا دکا درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ جا بجا لمبی گھاس بھی تھی۔ تھکن نے اس کا برا حال کر دیا تھا اس لیے اب وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک انسانی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اسے سامنے درخت کی اوٹ میں دو آدمی نظر آئے جو عجیب سی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ اس کے رنگ سرخ و سپید تھے وہ دونوں ایک طرف اشارہ کر کے آپس میں باتیں کر رہے تھے...... دلاور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہوگیا اور ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک کھلا میدان تھا جہاں شکنتلا خوبصورت لباس پہنے کھڑی تھی اور بے شمار وحشی اس کے سامنے سجدے میں پڑے ہوئے تھے۔ اسے ایک طرف کسی بھاری بھرکم عورت کی لاش بھی پڑی نظر آئی۔ درخت کی اوٹ میں چھپے آدمی دونوں شکنتلا کی طرف دیکھ کر ہی باتیں کر رہے تھے۔ جو اب وحشیوں سے محو گفتگو تھی۔

اسی اثناء میں دونوں اشخاص نے اپنے اپنے تیر کمان پر چڑھائے اور شست باندھ کر شکنتلا کو نشانے پر رکھ لیا۔ دلاور کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی...... وہ سمجھ گیا کہ وہ دونوں شکنتلا کو مارنا چاہتے ہیں۔ اس نے فوراً حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا اور متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ وہ گیند کے حجم کے دو پتھر تھے۔ دلاور نے لپک کر انہیں اٹھا لیا اور بے آواز لیکن نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا ان دونوں آدمیوں کے سروں پر پہنچ گیا۔ وہ اپنی دھن میں مگن، تیر کمانوں پر چڑھائے، سیماب صفت شکنتلا کو نشانہ لینے میں مصروف تھے، جو ادھر اُدھر حرکت کر رہی تھی۔ دلاور نے تاخیر مناسب نہ سمجھی اور تاک کر دونوں پتھر ایک ساتھ ان کے سروں پر دے مارے۔ اس بلائے ناگہانی سے دونوں چیختے ہوئے اپنا سر پکڑ کر زمین پر گر گئے......

لیکن اس دوران ایک شخص کا تیر کمان سے نکل کر اپنے ہدف کے تعاقب میں جا چکا تھا۔ شکنتلا کی قسمت اچھی تھی کہ ان کی چیخیں سن کر شکنتلا نے اپنا زاویہ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ بال بال بچ نکلی اور تیر اس کے پاس ہی زمین میں پیوست ہوگیا۔ دلاور نے آگے بڑھ کر ایک آدمی کو پکڑ لیا جو اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے اس کا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ٹکر اس کی ناک پر رسید کی پھر تیزی سے پتھر اٹھا کر اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ وہ تیورا کر گر پڑا...... اسی اثناء میں دوسرا شخص بھی قدرے سنبھل چکا تھا۔ اس نے دلاور کو پیچھے سے آ کر بازوؤں کے شکنجے میں لے لیا لیکن دلاور کے انگ انگ میں بجلی بھر چکی تھی۔ اس نے اس کی گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی دونوں کہنیاں پوری قوت سے اس کے پیٹ میں دے ماریں، جس سے اس کی گرفت لمحے بھر کو کمزور پڑ گئی...... اور یہی کمزوری دلاور کے لیے کافی تھی وہ سرعت سے پلٹا اور اسے ارنوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ مذکورہ شخص دلاور کی مضبوط ضربوں کو برداشت نہ کر سکا اور زمین پر گر گیا۔ شکنتلا اتنی دیر میں وحشیوں کو حکم دے چکی تھی کہ وہ ان دونوں کو پکڑ کر اس کے پاس لے آئیں چنانچہ پانچ چھ وحشی جھٹ پٹ ان دونوں سفید فاموں پر پل پڑے اور لمحوں میں ان کی مشکیں کس دی گئیں۔



☆☆☆

(اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط ماہ اپریل میں ملاحظہ کیجیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپرِدِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپرِدِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

✉ جمیلہ۔ کراچی

O السلام علیکم بابا جانی! میں نے تین خط ارسال کیے تھے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ جب یہاں آئے تو دو خط ملے تیسرا میرے بہنوئی عبدالرحیم کے کام کے بارے میں دیا تھا۔ ڈیڑھ سال سے بے روزگار ہے میں ان کے لیے تعویذ اور وظیفہ مانگا تھا۔ آپ مہربانی کر کے ان کا جواب سچی کہانیاں میں دے دیجیے گا۔ میں ہر ماہ سچی کہانیاں پابندی سے لیتی ہوں۔

میری چھوٹی بہن صائمہ عمران کے لیے خصوصی دعا کریں۔ اس کے سسرال والوں کا رویہ صحیح ہو جائے اور وہ تندرست ہو جائے۔ آمین۔

☆ بیٹی جمیلہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بہن سے کہو روزانہ بعد نماز مغرب ایک بار سورۂ واقعہ پڑھے اور رزق میں برکت کی دعا کرے۔ بیٹی صائمہ سے کہو وہ "یا قہار" کا بہت ورد کیا کرے اور معاملات میں خاموشی رکھے۔ کچھ بھی کھانے پینے سے قبل بسم اللہ ضرور پڑھا کرے۔ کرم ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

✉ نازیہ بتول رضا، کراچی

O محترم بابا جی! السلام علیکم۔ میں آپ کا کالم بڑی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اور فائدہ بھی اٹھا چکی ہوں۔ جس طرح آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں یہ ایک قابلِ تحسین بات ہے۔ اللہ آپ کو عمر دراز عطا فرمائے۔ (آمین)

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر بہت دانے نکلتے ہیں اور اب تو کافی نشانات بھی ہو چکے ہیں۔ میرا رنگ صاف ہے اس لیے یہ نشانات مجھے بہت برے لگتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے اس کے لیے کوئی آسان وظیفہ بتائیں۔ میں نماز پابندی سے پڑھتی ہوں اور دوسرا مسئلہ میرے بالوں کا ہے جو تیزی سے گر رہے ہیں۔ برائے مہربانی اس کے لیے بھی کچھ بتائیں، میں آپ کی مشکور رہوں گی۔

☆ بیٹی نازیہ! تمہارے دونوں مسئلوں کا حل میرے پاس دوا کی صورت میں موجود ہے، پریشان مت ہو۔ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے دوا منگوانے کا طریقہ معلوم کرلو۔

✉ نزہت۔ کراچی

O محترم بزرگ! گزارش ہے کہ تین سال قبل میرا نکاح ہوا تھا۔ میرے شوہر پہلے سے شادی شدہ تھے اور ان کے دو بچے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جائیں گے۔ لیکن اب وہ میری کوئی ذمہ داری نہیں لیتے اور نہ اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔ بابا جی مہربانی فرما کر مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے شوہر میری ذمہ داری لے لیں اور اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں اور گھر والوں سے ملوالیں۔

☆ بیٹی نزہت! مسئلہ غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو تاکہ نقصان سے محفوظ رہو۔

✉ ردا۔ کوہاٹ

☆ بیٹی ردا! تمہارے خط سے تو مجھے اتنا اندازہ نہیں ہوا تھا مگر تمہاری بیٹی کے خط سے بات بالکل واضح ہوگئی۔ تمہارے مسائل کی اصل وجہ تم خود نہیں ہو، تمہاری جگہ کوئی بھی شریف خاتون ہوتی اس کا یہی حشر ہوتا۔ ہر وقت

کے ملنے تشنے، بدسلوکی کوئی بھی نہیں ہے سکتا۔ میرے حساب سے تو بیٹی تم بہت صابر اور نیک بچی ہو، جس نے اپنی اولاد کی خاطر اس قدر تکلیف دہ زندگی گزاری۔ بہر حال یقین رکھو تمہیں تمہاری اولاد کی طرف سے بے شمار خوشیاں نصیب ہوں گی۔ میں تمہیں صرف ایک نصیحت کروں گا، ہمت اور مستقل مزاجی سے حالات کا سامنا کرو جیسے کہ اب تک کرتی آئی ہو۔ تم بہت کچھ پڑھ رہی ہو جاری رکھو بس ایک اسم کا اور اضافہ کرلو۔ جس قدر ممکن ہو "یا مجیبُ" کا ورد کرو۔ انشاء اللہ اپنے اندر مثبت تبدیلی محسوس کرو گی۔

☒ لاریب۔ کوہاٹ

☆ بیٹی لاریب! ہر نماز کے بعد پڑھو "نصر من اللہ والفتح قریب" 3 تسبیح اول و آخر درود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ انشاء اللہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اس عمل کو اپنی عادت میں شامل کرلو۔

☒ ایس علوی۔ کراچی

☆ بیٹی! تم نے دانستہ لکھا ہے، دین نے تمہیں پسند کی شادی کا اختیار دیا ہے۔ تم اپنی پسند سے اپنے والدین کو آگاہ کرو اور دعا کرو کہ وہ تمہاری پسند کو قبول کرلیں، یہی درست طریقہ ہے۔ گھر کا ماحول بالکل خراب مت ہونے دو۔ دیکھو بیٹی فیصلے سب اللہ رب العزت کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا بندوں سے الجھنے کے بجائے اپنے رب کو راضی کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور پہلا کلمہ بکثرت پڑھو۔ نماز فجر اور عشا کے بعد 7-7 تسبیح یا مجیبُ کی پڑھو اور دعا کرو۔ اللہ سارے معاملات تمہارے حق میں کرے گا۔ انشاء اللہ

☒ وقار حبیب اللہ۔ ملتان

O محترم باباجی! السلام علیکم! عرض یہ ہے کہ میں اپنا آبائی مکان بیچنا چاہتا ہوں اور مکان فروخت کرکے مین روڈ کے نزدیک کمرشل پلاٹ خریدنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی بڑی ہمشیرہ سکینہ ملک کی رہائش کے اردگرد بھی رہائشی پلاٹ دیکھے ہیں۔ برائے مہربانی میری اس معاملے میں رہنمائی کریں کہ آیا میرے لیے مکان فروخت کرنا درست ہے اور اگر درست ہے تو میرے لیے رہائش کمرشل پلاٹ میں بہتر ہے یا اپنی ہمشیرہ کے نزدیک رہائش ٹھیک رہے گی۔ علاوہ ازیں میرے دو چھوٹے بھائی ذیشان احمد اور عرفان احمد بھی اپنے مکان فروخت کرکے میرے ساتھ رہائش رکھنا چاہتے ہیں۔ برائے مہربانی اس معاملے میں بھی رہنمائی فرمادیں۔ برائے مہربانی استخارہ کرکے بتادیں۔

☆ بیٹے وقار! اگر آبائی گھر بیچنا ضروری ہے تو ضرور فروخت کرو اور بدلے میں کمرشل جگہ لینا بہت مناسب ہے۔ بھائیوں کی رہائشیں قریب ہوں تو اچھا ہے مگر ساتھ رہنے میں بہت مسائل پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ سب الگ الگ رہو فی زمانہ یہی بہتر ہے۔ جس قدر ممکن ہو الحمد شریف پڑھا کرو تاکہ معاملات بخیر وخوبی طے پائیں۔

☒ سکینہ ملک۔ مقام نامعلوم۔

☆ باباجی! آداب۔ میں ایک دفعہ پھر آپ کو زحمت دے رہی ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی معاملات میں رہنمائی حاصل کرچکی ہوں۔ میرا بڑا بیٹا ICS کررہا ہے۔ اس کی مزید ایجوکیشن کے سلسلے میں رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایک کو مزید ایجوکیشن کے لیے کینیڈا بھیجنے کا ارادہ ہے اور دوسرا Math میں مزید تعلیم کا ارادہ ہے۔ اب آپ استخارہ کرکے بتائیں کہ اس کا کہاں تعلیم حاصل کرنا بہتر ہے۔ دوسرا اس کے رشتے کے سلسلے میں بھی رہنمائی کریں۔ میری بہن کی دو بڑی بیٹیاں ہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ ان میں سے کس کے ساتھ رشتہ بہتر ہے۔

☆ بیٹی سکینہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بیٹا ابھی بہت کم عمر ہے۔ شادی کا خیال تو دل سے بالکل ہی نکال دو۔ اگر وسائل باہر بھیجنے کے ہیں تو وہاں رہ کر تعلیم حاصل کرنا بہت مناسب ہے۔ بچے کا رجحان جس طرف ہے وہی کرواؤ۔ الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر بیٹے پر دم کرتی رہا کرو اور حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔

☒ مہوش۔ کراچی

☆ بیٹی مہوش! صورت حال کی سنگینی کو دیکھ کر میں تمہیں فوری طور پر تعویذ منگوانے کا مشورہ دوں گا۔ نازک معاملات میں ذرا سی بھی دیر مناسب نہیں اور پھر یہاں تو زندگیوں کا معاملہ ہے۔ فون کرکے معلومات حاصل کرو اور فوری طور پر تعویذ منگوالو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

☒ ABC۔ کراچی

☆ بیٹی! میں تمہیں صرف یہ نصیحت کروں گا کہ اپنی اولاد کی تربیت پر بھروسہ رکھو۔ تم نے اُسے نیک خطوط پر پالا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنی ماں بہنوں کی حق تلفی نہیں کرے گا، یقین رکھو تم صرف غیر محفوظ ہو رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک لڑکا اپنی بیوی، اولاد حتیٰ کہ ساس سسر سے بھی اچھا برتاؤ کرتا ہے تو وہ ماں اور بہنوں سے کیسے زیادتی کرسکتا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشا کے بعد 11-11 بار الحمد شریف پڑھو اور ترجمہ بھی ضرور سمجھو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ بیٹیوں کے رشتے کے لیے میں نصیحت کروں گا کہ تعویذ ہی منگواؤ کیونکہ کنواری بچیوں کا بہت زیادہ وظائف کرنا مناسب نہیں۔ تعویذ منگوانے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرسکتی ہو۔

☒ ریحا۔ کراچی

☆ بیٹی ریحا! تمہارے کہنے کے مطابق صرف جواب دے رہا ہوں۔ عزت اور ذلت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم درست راستے پر رہو۔ وہ تمہاری مدد فرمائے گا۔ آج کل تو علیحدگی کے بعد خواتین بھی اپنے سابقہ شوہروں پر رکیک الزامات لگانے سے نہیں چوکتیں تو مرد تو ہمارے معاشرے میں بے نکیل بیل کی طرح ہے۔ مگر تم خوف زدہ نہ ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ 21 روز تک بعد نماز فجر سورۂ توبہ پڑھو اور دعا کرو۔ تمہارے دونوں مسئلے انشاء اللہ جلد حل ہوں گے۔

☒ فہمیدہ۔ نوشہرو فیروز

☆ بیٹی فہمیدہ! مجھے کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن میں یہ نصیحت کروں گا کہ مجھ سے جلد از جلد تعویذ منگوالو۔ طریقہ کار سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرسکتی ہو۔ میں ہمیشہ یہی نصیحت کرتا ہوں کہ حد سے زیادہ وظائف کرنا مناسب نہیں۔ مستقل مزاجی سے علاج کروانا چاہیے۔ جلد بازی میں اِدھر اُدھر بھاگنے سے صرف نقصان کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ والد صاحب کی خدمت کیا کرو۔ ان کی دعائیں لو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

☒ ع۔ خ۔ کلر سیداں

☆ بیٹی! استخارہ حق میں ہے۔ اچھی طرح سے معلومات ضرور کروانا اور پھر اللہ کا نام لے کر اقرار کر لینا۔ جہاں تک تمہارے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی راضی نامے کے لیے وہ لوگ رقم کا تقاضہ کریں گے جس کا بندوبست تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ تم رقم ادا کرو گی، وہ راضی نامے پر دستخط کر دیں گے۔ یہاں تک تو وہ لوگ آگئے ہیں۔ اب معاملات تم اپنے گھر کے بڑوں سے مل کر طے کرو۔

☒ شاہین۔ حبیب آباد

O السلام علیکم! باباجی! آپ کی جتنی تعریف کریں کم ہے کیونکہ آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ انہیں اچھی اچھی باتیں سکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اَجرِ عظیم عطا کرے گا۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ میں بھی ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میرے جسم پر بلیک کلر کے ہلکے ہلکے داغ ہیں۔ اکثر پڑھا ہے کہ آپ اس کی دوا دیتے ہیں۔ مجھے بھی دوائی دے دیں جس سے یہ ختم ہو جائیں۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔ میں بہت غریب ہوں' خرچ افورڈ نہیں کرسکتی۔ آپ خود دوائی تیار کرتے ہیں یا بازار سے منگوانی پڑے گی؟ پلیز' میری مدد کریں۔ کوئی وظیفہ بھی عنایت کریں۔ ہماری دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

☆ بیٹی شاہین! تمہیں بہت سہل عمل بتا رہا ہوں۔ آج کل کریلے بازار میں دستیاب ہیں۔ ان کو لے کر اچھی طرح دھولو پھر کاٹ کر ڈھیر سارے پانی میں ابالنے رکھ دو۔ جب پانی اُبل اُبل کر آدھا رہ جائے' تب صاف بوتل میں پانی بھر لو اور نہار منہ آدھا گلاس پانی پی لو۔ ہر قسم کے داغ اور دھبوں کے لیے یہ عمل بہت مفید ہے۔ پانی پینے سے قبل بسم اللہ ضرور پڑھنا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ صباحت۔ راولپنڈی

☆ بیٹی صباحت! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بعض اوقات بہت حساس ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ معاملات اللہ کے سپرد کرنے کی عادت ڈالو' بہت سکون ملے گا۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ بھائی کی کامیابی کی' اپنے لیے ضرور گڑگڑا کر دُعا کیا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☒ فرحین منظور۔ سرگودھا

O باباجی! میں بہت عرصے سے آپ کا کالم پڑھ

رہی ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کا سمجھانے کا انداز اتنا دھیما اور متین ہے کہ لگتا ہے کہ آپ سمجھانے والے کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔ آپ بھی کسی سے ناراض نہیں ہوتے نہ ہی کسی معاملے میں سرزنش کرتے ہیں۔ بابا جان! اصل دکھ تو اسی بات کا ہے کہ بڑے اب بڑوں کی طرح نہیں نہ ان میں مستقل مزاجی ہے اور نہ صبر اور نہ ہی چھوٹوں کی غلطیوں کو درگزر کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں اپنے والدین کو دکھ دینے کا سبب بنی مگر معافی کے دروازے تو بند نہیں کرنے چاہئیں۔ بابا جی! میں نے اپنی پسند سے شادی کی۔ میرے شوہر مالی اعتبار سے بہت مضبوط نہیں تھے یہی کی مخالفت کا سبب بنی حالانکہ بابا جی! میرے شوہر اور میرے سسرال والے میری اور میرے گھر والوں کی بہت عزت کرتے ہیں، مجھے بھی کوئی طعنہ یا دکھ دینے والی بات نہیں کی۔ اتنے اچھے لوگوں کو صرف پیسے کی خاطر چھوڑ دینا، مجھے مناسب نہیں لگتا۔ میرے دو بچے ہیں، میں اپنے گھر میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ بس اپنے میکے والوں کی سختی سے دل دُکھتا ہے۔ بچے بھی نانا نانی، خالہ ماموں جیسے رشتوں کو ترستے ہیں۔ بابا جی! آپ بتائیے کیا میں سزا کے لائق ہوں؟ آپ مجھے وضاحت سے جواب دیں تاکہ مجھے سکون حاصل ہو۔

☆ بیٹی فرحین! ہر والدین کی طرح تمہارے والدین کی بھی خواہش ہوگی کہ اُن کی اولاد اُن کے فیصلوں پر سر جھکا دے۔ تمہارے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ بیٹی! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچے جب بڑے بڑے فیصلے کرتے ہیں تو نتائج اکثر برے نکلتے ہیں مگر تم خوش قسمت ہو کہ ایسا نہیں ہوا۔ میں تمہیں یہ نصیحت کروں گا کہ اپنے والدین سے معافی مانگ لو اور اُن سے کہو کہ مجھے آپ کی دُعاؤں اور محبت کی ضرورت ہے۔ تمہارے والدین کو بھی چاہیے، اتنا سخت رویہ نہ رکھیں۔ بہرحال اولاد تم اُن ہی کی ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت یَا اللّٰہُ کا وِرد کیا کرو۔ اپنے شوہر اور سسرال والوں کی خوب خدمت کرو۔ بے شک وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔

✉ سلومی۔ ڈی جی خان

○ بابا جی! میری عمر پچیس سال ہے، شادی شدہ ہوں اور ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ میرے دو مسئلے بہت اہم ہیں، پہلا تو یہ کہ میرا وزن بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ کھانے میں بے انتہا احتیاط کے باوجود کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ وزن کم کرنے کی دوائی دیتے ہیں۔ مجھے دوا منگوانے کا طریقہ بتا دیجیے۔ دوسرا مسئلہ بہت شدید نوعیت کا ہے۔ بابا جان! میرے سسرال والے ہر وقت میری کاٹ میں رہتے ہیں۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ یہ میں روایتی بہوؤں والی بات کر رہی ہوں بلکہ اصل میں ایسا ہی ہے۔ میرے شوہر میرا بہت خیال رکھتے ہیں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ اللہ کا شکر ہے۔ بس یہی بات میرے سسرال والوں کو پسند نہیں۔ اب مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے میں ہمیشہ حاسدوں سے محفوظ رہوں۔

☆ بیٹی سلومی! اللہ تمہیں ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔ حاسدوں سے بچنا چاہتی ہو تو نماز کی پابندی رکھو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ دن میں 3 بار آیت الکرسی ضرور پڑھو۔ دوا میں تیار کر دوں گا۔ طریقۂ کار تم ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو۔ بیٹی! ایک نصیحت کروں گا، اللہ نے تمہیں اچھا شوہر، اولاد کی نعمت اور بھرپور زندگی دی ہے لہٰذا دل میں وہم مت پالو اور زندگی کی ہر سانس کے ساتھ اللہ کا شکر اَدا کرتی رہا کرو۔ اللہ کو اپنے سامنے جھکا سر بہت پسند ہے۔

✉ جمشید احمد۔ کوئٹہ

○ بابا جان! میری والدہ نے کہا ہے کہ میں آپ کو اپنے مسئلے کے بارے میں خط لکھوں۔ اس وقت میری عمر ستائیس سال ہے، ایک بیٹی کا باپ ہوں، بظاہر کوئی پریشانی نہیں مگر بابا جان! مجھے بھولنے کی بیماری ہوگئی ہے۔ پہلے یہ تکلیف کم تھی، اب بہت بڑھ گئی ہے۔ میں ضروری کام بھی بھول جاتا ہوں۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ آج سے 4 سال پہلے میرا پشاور جاتے ہوئے شدید ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ 15 دن بے ہوش رہا، سر پر دو جگہ ٹانکے آئے تھے۔ اس کے بعد سے اکثر سر میں درد رہنے لگا۔ آہستہ آہستہ درد اتنا ہونے لگا کہ اس وقت نہ تو مجھے کچھ دکھائی دیتا تھا نہ سنائی۔ سال بھر یہ کیفیت رہی۔ اب درد نہیں ہوتا مگر یادداشت لگتا ہے، ختم ہو رہی ہے۔ جو لوگ میری اس تکلیف سے واقف نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا

ہوں کاروبار میں فائدے کے لیے حالانکہ باباجان! میں اپنی اس کمزوری کی وجہ سے بہت چڑچڑا ہورہا ہوں۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں‘ میری مدد کریں۔

☆ بیٹے جمشید! اللہ تمہیں مکمل شفاء دے۔ یقیناً تمہاری یہ کیفیت اس چوٹ کی وجہ سے ہی ہے۔ بیٹے! سب سے پہلے تو اپنی والدہ سے کہو ہر ماہ تمہارے اوپر سے حسب توفیق صدقہ نکال دیا کریں۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۂ یٰسین پڑھ کر پانی پر دَم کرو اور یہ پانی پی لیا کرو۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ 3 ماہ کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

✉ شازیہ۔ حیدرآباد

O باباجی! میرا نام حرا ہے۔ میری عمر 17 سال ہے اور تین سال سے میری دور کی نگاہ بہت کمزور ہے۔ ایک کی زیادہ کمزور ہے اور ایک کی کم۔ چشمے کے بغیر مجھے بالکل بھی نظر نہیں آتا۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میری دور کی نگاہ بالکل ٹھیک ہوجائے۔ میرے بال بھی بہت کمزور ہوگئے ہیں اور جسم بھی کافی بڑھ رہا ہے۔ آپ کے آفس سے کیا یہ دوائیاں ملتی ہیں اور ہدیہ کیا ہے؟ اور طریقہ استعمال بھی بتادیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ دُعاؤں کی طلب گار۔

☆ بیٹی شازیہ! اللہ تمہیں کامیابیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ سونف بہت استعمال کیا کرو‘ اس کے علاوہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے پوچھ کر وٹامن A کا استعمال شروع کرو۔ اَدویات دفتر سے دستیاب ہیں‘ فون کرکے طریقہ کار معلوم کرلو۔ یَانُورُ کا بہت وِرد کیا کرو۔

✉ فاخرہ۔ کراچی

O مولانا صاحب! میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں لیکن اس کی منگنی کہیں اور ہوگئی ہے جبکہ میں اسے بہت پہلے سے پسند کرتی ہوں اس لیے چاہتی ہوں کہ اس سے شادی ہوجائے اور میں اس کے گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ بھی ہوجاؤں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے گھر سے رشتہ آئے۔ مولانا صاحب! میرے ماں باپ دونوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ خدا کے لیے آپ میری مدد کریں اور کوئی تعویذ دے دیں جس کے ذریعے آسانی سے بغیر کسی پریشانی کے‘ میری شادی وہیں ہوجائے اور خوشگوار زندگی گزرے۔ آپ جواب ایک ہفتے کے اندر اندر دے دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ شکریہ!

☆ بیٹی فاخرہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ ہر نماز کے بعد 41 بار سورۃ النساء کی ابتدائی دو آیات پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

✉ ج۔ب۔ لاہور

O پیارے باباصاحب! السلام علیکم! باباصاحب! کافی عرصے کے بعد میں آپ سے مخاطب ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ عرصے پہلے میں اپنی خواہش کے مطابق کہ میری شادی غیروں میں ہو‘ اس کے لیے وظیفہ منگوایا تھا۔ وظیفے پڑھنے کے بعد ایک رشتہ آیا۔ میرا کلاس فیلو اور بہت اچھا دوست بلکہ بھائیوں جیسا شخص اسی کے توسط سے یہ رشتہ آیا۔ بات چیت ہوئی۔ انہوں نے تصویر مانگی اور لڑکے کی تصویر دی تاکہ ایک دوسرے کے گھر والے پہلے تصویر کے ذریعے پسند کریں پھر بات چیت کی جائے۔ اس سلسلے میں استخارہ بھی کیا گیا‘ وہ بھی درست نکلا اور ایک دوسرے کا گھر بھی پسند کیا گیا یعنی کہ میری تصویر لڑکے کے گھر والوں کو پسند آئی اور میرے گھر والوں کو لڑکا پسند آیا۔ لڑکے کی بہن نے میرے جاننے والے یعنی رشتے کرانے والے شخص کو یہ کہا کہ ہم لڑکی کے گھر والوں سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ بات طے کرسکیں پھر اس شخص نے دن بتایا لیکن انتظار کرنے کے بعد بھی وہ لوگ نہ آئے اور نہ اس بیچ والے شخص سے رابطہ ہوا۔ آخر ایک ہفتے کے بعد جب رابطہ ہوا تو اس شخص نے کہا کہ میری بیٹیاں بیمار تھیں جس کی وجہ سے رابطہ نہ ہوسکا۔ اب میں دن کا فائنل کرکے آپ لوگوں کو بتاتا ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے میری بہن کو اپنے آفس میں بلاکر کہا کہ اس کے گھر والوں نے نہیں لیکن لڑکے نے یہ شرط عائد کی ہے کہ جو شخص میری طلاق یافتہ بہن سے شادی کرے گا‘ میں اسی گھر میں شادی کروں گا حالانکہ میں نے رشتے کرانے والے شخص کو بتایا تھا کہ میرے تین بھائی ہیں اور وہ تینوں شادی شدہ ہیں۔ اس ضد کی وجہ سے لڑکے نے انکار کردیا حالانکہ پہلے وہ راضی تھا لیکن

بعد میں کیا ہوا؟ مجھے علم نہیں۔ جس کی وجہ سے میں ذہنی طور پر خاصی ڈسٹرب رہی ہوں۔ اس بات کو ختم ہوئے ایک ماہ ہوگیا ہے لیکن اس نے دوبارہ رابطہ نہ کیا حالانکہ شادی کی ساری بات لڑکے والوں کو پہلے مجھ سے کرنی تھی' بعد میں گھر والوں سے۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فرمائے۔ یہ تم کہہ رہی ہو کہ وہ شریف لوگ تھے حالانکہ شریف لوگ ایسی حرکت نہیں کرتے۔ لڑکی کی بہت عزت ہوتی ہے اور اچھی فیملی سے تعلق رکھنے والے اپنی ہونے والی بہو یا کسی کی بھی بہن یا بیٹی کے ساتھ خرید وفروخت والا رویہ نہیں رکھتے۔ بات ہمیشہ واضح اور صاف کرنی چاہیے۔ اصل میں جو شخص درمیان میں تھا' غلطی یا جان بوجھ کر اس نے ایسا کیا ہے تاکہ دونوں طرف سے فائدہ اٹھالے۔ بیٹی! میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس معاملے میں خاموشی اختیار کرو اور آیندہ رشتے کی بات چیت بڑوں میں ہونے دیا کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد تین تسبیح یَا رَحمٰنُ یَا رَحِیمُ کی پڑھو اول وآخر دُرود شریف۔ مدت ایک ماہ ہے۔

✉ صالحہ۔ جمرود روڈ، پشاور

☆ بیٹی صالحہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ پہلے سے طے کرلینا کہ سسرال والے ظالم ہی ہوں گے' غلط ہے۔ انسان اپنے رویے سے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ تمہاری سوچ بہت اچھی ہے کہ سسرال والوں کو لے کر چلنا چاہتی ہو تو بیٹی! ایسا ہی ہوگا۔ جس طرح اپنی ماں سے محبت کرتی ہو' اُن کی ڈانٹ کا برا نہیں مانتیں اور کسی سے شکوہ نہیں کرتیں' ایسے ہی ساس کے ساتھ رہنا۔ کوئی مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ تم اچھی ہوگی تو ہر شخص بھی تم سے اچھا ہی رہے گا۔ نماز کی پابند ہو' بہت اچھی بات ہے۔ سورۃ الفاتحہ بہت پڑھا کرو۔ بہن سے کہو رات کو 6-5 بادام پانی میں بھگو کر نہار منہ کھالیا کرے۔ وظیفہ اُنہی صفحات پر شائع کیا جارہا ہے' استفادہ حاصل کرو۔

✉ نورین۔ کراچی

☆ بیٹی نورین! مجھے تمہاری پریشانیوں کا اندازہ ہے حالانکہ خط تم نے بہت سنبھل کر لکھا ہے۔ جس سے مجھے تمہاری والدہ کی بہترین پرورش کا اندازہ ہوا۔ بیٹی! میں خود اِس رویے کے شدید خلاف ہوں کہ شوہر' بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر صرف کمانے کی غرض سے دور رہے۔ بہرحال تم نے بہت طویل عرصہ انتہائی صبر اور مستقل مزاجی سے گزارا ہے۔ اللہ تمہیں اس کا بہت صلہ دے گا۔ ہر نماز کے بعد 101 بار یا سمیع یا حفیظ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

✉ عابدہ۔ رحیم یار خان

O محترم باباجی! السلامُ علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کے درجات میں اضافہ کرے۔ باباجی! جس طرح آپ دُکھی انسانیت کی مدد کلام پاک سے کرتے ہیں اور صحیح رستہ دکھاتے ہیں' اللہ آپ کو اس کا ضرور اَجر دیں گے۔ باباجی! پہلے بھی میں نے آپ سے وظائف منگوائے اور اُن کو پڑھنے سے مجھے کامیابیاں ملیں۔ اب بھی باباجی! ایک مسئلہ ہے۔ باباجی! میری شادی سندھ سے پنجاب ہوگئی ہے۔ میں شادی سے پہلے نوکری کرتی تھی۔ اَب میں نے ٹرانسفر کے لیے درخواست دی ہے۔ بہت سا کام ہوگیا ہے' اَب تھوڑا سا رہ گیا' وہ نہیں ہورہا۔ باباجی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میری اپنے علاقے کے اسپتال میں بدلی ہوجائے اور آپ استخارہ کرکے بتائیں کہ شادی کے بعد نوکری میرے لیے بہتر ہے یا نہیں؟ میں نے دو تین وظائف بھی پڑھے لیکن کام وہیں رکا ہوا ہے۔ باباجی! میں روز روز اپنی نوکری کی وجہ سے سندھ' پنجاب آجا نہیں سکتی اس لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ کام ہوجائے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔ آنے والے شمارے میں اس کا جواب دے دیں۔

☆ بیٹی عابدہ! اللہ تمہارا مسئلہ حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد 77-77 بار سورۃ اخلاص پڑھو اور دُعا کرو۔ دورانِ وظیفہ نماز بالکل قضا نہ ہو۔ مدت 21 روز ہے۔

✉ محمد افسر۔ گجرات

O محترم باباجی! السلامُ علیکم! اللہ آپ کو خوش رکھے اور لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ آپ یونہی ضرورت مندوں کے کام آکر ان کی دُعائیں سمیٹتے رہیں۔ محترم باباجی! میں جو مسئلہ آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں' وہ میری بڑی بہن کا ہے۔ میری بہن کافی عرصے سے آنکھوں کی

تکلیف کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ یہ تکلیف انہیں چھ سات سال سے ہے۔ وہ ہاتھ سے سلائی کا کام بھی کرتی ہیں۔ باباجی! بدقسمتی سے وہ بھری جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ اُن کے دو بچے ہیں۔ باباجی! وہ بتاتی ہیں کہ اُن کی آنکھوں میں ہر وقت دھندسی رہتی ہے اور صاف نظر نہیں آتا۔ کبھی اُن کو گول دائرے سے نظر آنے لگتے ہیں جو حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ہر وقت آنکھوں میں تکلیف رہتی ہے۔ وہ ہاتھ سے سلائی کر کے گزر بسر کرتی ہیں۔ وہ اس تکلیف کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ باباجی! آپ برائے مہربانی ان کا کوئی علاج بتائیں۔ میری باجی اَن پڑھ ہیں۔ وہ قرآنِ شریف بھی نہیں پڑھ سکتیں۔ اس لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو وہ آسانی سے کرسکیں یا پھر آپ اجازت دیں تو میں اُن کے لیے وظیفہ کروں۔ باباجی! دوسرا مسئلہ اُن کے بیٹے کا ہے جس کی عمر تقریباً سات سال ہوگی مگر وہ عام بچوں کی طرح بڑا نہیں ہورہا۔ اس کا جسم کافی کمزور ہے لیکن باباجی! وہ بڑا شرارتی ہے۔ اپنی ماں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ اس کی ماں اس کی صحت کی وجہ سے کافی پریشان ہے۔ اس کا ذہن بھی کافی کمزور ہے۔ اسکول بھی شوق سے نہیں جاتا۔ ماں زبردستی بھیج دیتی ہے۔ آج کل اسے جلاب لگے ہوئے ہیں جو کہ ختم نہیں ہورہے۔ وہ بہت کمزور ہوگیا ہے۔ باباجی! اس کا باپ بھی بیمار تھا اور بیماری کی وجہ سے ہی اس کا انتقال ہوا تھا۔ یہ بچہ بھی صحت مند نہیں رہتا۔ آپ اس کا کوئی ایسا علاج یا وظیفہ بتایئے کہ وہ صحت مند رہے، ماں کو تنگ نہ کرے اور شوق سے پڑھے۔ مجھے امید ہے کہ آپ جلد از جلد اس خط کا جواب دیں گے۔

☆ بیٹے افسر! اللہ تمہاری بہن اور بیٹے دونوں کو مکمل شفاء عطا فرمائے۔ آنکھوں کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ بٹی رخسانہ کی آنکھوں میں موتیا اتر رہا ہے جو آپریشن سے ٹھیک ہوجاتا ہے۔ بہن سے کہو بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دم کرے۔ کیلے کو درمیان میں سے کاٹ کر اس میں اسپغول کی بھوسی بھرے پھر دونوں ٹکڑوں کو جوڑے یہ کیلا بیٹے کو بسم اللہ پڑھ کر کھلا دے۔ یہی عمل دن میں پھر دہرائے یعنی دو بار کرے۔ انشاء اللہ، ضرور افاقہ ہوگا۔ طبیعت سنبھل جائے پھر مجھے بتائے میں مزید ہدایات دوں گا۔

✉ عالیہ۔ جھنگ

☆ بٹی عالیہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تمہاری سوچ بالکل درست ہے مگر بٹی! تمہیں اپنے شوہر کے مطابق ہی چلنا ہوگا۔ مرد فہم و فراست میں خواتین سے زیادہ ہوتے ہیں۔ تم اپنے کام اور بچوں پر توجہ دو۔ سورۃ واقعہ پڑھتی رہو۔ ادویات منگوانے کے لیے تمہیں جوابی لفافہ ارسال کرنا ہوگا۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر ضرور دم کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ مدت 41 دن ہے۔

✉ عریشہ۔ کراچی

☆ بٹی عریشہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ یاد رکھو، جو لوگ اللہ کی بجائے بندوں پر بھروسا رکھتے ہیں، وہ سوائے دکھ اور پریشانی کے کچھ نہیں پاتے۔ بہرحال میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔

✉ محسن سلطان۔ سیالکوٹ

O باباجی! میں بہت پریشان ہوں۔ میں باہر جانا چاہتا تھا اور اِس سلسلے میں، میں نے آپ سے استخارہ کروایا تھا کہ کیا میں ایجنٹ کو پیسے دے دوں؟ باباجی! میں بہت شرمندہ ہوں، آپ کے منع کرنے کے باوجود میں نے پیسے دیئے اور وہ لے کر غائب ہوگیا۔ باباجی! میرے گھر والے بھی مجھ سے ناراض ہیں کیونکہ وہ بھی مجھے منع کررہے تھے۔ ابا نے تو مجھ سے بات چیت بالکل بند کردی ہے۔ میں اپنی حرکت پر واقعی میں بہت شرمندہ ہوں۔ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ میں اِس امید سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں کہ آپ مجھے ضرور معاف کردیں گے۔

☆ بیٹے محسن! اللہ تمہیں عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے......! بڑے، بچوں کو نصیحت اپنے تجربے کی روشنی میں کرتے ہیں لہٰذا جو بڑوں کی بات مانتے ہیں، وہ پریشانی سے محفوظ رہتے ہیں۔ پیسے تو تمہیں اب واپس نہیں ملیں گے۔ بہرحال تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، یہی بہت ہے۔ زندگی میں آیندہ والدین کی نافرمانی مت کرنا۔ اپنے والدین سے معافی مانگو اور اپنے ملک میں ہی رہ کر

کمانے کی کوشش کرو۔ اللہ تمہیں ضرور کامیابی عطا فرمائے گا۔ نمازِ فجر کے بعد سورۃ آلِ عمران، آیت 26...... 300 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

✉ یاسمین۔ دہاڑی

○ بابا جی! میری شادی کو 9 سال ہو گئے ہیں مگر میں ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میرے شوہر باہر ملک میں ہوتے ہیں۔ سال بھر کے بعد 2 سے 3 مہینے کے لیے آتے ہیں۔ میں جب بھی ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہتی ہوں تو میری بات پر توجہ نہیں دیتے۔ انہیں بچوں کا کوئی خاص شوق بھی نہیں مگر بابا جی! میں بہت دُکھی رہتی ہوں۔ میری بہنوں کے تین تین اور چار چار بچے ہیں۔ میں اللہ میاں سے دُعا کرتی ہوں کہ مجھے ایک مکمل صحت اور زندگی والا بچہ عطا کرے۔ بابا جی! میں نے اکثر پڑھا ہے کہ آپ اولاد کے لیے تعویذ دیتے ہیں، مجھے بھی تعویذ دے دیجیے۔ میں آپ کی ممنون رہوں گی۔

☆ بیٹی یاسمین......! اللہ تمہیں نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے۔ بیٹی......! نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تعویذ کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے اپنی والدہ اور شوہر اور شوہر کی والدہ کے نام ارسال کرو۔ تعویذ کے بارے میں کسی کو مت بتانا۔ حمل ٹھہرتے ہی مجھے مطلع کرنا۔ آیندہ خط مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ لکھو۔

✉ صبیحہ۔ کھاریاں

○ بابا جان! میں نے آپ سے رشتے کے سلسلے میں وظیفہ لیا تھا۔ وظیفہ ابھی مکمل نہیں ہوا مگر میرا ایک بہت اچھا رشتہ آ گیا ہے۔ دونوں طرف کے بڑے تیار ہیں۔ آیندہ چند دنوں میں میری بات بھی طے ہو جائے گی۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور یہ بھی پوچھنا تھا کہ کیا وظیفہ مکمل کروں یا درمیان میں چھوڑ دوں؟

☆ بیٹی صبیحہ! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ صرف اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہاری دُعا اتنی جلدی قبول فرمائی۔ نماز کبھی ترک مت کرنا۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرنا اور خوشی اور دکھ دونوں میں ہمیشہ صابر و شاکر رہنا۔ وظیفہ ترک کر دو۔

✉ انجم۔ مانسہرہ

○ محترم بابا جی! میں آج آپ کی خدمت میں اپنے تین اہم مسئلے لے کر حاضر ہوئی ہوں جن کی وجہ سے میں کافی پریشان ہوں، برائے مہربانی مجھے اس پریشانی سے نجات دلائیں۔ میری نندوں کے اچھے رشتے آئیں اور تین مہینے کے اندر اندر دونوں کی شادی ہو جائے۔ مجھ سے میرے سسرال والے بہت محبت کرنے لگ جائیں۔ ان کے دلوں میں میرے لیے، میرے بچوں اور شوہر کے لیے جتنی نفرت ہے، وہ محبت میں تبدیل ہو جائے اور میرے بچے نافرمان ہیں، وہ بھی میری بات ماننے لگیں۔ میرے بچے میرے سسرال والوں کی طرح ضدی ہیں۔ ان دونوں کی ضد ختم ہو جائے اور میرے لیے ان کے دل میں احساس پیدا ہو۔ میرے شوہر نے ابھی نئی دکان لی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے کام میں برکت ہو اور دکان چل پڑے۔ آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ پلاٹ دوگنی قیمت میں جلد از جلد بک جائے جو کہ ایک سال سے نہیں بک رہا ہے۔ رسالے میں میرے خط کا جواب زینب، گوجرانوالہ کے نام سے دیں۔ میں بہت پریشان ہوں، مجھے جلد از جلد جواب دیں اور میرا نماز کی طرف سے بالکل دھیان ہٹ گیا ہے۔ جب بھی پڑھنے لگتی ہوں، برے برے خیالات آتے ہیں۔ میں نمازی، پرہیزگار بننا چاہتی ہوں۔ نظر دن بدن بہت کمزور ہو رہی ہے۔ اس کے لیے کوئی ٹوٹکہ بتائیں۔ آپ کی بیٹی کو ان سب مسائل کا سامنا ہے جو کہ صرف آپ کی دُعاؤں سے ختم ہو سکتے ہیں۔

☆ بیٹی انجم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! شادی کے سلسلے میں سورۃ احزاب پڑھنا بہت مبارک ہے۔ نظر کی کمزوری کے لیے سونف بہت کھایا کرو اور رَبّنا نُورٌ عَلیٰ نُور کا کثرت سے وِرد کرو۔ جہاں تک روزی میں برکت کا تعلق ہے تو بیٹی! نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ بچے ماحول کا اثر لیتے ہیں۔ اُن سے نرم رویہ رکھو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

✉ حنا ملک۔ فیصل آباد

☆ بیٹی حنا! اللہ تمہارے شوہر کو مکمل شفاء دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! منصور

کے اعصاب کمزور ہوتے جا رہے ہیں اس لیے طبیعت دن بہ دن گر رہی ہے۔ میں بہت سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ اُن سے کہو' دن میں کسی وقت بھی ایک بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار کرلیا کرے اور بے فکر ہوجائے۔ دنیا کی کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ آیت الکرسی صبح کام پر جانے سے قبل پڑھنا بہت مناسب ہوگا ورنہ جب بھی یاد آئے' پڑھ لیا کرے۔ جب بندہ اپنے آپ کو اللہ کی امان میں دے دیتا ہے' پھر دنیاوی مشکلات اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ بٹی! تم بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ واقعہ پڑھو اور دُعا کرو رزق میں برکت کی۔ بچوں کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آؤ' وہ حالات کی وجہ سے نافرمان ہو رہے ہیں۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

✉ ارجمند۔ چک، ایمن آباد

○ میں نے آج پہلی بار بہت امید سے خط لکھا ہے۔ میں اور میرے بہن بھائی ابھی چھوٹے تھے کہ ہمارے والد صاحب نے دوسری شادی کرلی اور ہم سے تعلق ختم کردیا۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن ہیں۔ ہماری ماں نے بہت دکھ جھیل کر ہمیں پالا پوسا' بڑا کیا' آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب کچھ دے دیا ہے لیکن ہمارے لیے ایک مسئلہ بہت ہی بڑا مسئلہ بن کر کھڑا ہوگیا ہے۔ شروع میں ہماری خالہ نے میری بہن کے ساتھ اپنے بیٹے کی منگنی کی لیکن اب اُس نے منگنی توڑ کر میری چچی کی بیٹی کو بہو بنانے کا اعلان کیا ہے مگر اب ہم بہت زیادہ پریشان ہیں اس لیے کہ ہماری بہن کے لیے ایک اور بہت اچھا رشتہ آیا ہے لیکن اس میں بہت سے لوگ رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ ہماری خالائیں' ماموں' چچا سب ہم سے تعلق ختم کر گئے ہیں۔ بابا جی! ہم بہت زیادہ پریشان ہیں' ہم چاہتے ہیں کہ جو رشتہ آیا ہے' ہماری بہن کی شادی وہاں جلد از جلد ہوجائے۔

☆ بیٹے ارجمند! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ اپنی والدہ سے کہو' نماز فجر' ظہر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح ''یاحی یاقیوم'' پڑھیں اور دُعا کریں۔ مدت 2 ماہ ہے۔

☆☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

فرمانِ الٰہی

ادب کا مہینہ اَدب کے مہینے کے مقابل ہے اور اَدب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلہ ہیں، پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے O اَور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو۔ بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے O

(سورۃ البقرہ 2.....ترجمہ: آیات 194 تا 195)

دنیا میں سزا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص دنیا میں کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے اور اسے اس کی سزا بھی مل جائے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہت عادل ہے کہ اپنے بندے کو دوبارہ سزا دے اور جو شخص دنیا میں کوئی گناہ کر بیٹھے اور اللہ اس کی پردہ پوشی کرتے ہوئے اسے معاف فرمادے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہت کریم ہے کہ جس چیز کو وہ معاف کرچکا ہو، اس کا معاملہ (آخرت میں) دوبارہ کھولے۔“ 1365

(مسند احمد بن حنبل)

مینارۂ نور

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ درویشی سے پہلے ایک بہت بڑے ملک کے بادشاہ تھے لیکن اس وقت بھی رات دن سوچتے رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے قریبی تعلق کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ ایک رات کو وہ شاہی محل میں اپنے کمرے میں بستر پر آرام کررہے تھے جبکہ چاروں طرف سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں محل کی چھت پر لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی تو وہ اُٹھ کر چھت پر گئے۔ وہاں انہوں نے نورانی شکلوں والے آدمی دیکھے۔ پوچھا۔ ”تم کون لوگ ہو اور اس وقت یہاں کیا کررہے ہو؟“

انہوں نے عاجزی سے گردنیں خم کرکے کہا۔ ”اے بادشاہ! ہم اپنی گم شدہ اونٹنی کو تلاش کررہے ہیں۔“

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”اونٹنی بھلا شاہی محلات کی چھت پر کیسے چڑھ سکتی ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”اے بادشاہ! اگر اونٹنی محل کی چھت پر نہیں چڑھ سکتی تو تو کیسے شاہی تخت پر بیٹھ کر خدا کو ڈھونڈ سکتا ہے؟“

بادشاہ نے یہ بات سنی تو اس نے فوراً ارادہ کرلیا کہ وہ تخت و تاج کو چھوڑ کر درویشی اختیار کرے گا کیوں کہ تخت پر بیٹھ کر خدا سے نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے محنت شاقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

مرسلہ: آصف خان، ٹنڈو الہ یار

چھوٹا کام

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طور پر اللہ تعالیٰ ہی

کرتا ہے لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاڈلے تو ہیں مگر اتنے بھی نہیں، جتنے ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سردیوں میں رضائی مانگے تو اس کے لیے رضائی کا بندوبست ضرور کریں کیوں کہ اسے ضرورت ہوگی لیکن اگر وہ یہ شرط عائد کردے کہ مجھے فلاں قسم کی رضائی دو تو پھر اس کو گھر سے باہر نکال دو کیوں کہ اس طرح اس کی ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔

ایک مرتبہ جب ہم بابا جی کے پاس ڈیرے پر گئے تو انہوں نے ہمیں مٹر چھیلنے پر لگا دیا۔ میں نے تھری پیس سوٹ پہن کر ٹائی لگا رکھی تھی لیکن مٹر چھیل رہا تھا حالاں کہ میں نے ساری زندگی مٹر نہیں چھیلے تھے، پھر انہوں نے لہسن چھیلنے پر لگا دیا اور میرے ہاتھوں سے بو آنا شروع ہوگئی، پھر حکم ہوا کہ میتھی کے پتے صاف کرو۔ اس مشقت سے تو اب خواتین بھی گھبراتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زونیرا، اس کو کوئی چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھئی یہ خط پہنچا دینا تو کہتی ہے کہ بابا یہ معمولی سا کام ہے، مجھے کوئی بڑا سا کام دیں، اتنا بڑا کہ میں آپ کو وہ کر کے دکھاؤں (کوئی شٹل میں جانے جیسا کام) میں نے کہا، یہ خط تو پہنچا دیتی۔ کہنے لگی ''یہ تو بابا جی! بس پڑا ہی رہ گیا۔'' چھوٹے چھوٹے کاموں سے باپ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈسپلن آئے۔

اشفاق احمد کی کتاب ''زاویہ'' سے اقتباس

لفظوں کی جادوگری

لفظوں میں بڑی جان ہوتی ہے۔ یہ دلوں کو موہ لیتے یا دشمن بنا دیتے ہیں۔ لفظوں میں شہد ہوتا ہے اور کڑواہٹ بھی ہوتی ہے۔ آب حیات بھی ہوتا ہے اور زہر بھی۔ لفظوں میں کسی محلول کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لہجے اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔

آپ لفظوں کی حرمت کا خیال رکھیں گے تو فائدے میں رہیں گے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ناقابل تلافی نقصان آپ کا مقدر بن جائے گا۔

مرسلہ: حیات خان، بونیر

روک لو

ابھی کچھ ساعتیں ہیں
ابھی کچھ لمحے ہیں باقی
رات کی ہتھیلی پر
اگر وہ چلا گیا تو
زندگی گہرے نیلے پانیوں میں
ڈوب جائے گی
چاند روٹھ جائے گا
چاندنی مرجائے گی
ابھی کچھ لمحے ہیں باقی
زندگی کی دسترس میں
اُسے روک لو

شاعر: روحان دانش

رفتار

کوئٹہ ایکسپریس کے ایک ڈبے میں سیاسی بحث جاری تھی۔ اس دوران ایک صاحب جوش وخروش سے بولے۔ ''کیا آپ لوگوں کو کچھ اندازہ ہے کہ اگلے دس برسوں میں ہم کہاں ہوں گے؟''

ایک کونے میں بیٹھے ہوئے صاحب معصومیت سے بولے۔ ''اس ٹرین کی رفتار کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ کوئٹہ کے آس پاس ہی ہوں گے۔''

مرسلہ: محمد ثاقب، کراچی

بلا ضرورت

ایک عورت پہلی مرتبہ اپنے شوہر کے ساتھ کرکٹ میچ دیکھنے اسٹیڈیم گئی۔ وہ کھیل کے دوران

خاموشی سے اپنے شوہر کا تبصرہ سنتی رہی۔ ایک موقع پر اس کا شوہر اُچھل اُچھل کر تالیاں بجانے لگا تو عورت نے دریافت کیا۔ ''کیا ہوا آخر......؟''

''اوہ تم نے دیکھا نہیں، فیلڈر نے کتنی مہارت سے کیچ پکڑا ہے؟'' شوہر نے جذباتی انداز میں کہا۔

''تو اس میں اتنا چلّانے کی کیا بات ہے؟'' وہ عورت سادگی سے بولی۔ ''وہ وہاں کھڑا کس لیے ہے؟''

مرسلہ: راشدہ اعجاز، اسلام آباد

دھوکا

ایک خاتون نے ہمدردانہ لہجے میں اپنی پڑوسن سے پوچھا۔ ''ارے بہن! میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیٹی کی منگنی ٹوٹ گئی ہے، آخر کیا بات ہوئی؟''

''کیا بتاؤں بہن! ہمارے ساتھ تو بڑا دھوکا ہو گیا......'' پڑوسن نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ ''ہمیں بتایا گیا تھا کہ لڑکا گردوں، پھیپھڑوں اور جگر کا اسپیشلسٹ ہے۔''

''اوہو......! یہ تو ان لوگوں نے واقعی بڑا جھوٹ بولا۔'' خاتون نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''کوئی بھی ڈاکٹر تینوں چیزوں کا ایک ساتھ تو اسپیشلسٹ نہیں ہوسکتا، وہ ان میں سے صرف کسی ایک چیز کا اسپیشلسٹ ہوگا؟''

''ارے بہن! ایسا ہوتا تب بھی غنیمت تھا، ہم ہرگز منگنی نہ توڑتے۔ ہمیں تو بہت دیر میں پتا چلا کہ لڑکا کم بخت مارا قصاب کی دکان پر نوکر تھا۔'' پڑوسن نے رندھے ہوئے لہجے میں بتایا۔

مرسلہ: پھول رانی، گھوٹکی

ماچو پیچو، پیرو

کہا جاتا ہے کہ انکا سلطنت کے بانی، پاچا کوٹک یوپانکی نے بادلوں میں ایک شہر، ماچو پیچو (پرانا پہاڑ) بنایا، جو پیرو میں واقع ہے۔ یہ غیر معمولی شہر سطح سمندر سے 2350 کی بلندی پر واقع ہے اور اروبامبا دریا کے اوپر امیزون کے گھنے جنگلوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ بیرونی دنیا نے کئی صدیوں سے اسے نظرانداز کر رکھا تھا مگر 1911ء میں جب امریکی ماہر آثار قدیمہ، ہرام بنگام نے اسے دریافت کیا تو یہ عالمی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کے متعلق مختلف داستانیں سنائی جاتی ہیں کچھ کے مطابق یہ ایک مقبرہ تھا، کیوں کہ یہاں سونے سے ڈھکی ہوئی عمارت کی باقیات ملی ہیں۔ کچھ کے مطابق یہ معاشی اور فوجی نکتہ نظر سے بنایا گیا۔ اس کے اوپر کے حصّے میں ایک بڑے پتھر کا ستون ہے، جو بڑے پیانو کے سائز کا ہے اور شمسی گھڑی کا کام دیتا ہے۔

مرسلہ: ستار بیگ، حیدرآباد

ٹیلیویژن کی نشریات کا آغاز

27 جنوری 1926ء کو اسکاٹ لینڈ کے الیکٹریکل انجینئر جان لوگی بیرڈ نے اپنی ایجاد ٹیلی وائزر کا عملی مظاہرہ کیا۔ 1929ء میں بی بی سی نے بیرڈ کے نظام پر مبنی ٹرانس میٹر نصب کر کے ٹیلی وائزر کی (جسے اب ٹیلی ویژن کہا جاتا ہے) باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا۔

مرسلہ: بنیش خان، ڈیرہ غازی خان

چہرے

دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں، جنہیں خدا نے خوب صورتی سے نوازا ہے۔ ایسے لوگ جو خوش شکل ہوتے ہیں، ان میں زیادہ تر اپنی اَنا کے خول میں بند رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ کوئی خاص اور برتر مخلوق ہیں جبکہ صحیح معنوں میں خوب صورت اس شخص کو کہا جاسکتا ہے، جو سیرت کا اچھا ہو۔

لیکن اس معاشرے میں خوب سیرت کی تو اتنی تعظیم نہیں کی جاتی جبکہ خوب صورت کی سب عزت کرتے ہیں، سب ان پر جان چھڑکتے ہیں۔

میرے خیال میں خوب صورتی دیکھنے والے کی

آنکھ میں ہے کہ وہ اسے کس زاویے سے دیکھتا ہے۔

مرسلہ: شہرین ناز، کراچی

دلیل

ماں نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”وحید سے شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دو بیٹی، تم اس کے ساتھ اچھی زندگی نہیں گزار سکو گی، وہ صرف پندرہ ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے۔“

”لیکن امی......! آپ یہ بھی تو سوچیں کہ میاں بیوی میں محبت ہو تو مہینہ کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔“ بیٹی نے جواب دیا۔

مرسلہ: آصفہ نور، سیالکوٹ

ظالم لوگ

نامور شاعر منیر نیازی ایک مرتبہ رکشے میں کہیں جا رہے تھے۔ وہ اپنے خیالات میں گم تھے کہ اچانک رکشا رک گیا۔ انہوں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے؟“

ڈرائیور نے بتایا کہ جنازہ گزر رہا ہے۔

منیر نیازی جو جملہ سازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، بولے۔ ”ظالمو! تم بھی کیسے لوگ ہو، زندہ انسان کو کچل کر گزر جاتے ہو اور جنازے کے احترام میں رکشا روک لیتے ہو۔“

مرسلہ: ایم کاشف، منگلا ڈیم

کوفی

عمدہ کوفی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق یہی سننے میں آیا ہے کہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کوفی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے، مشرقی امریکا کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کوفی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے نہایت پر تکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کوفی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کوفی بنانے کی ترکیب پوچھی۔ حبشی نے جواب دیا، ”بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں، پھر اس میں کوفی ملا کر دَم کرتا ہوں۔“

”حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟“ آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا۔ ”نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔“

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب سے ماخوذ)

مرسلہ: سائرہ ناز۔ کوئٹہ)

رات کی بارش

کسی متروک رستے پر
بہت دن بعد
کوئی چل کے آئے تو
بکھرتے خشک پتے پاؤں کے نیچے
سسکتے ہیں
یہ پچھلے موسموں کا عشق
کیسا عشق ہوتا ہے
ستمبر کے مہینے سا
نہ اس میں گرم جوشی ہے
نہ اس میں سرد مہری ہے
نہ پا لینے کی خواہش ہے
نہ کھو دینے کا دھڑکا سا
یہ پچھلے موسموں کا عشق
جیسے رات کی بارش
جو چپکے سے برس جائے
زمین دل کو نم کر دے

شاعرہ: طلعت اخلاق احمد

☆......☆......☆



اسماء اعوان

فراعنہ کی سرزمین، ایک پُراسرار محبت کی داستانِ عجب، جو آج بھی اپنی کہانی دہرا رہی ہے

طیارہ اہراموں کی سرزمین پر اتر گیا۔ مسافروں میں ہل چل مچ گئی۔ وہ اپنی اپنی پیٹیاں کھول رہے تھے۔ ایئرپورٹ کے عملے نے سیڑھی لگادی اور مسافر قطار کی شکل میں نیچے اترنے لگے۔ شجاع حیدر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ دراز قد ایئرہوسٹس اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ایک بار اس نے مسکراتی نظروں سے شجاع حیدر کی طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ اترنے کی تیاریاں نہیں کررہے جناب۔“

”پہلے آپ۔“ شجاع حیدر نے ایک خاص انداز میں کہا اور ایئرہوسٹس ہنس پڑی۔ شجاع حیدر کو اس کے موٹے موٹے سفید گالوں میں پڑ جانے والے ڈمپل بہت پسند تھے۔ پورے سفر کے دوران وہ اس دراز قامت اور متناسب الاعضاء ایئرہوسٹس کے ہنسنے کا منتظر رہا تھا اور جتنی بار بھی وہ ہنسی، شجاع حیدر کو بے حد بھلی معلوم ہوئی۔ ایئرہوسٹس کی آخری ہنسی دیکھ کر وہ اُٹھ گیا اور قطار میں سب سے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس کے آگے ایک درمیانے قد کا بوڑھا آدمی موجود تھا، جو بار بار اپنی پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ رکھ کر اپنے پرس کی موجودگی کا احساس کرلیتا تھا۔

شجاع حیدر کا دل چاہا کہ اپنی فطرت کے خلاف اس بوڑھے کا پرس پار کردے۔ لیکن اس نے خود کو باز رکھا۔ یوں بھی یہ ایک گھٹیا کام تھا اور پھر نہ جانے بوڑھے پر کیا گزرتی۔ ظاہر ہے بے حد کنجوس انسان تھا۔ قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس پاسپورٹ چیک کیے جارہے تھے، پھر بوڑھے کی باری آئی اور اس کے بعد شجاع حیدر کی۔ شجاع حیدر نے اپنا پاسپورٹ افسر کے حوالے کردیا اور افسر نے اسے دیکھ کر شکریہ کے ساتھ واپس کردیا۔

کسٹم ہاؤس سے اپنا خوب صورت اٹیچی لے کر وہ ایئرپورٹ سے باہر نکل آیا اور باہر نکلتے ہی ہوٹلوں کے نمائندوں نے اس پر یلغار کردی۔ دس بارہ خوش شکل اور اسمارٹ آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور شجاع حیدر کی نظریں ان میں سے کسی مناسب آدمی کو تلاش کرنے لگیں اور پھر اس کی نگاہ ایک ایسے شخص پر ٹھہر گئی جو سب سے پیچھے تھا اور شاید اس پیشے میں نیا۔ کیونکہ وہ ان بڑھ چڑھ کر بولنے والوں کا ساتھ نہ دے پارہا تھا اور اب تک وہ دوسروں کے سامنے کچھ کہنے کا موقع نہ پارہا تھا۔

ہوٹلوں کے نمائندے بدستور اس کے کانوں کے قریب کھچڑی پکارہے تھے۔ تب شجاع حیدر نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور چیخ کر بولا۔

”یارو...... کچھ میری بھی سن لو۔“ نمائندے ایک

لمحے کے لیے رک گئے۔ ''میں اپنے دوست کی دعوت پر یہاں آیا ہوں اور اس کے گھر جاؤں گا۔ چنانچہ جلدی دوڑو اور کسی دوسرے آدمی کو تلاش کرو۔ میرے ساتھ وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔''

اور ہوٹلوں کے نمائندوں کے ہونٹ سکڑ گئے۔ انہوں نے وہاں سے آگے بڑھنے میں بھی تیزی کا مظاہرہ کیا۔ اور وہ سُست آدمی پھر پیچھے رہ گیا۔ تاہم وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑنے کے لیے تیار ہوگیا۔ تب شجاع حیدر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ چونک کر رک گیا۔

''کیا تمہارے پاس گاڑی ہے؟'' شجاع حیدر نے پوچھا۔

''جی۔ جی ہاں۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے انداز میں کہا۔

''تب پھر میرا اٹیچی سنبھالو۔ میں تمہارے ہوٹل میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔'' شجاع حیدر نے اپنا اٹیچی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں مسرت کی لہریں اُمنڈ آئیں اور اس نے جلدی سے اٹیچی شجاع حیدر کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی رہنمائی اپنی کار کی طرف کی۔ شجاع حیدر اس کے ساتھ چل پڑا اور اس کی خوبصورت کار تک پہنچ گیا جس پر خوبصورت الفاظ میں ہوٹل ''الامین'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور شجاع حیدر سے اندر بیٹھنے کی استدعا کی۔ شجاع حیدر



مسکراتا ہوا اندر بیٹھ گیا۔ وہ اس خاموش طبع انسان کی حیرت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اس نے اٹیچی کار کی ڈگی میں رکھی اور پھر جلدی سے اسٹیئرنگ پر آبیٹھا۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ اور شجاع حیدر اس تاریخی شہر کے بازاروں کا نظارہ کرنے لگا۔ پُراسرار کہانیوں کے اس شہر سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ وہ وہاں کے ایک ایک گلی کوچے کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ اور ابھی اس کے لیے کافی وقت پڑا تھا۔ چنانچہ وہ ہوٹل کے نمائندے سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کیا تم اپنے پیشے میں نئے ہو دوست؟'' ڈرائیونگ کرنے والا چونک پڑا۔ پھر اس نے شرمندگی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو اس کا احساس کیسے ہوا جناب!''

''میرا خیال ہے ایئرپورٹ پر تم اپنے دوسرے ہم پیشہ افراد کی طرح اپنے ہوٹل کی نمائندگی نہیں کر سکے تھے۔'' شجاع حیدر نے جواب دیا۔

''میں اس پیشے میں بالکل نیا نہیں ہوں جناب! لیکن بدقسمتی سے میں اس کے لیے موزوں نہیں ہوں۔ کیونکہ یہ میری فطرت سے میل نہیں کھاتا۔ میں ادیب ہوں، شاعر ہوں، نثر لکھتا ہوں، شعر کہتا ہوں۔ لیکن شعر و ادب پیٹ بھرنے کے کام نہیں آتے اس لیے ملازمت کرتا ہوں۔ کیونکہ خالی پیٹ کہے ہوئے شعر بھی خالی خالی سے ہوتے ہیں۔''

شجاع حیدر پھر بازاروں کی رونقوں میں گم ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کار ایک خوبصورت ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی۔

خوب صورت ہوٹل کا خوبصورت کمرہ اسے بہت پسند آیا تھا ایک درمیانی عمر کی خادمہ نے اس کا اٹیچی کھول کر کپڑے نکالے اور انہیں سلیقے سے الماری میں لگانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب وہ چلی گئی تو شجاع حیدر نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا، باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل نے اس کی طبیعت کو نکھار دیا تھا۔ باہر آ کر اس نے بیل بجائی اور دروازہ کھول دیا۔ ایک باسلیقہ ویٹر کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ ایک صوفے میں دراز ہو گیا۔

فراعنہ کے دیس میں آ کر وہ ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ یہاں کی تاریخی داستانیں اس کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ کبھی نیل کی ساحرہ قلوپطرہ کا جاہ و حشم اس کی آنکھوں میں ابھر آتا، کبھی فرعون کے دربار۔ بلاشبہ یہ تاریخی شہر بے پناہ پُراسرار داستانوں کا رہن تھا۔

ویٹر کوفی لے آیا۔ اور خوش ذائقہ کوفی کے چھوٹے چھوٹے خوشگوار گھونٹ لیتے ہوئے وہ یہاں اپنی مصروفیات کے بارے میں پروگرام بنانے لگا۔ اہرام، ابولہول اور دوسرے تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ لیکن شجاع حیدر جیسا انسان کسی کا ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا وہ اپنی فطرت سے خوفزدہ تھا۔ نہ جانے کب اور کہاں اس کی فطرت عود کر آئے۔ نہ جانے کون سی چیز اسے پسند آجائے اور وہ اس کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کر دے۔ اگر کوئی اس کے ساتھ ہوا تو وہ اپنا کام کیسے کر سکے گا۔ خواہ مخواہ الجھنیں پیدا ہوں گی۔''

حالانکہ وہ یہاں بغرض سیاحت آیا تھا۔ اس تاریخی شہر کو دیکھنے کی آرزو لے کر آیا تھا۔ کیونکہ شکار کھیلنے کے لیے پوری دنیا پڑی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ انسان ہر وقت کاروباری موڈ میں رہے۔ اپنے خیال کے مطابق وہ صرف تعطیلات گزارنے یہاں آیا تھا۔ اپنے پیشے کو وہ ملازمت ہی سمجھتا تھا اور پوری ایمانداری سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ عملی زندگی کا آدھا دور اس نے یورپی ممالک میں گزارا تھا اور اس وقت وہ ایک بڑے یورپی ملک کا ایک معزز شہری تھا اور اسی ملک کے پاسپورٹ پر یہاں آیا تھا۔ اس بڑے ملک میں اس کا ایک بڑا جنرل اسٹور تھا۔ جہاں انتہائی مناسب قیمت پر اشیاء فروخت ہوتی تھیں اور اس بڑے اسٹور میں تقریباً اٹھارہ ملازم کام کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی درست تھا کہ شجاع حیدر کو اسٹورز اور اس کی آمدنی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی ضرورت کے لیے وہ جہاں چاہتا حسب ضرورت رقم حاصل کر سکتا تھا۔ کئی ملکوں کی معیاری ڈکیتیوں میں اس کا ہاتھ تھا جبکہ پولیس ابھی تک ان ڈکیتیوں کے سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ اسے جو چیز پسند آجاتی وہ اسے حاصل کر لیتا تھا اور اس کی بے پناہ صلاحیتیں ہر مشکل کو آسان بنا دیتی تھیں۔

چنانچہ اس کے خزانہ خاص میں ایسی ایسی نایاب چیزیں موجود تھیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور مہذب دنیا میں جن کی بڑی قدر و قیمت تھی اور جن کی چوریوں کا سراغ آج تک نہیں لگایا جاسکا تھا۔

لیکن اس تاریخی شہر میں وہ بُری نیت سے نہیں آیا تھا۔ اِسے دیکھنے کی آرزو عرصہ دراز سے اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اور حالات سازگار ہوتے ہی اِس نے اُس طرف کا رخ کیا تھا۔

چنانچہ طے یہ ہوا کہ وہ ان تاریخی مقامات کی سیر تنہا کرے گا۔ شام ہو چکی تھی۔ اس وقت باہر نکلنا غیر ضروری تھا، کافی وقت پڑا تھا اور پھر شام گزارنے کے لیے ہوٹل کی تفریحات ہی کافی ہوں گی۔ کوفی ختم کر کے وہ کئی منٹ تک صوفے پر دراز رہا اور پھر اس نے ایک طویل انگڑائی لے کر صوفہ چھوڑ دیا۔

الماری سے اپنا خوبصورت کوٹ نکال کر زیب تن کیا اور نک سک سے درست ہو کر باہر نکل آیا۔ دروازے کو تالا لگا کر چابی اچھالتا ہوا وہ لفٹ کی طرف بڑھا۔ قریب و جوار میں کوئی نہ تھا۔ لیکن اس وقت جب وہ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ دروازے سے ایک خوبصورت ہاتھ باہر نکلا اور اس نے فضا میں معلق چابی لپک لی۔ وہ چونک کر رکا اور اُسی وقت اِس حسین ہاتھ کی مالک باہر نکل آئی۔ اُس کے ہاتھ میں چابی دبی ہوئی تھی۔

گدرائے ہوئے جسم اور ہلکے کتابی چہرے کی مالک، شوخ کالی آنکھوں والی لڑکی کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

''میرا نام زلیخا ہے۔'' اس نے مترنم آواز میں کہا اور شجاع حیدر کے سے انداز میں چابی اچھالتی ہوئی اس کے شانے سے شانا ملا کر چلنے لگی۔ ایک بار اس نے چابی اچھالی تو شجاع حیدر نے اس کے سے انداز میں چابی لپک لی اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''بدقسمتی سے میرا تعلق یوسف کے خاندان سے نہیں ہے۔ اس لیے سوری!'' وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ زلیخا کے قدم رک گئے اور وہ لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچ گیا۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں رنگ و بو کے لاتعداد نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ویٹر نے اس کی میز تک رہنمائی کی اور وہ اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ میز کے گرد اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ویٹر کو اشارہ کیا اور بولا۔

''کرسیاں ہٹا دو۔ میں تنہا بیٹھنا چاہتا ہوں۔'' ویٹر نے ادب سے سر جھکا دیا۔ اور پھر اس کے قریب کی کرسیاں ہٹا دی گئیں، پورے ہال میں نقرئی قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ جوڑے ایک دوسرے میں مگن تھے۔ موسیقی کی لہریں فضاؤں میں رچی ہوئی تھیں۔ رنگ چھلک رہے تھے۔ بدمستیاں رنگ پکڑ رہی تھیں اور پھر ایک آتشیں جسم کی رقاصہ میزوں کے درمیان رینگ آئی۔ دھنیں بدل گئیں اور میزوں کے نیچے چھپے ہوئے پاؤں تال دینے لگے۔ شجاع حیدر نے وہسکی کا آرڈر دیا...... اور دلچسپ نظروں سے لوگوں کی حرکات دیکھنے لگا۔

کسی کو ہوش نہیں تھا۔ ہر کوئی خود سے بے خبر، کیف و مستی میں گم تھا۔ عمروں کا تضاد مٹ گیا تھا، جسامت کی تفریق ختم ہو گئی تھی۔ دیوہیکل، موٹے، بھدے، سیاہ بازوؤں میں اپسرائیں جھول رہی تھیں۔ کھلائے ہوئے ملپلے جسم، نازک سڈول جسموں سے چپکے ہوئے تھے۔ شجاع حیدر کے لیے یہ منظر نئے نہیں تھے وہ ان سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اسے ہال میں زلیخا نظر آئی جواب کسی اور یوسف کی تلاش میں تھی اور اسے بھول گئی تھی۔

رات کا کھانا بھی اس نے ڈائننگ ہال میں ہی کھایا اور پھر خاصی رات گئے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔



دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے سو کر اٹھا۔ ہمیشہ دیر سے جاگنے کا عادی تھا۔ جاگنے کے بعد بھی بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر جب لیٹے لیٹے طبیعت بیزار ہو گئی تو اُٹھ گیا۔ غسل کیا، لباس تبدیل کیا، ناشتا طلب کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے پسندیدہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے آج کے پروگرام پر غور کرنے لگا۔

ٹھیک ایک بجے ہوٹل سے نکل آیا۔ ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے باہر نکل کر وہ ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب پہنچ گیا اور پھر ایک درمیانی عمر کے ٹیکسی ڈرائیور کو اس نے پسند کیا جس نے دھاری دار شرٹ پہنی ہوئی تھی اور شوخ رنگ کی پتلی پتلون۔ چہرے سے وہ کافی خوش مزاج نظر آتا تھا۔ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے اس کے لیے ٹیکسی کا دروازہ

کھول دیا۔

"انگریزی جانتے ہو؟" اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"اہل زبان کی طرح۔" اس نے انگریزی میں جواب دیا۔ اور شجاع حیدر نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ درحقیقت اس نے یہ جملہ اہل زبان ہی کے سے انداز میں کہا تھا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

"میں سیاح ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"کیا تم مہمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے قائل ہو؟"

"عربوں کی روایت ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"خوب۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"افضال حسین۔" ڈرائیور نے مختصر کہا۔

"ٹھیک ہے افضال حسین! مجھے یہاں کے تاریخی مقامات کی سیر کراؤ۔ روزانہ دو بجے سے شام نو دس بجے تک۔ جب تک میں یہاں ہوں۔"

"میں حاضر ہوں جناب!" افضال حسین نے جواب دیا۔

"ابتدا بھی تمہاری مرضی سے ہوگی۔" شجاع حیدر نے کہا۔

"چنانچہ میں ابتدا کرتا ہوں مجسمہ ہول سے۔" افضال حسین نے مسکراتے ہوئے کہا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

"اس سے قبل یہاں نہیں آئے؟"

"نہیں۔" شجاع حیدر نے جواب دیا اور اس نے گردن ہلا دی۔ پھر ایک طویل سفر طے کر کے وہ ابوالہول کے نزدیک پہنچ گیا۔ شجاع حیدر نے اس روایتی مجسمے کو بہت حیرت و دلچسپی سے دیکھا۔ ان لوگوں کو دیکھا جو مقامی باشندے تھے اور برق رفتاری سے مجسمے کے اوپری سرے تک پہنچ کر واپس آجاتے تھے، ایسے ہی ایک آدمی کو شجاع حیدر نے انعام دیا اور ٹیکسی وہاں سے چل پڑی۔

درحقیقت مصر وہی ثابت ہوا جو اس کے بارے میں کہا جاتا تھا۔ جدید و قدیم تہذیب کے اس شہر میں ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اس پورے ہفتے میں افضال حسین نے اسے شہر کے کونے کونے کی سیر کرائی۔ بلاشبہ وہ بہت اچھا ساتھی ثابت ہوا۔ بے حد دلچسپ اور خوش مزاج۔ ٹھیک دو بجے وہ شجاع حیدر کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتا اور شجاع حیدر مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیتا۔ پھر وہ افضال حسین کے لیے چائے منگواتا۔ اور چائے کے درمیان افضال حسین خود فیصلے کرتا کہ آج انہیں کہاں کہاں کی سیر کرنی ہے۔ پھر رات کو وہ اسے کسی خوبصورت سے نائٹ کلب یا ہوٹل کے سامنے چھوڑ دیتا اور دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے واپس چلا جاتا۔

یہاں کے نائٹ کلب بھی شجاع حیدر کو بہت پسند آئے تھے۔

آج بھی وہ افضال حسین کا انتظار کر رہا تھا۔ اور نہ جانے کیوں اسے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے تیار بیٹھا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد افضال حسین آیا۔ اس نے دروازے پر اپنے مخصوص انداز میں دستک دی اور شجاع حیدر نے دروازہ کھول دیا۔ حسبِ معمول افضال حسین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ افضال حسین سے اس کے دیر سے آنے کی وجہ پوچھتا وہ خود ہی بول پڑا۔

"آدھا گھنٹے لیٹ آنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس تاخیر کی سزا کے طور پر مجھے آج چائے نہ ملے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بہت بڑی سزا ہوگی۔ کیونکہ یہاں کی چائے مجھے بہت پسند ہے۔ اس لیے آپ چائے منگوایئے اور اس کے بعد اس تاخیر کی کوئی دوسری مناسب سزا تجویز کیجیے۔" شجاع حیدر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا اور افضال حسین کے سامنے بیٹھ گیا۔

"دیر کیسے ہوگئی افضال حسین؟"

"اوہ۔ شاید مسز افضال حسین سے جھگڑا کر کے آرہے ہو؟" شجاع حیدر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جھگڑا؟" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "بڑا کم تر لفظ استعمال کیا ہے تم نے۔"

"چنانچہ آج تم بیوی کی پٹائی کر کے آئے ہو۔"

"نہیں کرتا ہوں تو وہ بور ہو جاتی ہے۔"

شجاع حیدر ہنستا رہا۔ بلاشبہ یہ آدمی بے حد دلچسپ تھا، تھوڑی دیر کے بعد چائے آگئی اور پھر چائے پینے کے

بعد وہ اُٹھ گئے۔

آج افضال حسین نے اسے سرکاری میوزیم کی سیر کرانے کا فیصلہ کیا تھا، میوزیم شہر سے باہر ایک پُرفضا مقام پر تھا۔ یہاں زمانہ قدیم کے بیشتر نوادرات موجود تھے۔ شجاع حیدر کے لیے خوشی کی بات تھی کہ اس نے اہرامین میں حنوط شدہ ممیاں دیکھی تھیں، ان کے جسموں پر قیمتی زیورات دیکھے تھے۔ لیکن اس کے دل میں ان میں سے کسی زیور کے حاصل کرنے کی خواہش نہیں بیدار ہوئی تھی، وہ بے حد پُرسکون تھا اور اس سکون کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

ٹیکسی دوڑتی رہی اور افضال حسین اس سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ اپنی بیوی کی، مصر کی سرزمین کی، اپنے سسر کے اکھاڑے کی اور پھر وہ میوزیم پہنچ گئے۔

............☆☆............

شام کے ساڑھے تین بجے تھے، میوزیم میں زیادہ لوگ نہیں تھے، افضال حسین کے ساتھ وہ اندر داخل ہو گیا اور پھر وہ اس پُراسرار میوزیم میں پہنچ گیا۔ جہاں غیر معمولی ٹھنڈک تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی مہک رچی ہوئی تھی جسے ناخوشگوار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پہلے وہ ممیوں کے سیکشن میں گئے۔ یہاں قدیم لوگ موجود تھے۔ صدیوں سال پرانے زعماء جنہوں نے اپنی زندگی میں بیشتر کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اور اب وہ بے جان جسم لیے شوکیسوں میں بند تھے۔ ان کی بے نور آنکھیں گردش چرخ کی ستم ظریفی کی شاکی تھیں۔ ہر ممی کے نزدیک اس کا شجرہ نسب، اس کی شخصیت کی ایک ایک تفصیل رقم تھی۔ پرانے مجسمے، ہتھیار اور دوسری چیزوں کو دیکھتے ہوئے وہ ایک بڑے ہال کے سامنے پہنچ گیا۔

دروازے پر کھڑے ہوئے چپڑاسی نے جو پستول سے مسلح تھا، ادب سے دروازہ کھول دیا۔ اور پہلے شجاع حیدر اور اس کے پیچھے افضال حسین اندر داخل ہو گیا۔ اس پورے کمرے کو ایک خاص رنگ دیا گیا تھا۔ سامنے ہی دو مجسمے موجود تھے جو شاید آثارِ قدیمہ سے نکالے گئے تھے۔ ان کے قدموں کے نیچے ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا۔

''راعاش اور اس کی محبوبہ۔''

پھر برابر ایک بڑے کارڈ پر راعاش کے مختصر حالاتِ زندگی لکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں چاروں طرف دیوہیکل سپاہیوں کے مجسمے نصب تھے۔ گویا پورے ماحول کو راعاش کے دور میں لے جایا گیا تھا۔ نصب شدہ مجسموں میں بوڑھے، جوان، عورتیں بچے سب ہی تھے۔ بہت سے سپاہی ہتھیاروں سے مسلح کھڑے تھے۔ شجاع حیدر اس ماحول سے بہت متاثر ہوا اور پھر وہ راعاش کے دور کے ہتھیار اور زیورات دیکھنے لگا۔ تب اس کی نگاہ ایک شوکیس کی طرف اُٹھ گئی جہاں مخمل کی ایک ڈبیہ میں ناتراشیدہ ہیروں کا ایک بھدا سا ہار رکھا ہوا تھا۔ پورے بارہ قیمتی ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ان ہیروں کو چمڑے کی ڈوریوں میں باندھ کر ہار بنایا گیا تھا۔

بظاہر وہ ایک بھدا سا ہار تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں شجاع حیدر کا دل دھڑک اُٹھا۔ اس کی کنپٹیاں گرم ہونے لگیں اور وہ اپنی اس کیفیت سے گھبرا گیا۔ ہاں......اسے یہ ہار پسند آ گیا اور اسے حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں مچل اُٹھی تھی۔ اب وہ خود کو اس ہار کے حصول کی خواہش سے نہیں روک سکتا تھا۔

اس کے قدم جم گئے۔ وہ بغور اس ہار کو دیکھتا رہا۔ اب جبکہ اس کے دل نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ ہار اس کی ملکیت ہونا چاہیے تو پھر اس کے حصول کے لیے تیاریاں شروع کر دینا چاہئیں۔ وہ فراعنہ کے دیس سے یہ تحفہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اس جیسے شاطر انسان کے لیے یہ مشکل کام نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سارا کمرہ مضبوط اور ساؤنڈ پروف تھا۔ اندر داخل ہونے کے لیے ایک دروازے کے علاوہ اور کوئی دروازہ نہیں تھا۔ یقیناً وہ دروازہ رات کو بند ہو جاتا ہو گا اور اس کے باہر سنتری بھی موجود ہوتا ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ دروازے میں لوہے کی پتریاں جڑی ہوئی تھیں اور ان کا ایک ہی مقصد ہو گا۔ دروازے میں رات کے وقت کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہو گا۔

اس کی آنکھیں پورے ماحول کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر اس کی نظریں اوپر چھت کی طرف اُٹھ گئیں۔ چھت کے قریب چھوٹے چھوٹے روشندان بنے ہوئے تھے، جن سے کوئی انسان اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ روشندانوں میں بھی موٹے شیشے لگے ہوئے تھے اور پھر اگر کوئی، ان روشندانوں سے داخل بھی ہو سکتا تو نیچے اترنا

مشکل تھا۔ کیونکہ روشندان کافی بلندی پر تھے۔ ’لیکن یہ روشندان...... یہ روشندان۔‘ شجاع حیدر انہیں دیکھتا رہا اور اس کے طوفانی ذہن نے ایک منصوبہ سوچ لیا۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ آسانی سے اس کام کو انجام دے سکتا تھا۔ اس نے شیشے کے اس شوکیس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جس کی چھت بھی شیشے کی تھی اور پھر وہ اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے لگا۔

’’آگے بڑھیے مسٹر! کیا راعاش کے مجسمے نے آپ کو مسحور کردیا ہے؟‘‘ افضال حسین کی آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑا پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے بولا۔

’’ہاں افضال حسین! میں ان کی تاریخ پر غور کررہا تھا۔ کیسے ہوتے ہوں گے یہ لوگ۔ کیسے عجیب، کیسے پُراسرار۔ تم ان کا تصور کرکے سحر زدہ نہیں ہوتے؟‘‘

’’میں پہلے ہی مصیبت زدہ ہوں۔ بیوی کے سحر میں گرفتار ہوں۔ کوئی اور جادو میرے اوپر کارگر نہیں ہوسکتا۔‘‘ افضال حسین نے حسبِ معمول اس انداز میں جواب دیا کہ شجاع حیدر کی ہنسی چھوٹ گئی۔ بہرحال اس نے دوسری چیزوں کو بھی دلچسپی سے دیکھا اور پھر وہ میوزیم سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد افضال حسین اسے لے کر واپس چل پڑا۔

’’آج رات کہاں گزارنے کا ارادہ ہے صاحب!‘‘ راستے میں افضال حسین نے پوچھا۔

’’تم ہی مشورہ دو افضال حسین۔ ویسے میرا خیال ہے اس رات آرام کروں۔ خود تمہارا رات کا کیا پروگرام ہے؟‘‘ شجاع حیدر نے پوچھا۔

’’جس صبح کی آج ابتدا ہوئی ہے اس کی رات کا پروگرام ایک ہی ہوتا ہے۔ اب میں اس لمبی چڑیل کی من پسند چیزیں خرید کر گھر واپس جاؤں گا۔

چنانچہ میرے عزیز اس رات کا پروگرام تمہارے سامنے ہے۔‘‘

شجاع حیدر بے تحاشا ہنس رہا تھا، پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’بس کرو افضال حسین! بلاشبہ تم بڑے مسخرے انسان ہو، اور اس کے ساتھ خوش قسمت بھی۔ کیسا اچھا پروگرام ہے تمہارا۔ ایک جانا بوجھا پروگرام، جس میں شرکت کے لیے تم بے چین ہوگے۔‘‘

’’دل نہ جلاؤ دوست! تمہارے بہترین سلوک پر میں تمہیں ایک ہی دعا دے سکتا ہوں۔ خدا تمہاری شادی نہ کرائے!‘‘ افضال حسین نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور شجاع حیدر ہنستا رہا۔

’’ہاں...... تو کہاں چلوں؟‘‘ اس نے چند منٹ کے بعد پوچھا۔

’’ہوٹل...... آج رات آرام کروں گا۔‘‘ شجاع حیدر نے جواب دیا اور افضال حسین نے ٹیکسی ہوٹل الامین کی طرف موڑ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد الامین پہنچ گئے اور شجاع حیدر ٹیکسی سے اتر گیا۔

’’ایک دوست کی حیثیت سے میرا فرض ہے افضال حسین کہ میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ چنانچہ اپنی بیوی کی مکمل فرمائشات پوری کرنے کے لیے یہ حقیر رقم قبول کرو۔‘‘ شجاع حیدر نے روزمرہ کی بندھی ہوئی رقم کے علاوہ مزید کچھ رقم افضال حسین کو دیتے ہوئے کہا۔

’’شکریہ مصیبت کے وقت دوستوں کی مدد قبول نہ کرنا میرے نزدیک گناہ ہے۔‘‘ اس نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور سلام کرکے واپس چلا گیا۔ اور شجاع حیدر اپنے کمرے میں آگیا۔

............☆☆............

آج رات وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اس پروگرام کی نوک پلک سنوارنا چاہتا تھا جو اس نے میوزیم سے ہار حاصل کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ چنانچہ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور پھر ایک آرام کرسی میں دراز ہوگیا۔ آنکھیں بند کرکے اس نے میوزیم کا پورا نقشہ ذہن میں مجتمع کیا۔ اس پروگرام کے بعد اس نے میوزیم کے چند اور حصوں کو بغور دیکھا تھا۔ میوزیم کا پورا نقشہ ذہن میں ترتیب دینے کے بعد اس نے خود کو اس کے قریب پہنچا دیا جس میں ہار موجود تھا اور پھر اپنے سوچے ہوئے انداز میں کام کرنے لگ گیا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا، اور پھر دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ ویٹر اندر آنے کی اجازت طلب کررہا تھا۔

"آ جاؤ......" اس نے کہا اور ویٹر اندر داخل ہو گیا۔
"کھانے کے لیے پوچھنے حاضر ہوا تھا جناب!" اس نے کہا۔
"یہیں کھاؤں گا۔" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ویٹر گردن جھکا کر چلا گیا اور وہ پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ اس نے اس کام کے لیے ضرورت پڑنے والی اشیاء کی فہرست تیار کی اور تمام چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ اور پھر جب ویٹر کھانا لے کر آیا تو وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔

اس نے کھانا کھایا اور پھر کوفی پینے کے بعد ایک میگزین لے کر لیٹ گیا۔ اس رات وہ پورے طور پر آرام کرنا چاہتا تھا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور چشم تصور سے ان ناتراشیدہ ہیروں کے ہار کو دیکھنے لگا۔ اس کے نوادرات کے خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ۔ ناتراشیدہ ہیروں کا انوکھا ہار ایک انفرادیت رکھتا تھا۔ اس قسم کے دوسرے بہت سے نوادرات اس کے خزانے میں موجود تھے لیکن اس "ہار" کی بات ہی انوکھی تھی۔ وہ اپنی تاریخ کے لحاظ سے دنیا کا انوکھا ہار تھا۔

انہی تصورات میں اسے نیند آ گئی...... گہری اور پُرسکون نیند، جس نے اسے خواب دیکھنے کی مہلت بھی نہ دی اور یہ اسی نیند کا اثر تھا کہ صبح کو جب وہ جاگا تو اس کی طبیعت ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش تھی۔ اس نے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنا پسندیدہ ناشتا منگوایا اور خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ رات کو جلدی سویا تھا اس لیے صبح بھی جلدی آنکھ کھلی اور صبح آنکھ کھلنا ضروری تھی، افضال حسین دو بجے آتا تھا اور دو بجے سے پہلے اسے بہت سے کام کرنے تھے۔

چنانچہ ناشتا وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ ہوٹل سے نکل آیا اور کافی دور تک سڑکوں پر پیدل چلتا رہا۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ بازار پوری طرح کھل چکے ہوں گے تو اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر بازار چل پڑا۔

ایک بھرے پُرے بازار میں پہنچ کر وہ اس ٹیکسی سے اترا۔ سب سے پہلے اس نے ایک خوبصورت بیگ خریدا اور اسے لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بہت سی چیزیں خرید ڈالیں۔ بعض ضروری اور بعض غیر ضروری۔ غیر ضروری چیزیں اس نے منہ مانگی قیمت پر ان دکانداروں سے خریدی تھیں۔ جن سے اسے دوسری چیزوں کے ملنے کی جگہ معلوم کرنی تھی۔ ویسے یہ دوسری بات تھی کہ ان غیر ضروری چیزوں کو اس نے موقع دیکھ کر مناسب جگہوں پر پھینک دیا تھا۔

تقریباً ایک بجے وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ اب اس کا خریدا ہوا بیگ متعدد چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ ایک ٹیکسی لے کر ہوٹل چل پڑا۔ ہوٹل سے کچھ دور پھر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی اور ڈرائیور کو بل دے کر سُست قدموں سے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا دوسروں کی نگاہوں سے بچتا ہوا وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے تھیلا مناسب جگہ چھپا دیا اور پھر جلدی سے لباس تبدیل کر کے ایسی شکل بنالی جیسے اب تک سوتا رہا ہو۔

ٹھیک دو بجے کمرے کے دروازے پر افضال حسین کی آواز سنائی دی اور اس نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ افضال حسین حسبِ معمول مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور شجاع حیدر نے بھی اسی انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا جیسے روزانہ دیتا تھا۔

افضال حسین ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
"کیوں افضال حسین! کیا تمہاری بیوی راضی ہو گئی!" اس نے پوچھا۔
"نہ راضی ہونے کا کیا جواز تھا۔ اور پھر رات کو تو میں نے ضرورت سے زیادہ ہی خرچ کر ڈالے۔ براہ کرم آپ چائے کے لیے کہہ دیجیے گا!"
"اوہ۔ معاف کرنا۔" شجاع حیدر نے اُٹھتے ہوئے کہا اور پھر اس نے گھنٹی بجا کر ویٹر کو بلایا اور اس کے لیے چائے کہہ کر بیٹھ گیا۔

افضال حسین دوسری باتیں کرتا رہا اور شجاع حیدر اس کی باتوں پر ہنستا رہا پھر افضال حسین نے کہا۔
"آج آپ کو ساحل نیل کی سیر کرائی جائے۔"
"لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" شجاع حیدر نے کہا۔
"کیا......؟"
"تم نے کل جو میوزیم مجھے دکھایا تھا وہ مجھے بے پناہ پسند آیا ہے، میں آج پھر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بڑی سحر

انگیز جگہ ہے۔ یقین کرو پورے شہر میں اس سے خوب صورت اور پُر اسرار جگہ کوئی نہیں ہے۔''

''پسند ہے اپنی اپنی۔ بہر حال مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' اس نے شانے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''چائے آنے والی ہے تم چائے پیو! میں لباس تبدیل کرلوں۔'' شجاع حیدر نے کہا اور لباس نکال کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا پھر جب وہ غسل کر کے باہر آیا تو افضال حسین اس کے حصے کی چائے بھی ختم کر چکا تھا۔

''میرا خیال ہے اب اٹھیں..... کافی وقت ہوگیا ہے!'' اس نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا تا کہ شجاع حیدر اپنے لیے چائے نہ طلب کرے۔

شجاع حیدر بھی اس کی چالاکی سمجھ گیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ اور افضال حسین کی زبان اس کے پہیوں کی رفتار سے چلنے لگی۔ دنیا جہان کی باتیں۔ لیکن آج شجاع حیدر اس کی باتوں پر پوری توجہ نہیں دے سکا تھا، وہ صرف ہوں ہوں کرلیتا تھا اور اس کا ذہن میوزیم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میوزیم پہنچ گئے۔ افضال حسین نے ٹیکسی ایک طرف کھڑی کردی اور دونوں میوزیم میں داخل ہوگئے۔

آج کافی دیر تک شجاع حیدر میوزیم کے اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے میوزیم کے نگہبانوں کے قیام کی جگہیں بھی دیکھیں اور پھر اس کی عمارت کے چاروں طرف بھی گھوما۔ پھر وہ عمارت میں داخل ہوگیا اور کل جو یہاں کے حصے باقی رہ گئے تھے انہیں بھی دیکھ ڈالا۔ بہت سی جگہیں قابل دید تھیں۔ بہت سی چیزیں نادر اور اس ہار سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔ لیکن ہار کی بات ہی اور تھی۔ جو حُسن ان ناتراشیدہ ہیروں میں تھا وہ کسی اور چیز میں نہ مل سکا۔ آخر میں وہ پھر اسی کمرے میں پہنچ گیا جس میں ہار موجود تھا۔

ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔ وہ دوسری چیزوں کو دیکھتا رہا، ہار کے قریب بھی چند لمحات کے لیے رکا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ اس سے خاصی دلچسپی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا تا کہ کسی کو شبہ نہ ہو جائے۔ پھر جب دیکھنے کے لیے کوئی چیز باقی نہ رہی تو وہ باہر نکل آئے۔

''یہاں کس وقت تک رہنے کی اجازت ہے؟'' اس نے افضال حسین سے پوچھا۔

''رات کو نو بجے تک۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد میوزیم کے محافظ مہمانوں سے معذرت طلب کرلیتے ہیں۔'' افضال حسین نے جواب دیا۔

''میں اس پُر سکون ماحول میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ کیوں نہ ہم باہر چل کر گھاس کے کسی قطعہ پر بیٹھیں۔'' شجاع حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بندہ حاضر ہے۔ اسے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' افضال حسین نے کہا اور پھر وہ سبز گھاس کے ایک ٹکڑے پر بیٹھ گئے، شجاع حیدر نے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ شجاع حیدر کے کان افضال حسین کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے لیکن ذہن کہیں اور تھا۔ رات کی تاریکی میں میوزیم کا ماحول دیکھ رہا تھا۔ اس نے رات کے چوکیداروں کو اپنی ڈیوٹیاں سنبھالتے دیکھا اور ان کی ڈیوٹیوں کی جگہیں معلوم کرلیں۔ بہر حال اسے یہ اندازہ لگا کر مسرت ہوئی کہ چوکیدار اندر عمارت میں نہیں رہتے بلکہ عمارت کے دروازوں میں کرنٹ چھوڑ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور یہ شجاع حیدر کے لیے کام کی بات تھی۔

ٹھیک نو بجے کسی محافظ کے پہنچنے سے قبل وہ باہر نکل آئے اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ راستے میں حسبِ معمول افضال حسین نے پوچھا۔

''کیا پروگرام ہے؟''

''بلیک روز، آج وہاں عمدہ پروگرام ہے۔ کیوں نہ تم بھی آج میرے ساتھ پروگرام دیکھو افضال حسین!'' شجاع حیدر نے پیشکش کی اور افضال حسین ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''کبھی دیکھتے تھے صاحب! رقص و موسیقی سے مجھے بے حد دلچسپی ہے لیکن اب..... بیوی جو ناچ نچاتی ہے اس سے فرصت نہیں ملتی۔''

''ایک کام کرسکتے ہو افضال حسین؟''

''حکم دیں جناب، افضال حسین خادم ہے!''

''اگر اعتماد کرو اور تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو تو ٹیکسی چھوڑ جاؤ۔ رات کو واپسی میں بعض اوقات بہت دقت ہوتی ہے،

صبح کو آ کر لے جانا اور پھر حسبِ معمول دو بجے آ جانا۔"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ اگر تمہیں تکلیف ہوئی پھر دو تی کیا۔" افضال حسین نے فراخ دلی سے کہا اور پھر بلیک روز کلب کے باہر اس نے ٹیکسی روک دی اور انجن بند کر کے چابی شجاع حیدر کے حوالے کر دی۔

"اگر صبح دیر سے آنکھ کھلے تو چابی کاؤنٹر پر دے دینا، اس سے لے لوں گا۔"

"نہیں۔ تم آ سکتے ہو۔" شجاع حیدر نے کہا اور افضال حسین سلام کر کے چلا گیا۔ دوسرے منصوبے پر بھی عمل ہو چکا تھا۔ شجاع حیدر نے کلب کے ٹکٹ خریدے اور اندر جا بیٹھا۔ رات کو تقریباً بارہ بجے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ گو اس وقت اسپینش رقاصہ رقص کر رہی تھی اور اس کا رقص کافی دلکش تھا۔ لیکن شجاع حیدر کو اپنا کام زیادہ عزیز تھا۔ چنانچہ وہ رقص چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر پٹرول چیک کیا اور پھر میوزیم کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

ٹیکسی تاریکی میں سنسان سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ اور شجاع حیدر کی مخصوص حِس جاگ رہی تھی جو اسے ایک پُرامن بزنس مین سے ایک شاطر چور بنا دیتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی میوزیم کے قریب پہنچ گئی اور شجاع حیدر نے میوزیم کے پورے پارک کے گرد ایک چکر لگایا۔ اس نے محسوس کیا کہ محافظ زیادہ مستعد نہیں ہیں۔ گو ان میں سے کچھ لوگ جاگ رہے تھے، لیکن وہ بھی کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔

کئی منٹ تک وہ میوزیم کے گرد چکر لگاتا رہا۔ پھر واپس چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ الامین کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور پھر وہ آرام سے سو گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح تقریباً نو بجے افضال حسین کی دستک نے اسے جگا دیا۔ اس نے دروازہ کھولا، افضال حسین جلدی میں تھا، وہ ٹیکسی کی چابی لے کر چلا گیا۔ لیکن اب شجاع حیدر بھی ہوشیار ہو گیا تھا۔ آج افضال حسین کے آنے تک وہ اپنا کام مکمل کر لینا چاہتا تھا چنانچہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ کی ہول پر ٹیپ چپکایا تاکہ کوئی باہر سے اندر نہ جھانک سکے۔ اس کے بعد اس نے وہ بیگ نکال لیا۔ جس میں اس کا خریدا ہوا سامان موجود تھے۔

ساڑھے بارہ بجے تک مسلسل مصروف رہنے کے بعد وہ فارغ ہو چکا تھا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غسل کیا۔ تمام چیزیں احتیاط سے اسی بیگ میں رکھ دیں اور بیگ اپنی جگہ چھپا دیا۔ اس کے بعد اس نے کھانا طلب کیا، اور کھانے سے فارغ ہو کر سگریٹ نوشی کرنے لگا۔ دو بجے اسے دروازے پر افضال حسین کی مانوس دستک سنائی دی اور اس نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ افضال حسین کا مسکراتا چہرہ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے حسبِ معمول سلام کیا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سناؤ افضال حسین خیریت سے ہو؟"

"اب ایک آدھ ہفتے کی خیریت ہی ہے جناب۔ ان دنوں اس کا موڈ بہت خوشگوار ہے۔"

"خوب!" شجاع حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے حسبِ معمول افضال حسین کے لیے چائے منگوائی اور خود لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ افضال حسین چائے سے فارغ ہو گیا اور شجاع حیدر نے لباس بدل لیا تو وہ دونوں اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

"کہاں لے کر چل رہے ہو آج؟" اس نے راستے میں افضال حسین سے پوچھا۔

"اگر میوزیم نہ چل رہے ہوں تو ساحل نیل!" افضال حسین نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے! میوزیم روز روز جانے سے کیا فائدہ۔" اس نے جلدی سے کہا اور افضال حسین نے گردن ہلا دی۔ ٹیکسی دوڑتی رہی اور پھر وہ اس تاریخی دریا پر پہنچ گئے۔ عظیم الشان دریا جو پیغمبروں کی کہانی سناتا تھا۔ شجاع حیدر پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔

فراعنہ کے مقبرے، اہرام، ابوالہول اور دوسری بہت سی چیزیں دیکھی تھیں۔ بے شک وہ سب بے حد پُر اسرار تھیں، لیکن دریائے نیل منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے وابستہ کہانیاں شجاع حیدر کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ کہیں قلوپطرہ کا بجرہ تیرتا نظر آتا تھا تو کہیں حضرت موسیٰ کی حکایت ذہن میں ابھرتی آتی تھی۔ شجاع حیدر سکتے کے عالم میں کھڑا نیل کی موجوں کو دیکھتا رہا جو اَنگنت

کہانیاں سنا رہی تھیں اور ان کہانیوں نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ افضال حسین ٹیکسی کا دروازہ کھولے اندر سیٹ پر دراز تھا۔ کئی گھنٹے کے بعد شجاع حیدر کو ہوش آیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ایک جگہ کھڑے کھڑے اس نے اتنا وقت کیسے گزار دیا۔ لیکن نیل کی کہانیاں ایسی ہی کشش انگیز تھیں کہ وہاں تو دن گزارے جا سکتے تھے۔ بہرحال اس کی ٹانگیں تھکن محسوس کرنے لگی تھیں۔ اس لیے وہ ٹیکسی کی طرف واپس لوٹ آیا۔ ٹیکسی میں افضال حسین کے خراٹے گونج رہے تھے۔ وہ مزے سے سو رہا تھا۔ شجاع حیدر نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی تو کافی وقت تھا۔ ویسے ساحل نیل آباد ہوتا جا رہا تھا۔ سیر و تفریح کرنے والے جوڑے چہل قدمی کر رہے تھے۔ شجاع حیدر نے کچھ اور وقت افضال حسین کو دے دیا۔ اور پھر جب شام جھک آئی تو وہ افضال حسین کو جگانے پر مجبور ہو گیا۔

''اوہ۔ معاف کرنا مسٹر شجاع حیدر! نیل کی ہوائیں شراب آلود ہوتی ہیں، انسان ایسا سوتا ہے کہ بس۔ بہرحال کیا سیر مکمل ہو گئی۔''

''ہاں۔ اب چلو!''

''اجازت دیں تو منہ دھو آؤں۔'' افضال حسین نے کہا اور وہ شجاع حیدر کی اجازت سے ایک طرف چلا گیا پھر واپس آ کر اس نے ٹیکسی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ٹیکسی چل پڑی۔ راستے میں شجاع حیدر نے کہا۔

''کل رات اگر تم ٹیکسی نہ چھوڑ جاتے تو مجھے خاصی پریشانی اٹھانی پڑتی۔''

''ہاں بعض اوقات ٹیکسیاں نہیں ملتیں۔'' افضال حسین نے کہا۔

''تمہیں تو تکلیف نہیں ہوئی؟''

''مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ رات کو تو میں ٹیکسی نہیں چلاتا۔''

''گویا آج بھی مجھے ٹیکسی مل سکتی ہے؟'' شجاع حیدر نے کہا۔

''آج...... جب تک آپ یہاں قیام کریں مسٹر شجاع حیدر۔ اگر مجبوری نہ ہوتی اور کوئی ذریعہ اس کے علاوہ حصول معاش کا ہوتا تو مستقل آپ کو دے دیتا۔ دوستی کرنا مجھے بھی آتی ہے لیکن......''

''تمہاری یہی عنایت کیا کم ہے افضال حسین کہ تم نے مجھے یہاں تنہائی نہیں محسوس ہونے دی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

''چھوڑو ان باتوں کو شرمندگی ہوتی ہے۔ آج کیا پروگرام ہے؟''

''تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ ویسے آج رات کا کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے۔'' شجاع حیدر نے کہا۔

''ارے مر جاؤں گا۔ وہ پونے چھ فٹ کی ناگن مجھے ڈس لے گی۔'' افضال حسین نے خوفزدہ انداز میں کہا اور شجاع حیدر ہنسنے لگا۔

''اس کے لیے اور بچوں کے لیے کھانا پارسل کرا کر لے جانا، خوش ہو جائے گی۔'' شجاع حیدر نے کہا اور افضال حسین اس بات پر تیار ہو گیا۔

تقریباً نو بجے انہوں نے ایک عمدہ سے ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر شجاع حیدر نے بہت سی چیزوں کا پارسل تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔ پھر وہ دونوں چل پڑے۔ آج شجاع حیدر نے افضال حسین کو اس کے گھر پر چھوڑا اور پھر دوسرے دن اس سے ملاقات کے لیے کہہ کر چل پڑا۔

اب وہ اپنے کام کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ ایک نائٹ کلب جا کر اس نے پروگرام کا ٹکٹ خریدا اور تھوڑی دیر وہاں گزار کر ٹھیک ساڑھے دس بجے وہاں سے نکل آیا۔ ٹیکسی لے کر سیدھا وہ الامین پہنچا اور ٹیکسی ایک مناسب جگہ چھوڑ کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا نیا خریدا ہوا مخصوص قسم کا چست لباس پہنا اور پھر اوپر سے اوور کوٹ پہن لیا۔ اس کے بعد اس نے تھیلے کے سامان کو چیک کیا اور پھر وزنی تھیلا لے کر نیچے اتر آیا۔ تھیلا اس نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور پھر اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ اب وہ میوزیم جانے والی سڑک پر رواں دواں تھا۔ اس کی چاق و چوبند فطرت پوری طرح حاضر تھی اور وہ ماحول پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ سڑک سنسان رہتی تھی کیونکہ میوزیم شہر سے باہر تھا۔ اس لیے ٹیکسی کو تیز رفتاری سے دوڑانے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی رہی اور

پھر دور سے میوزیم کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

☆☆

میوزیم سے تقریباً ایک فرلانگ دور اس نے ٹیکسی سڑک سے اتار کر درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب کھڑی کردی۔ پھر اس نے تھیلا اتار کر کندھے پر لٹکایا اور میوزیم کے بائیں سمت سڑک سے نیچے نیچے چلتا رہا۔ میوزیم سے تقریباً پندرہ گز دور پہنچ کر وہ رک گیا۔ اور پھر ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ کر تھیلا کھولا۔ تھیلے سے اس نے چند چھوٹے چھوٹے بکس نکالے۔ ان بکسوں میں سوئچ لگے ہوئے تھے۔ اور ان سوئچوں کے نزدیک ننھے ننھے ڈائل لگے ہوئے تھے۔ اس نے سوئچ کے نزدیک ایک گھڑی کی چابی کی طرح ابھری ہوئی چابی کو گھمایا اور ڈائل پر لگی ہوئی سوئیاں گھومنے لگیں۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر ایک بکس کی سوئی کو ایک ہندسے پر لگادیا پھر اس نے دوسرے بکس کی سوئی کو اس ہندسے سے مختلف ہندسے پر لگادیا۔ اسی طرح اس نے پانچ بکسوں کی سوئیوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سیٹ کردیا اور پھر انہیں لے کر چل پڑا۔ ایک بکس اس نے ایک درخت کی جڑ میں رکھ دیا۔ دوسرا دوسرے درخت کی جڑ میں اور تیسرا تیسرے کی جڑ میں، اسی طرح اس نے پانچوں بکس مختلف جگہوں پر رکھ دیے اور پھر تمام بکسوں کے سوئچ آن کردیے۔ اس کے بعد اس نے اوور کوٹ اتار کر لپیٹا اور اسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ اب وہ مٹیالے رنگ کے چُست لباس میں تھا جو اس نے اسی لیے خریدا تھا۔ پھر اس کے قدم تیزی سے میوزیم کی عقبی سمت اُٹھ گئے اور چند منٹ کے بعد وہ میوزیم کی کمپاؤنڈ کے قریب تھا۔

کمپاؤنڈ وال زیادہ بلند نہ تھی وہ اچھل کر اس پر چڑھ گیا اور دوسری طرف کود گیا۔ پھر وہ دبے قدموں عمارت کی ایک دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں رک کر اس نے تھیلے سے ایک رسی نکالی جس کے ایک سرے میں اسٹیل کا مضبوط آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے رسی کو پکڑا اور پھر اسے جھلا کر آنکڑا اوپر پھینک دیا۔ آنکڑا چھت کی منڈیر میں پھنس گیا۔ اس نے زور زور سے کھینچ کر آنکڑے کی مضبوطی کو آزمایا اور پھر اطمینان سے رسی کے ذریعے چھت پر پہنچ گیا۔ رسی اس نے اسی طرح لٹکتی چھوڑ دی اور چھت پر آگے آگے بڑھنے لگا۔ ایک چھت کو عبور کر کے دوسری اور پھر تیسری پر پہنچنے کے بعد بالآخر وہ اس کمرے کی چھت پر پہنچ گیا جو اس کا مطلوبہ کمرہ تھا۔

چھت سے اس نے میوزیم پارک کا جائزہ لیا اور سنتریوں کی نقل وحرکت کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد وہ چھت پر لیٹ گیا۔ اس نے تھیلا کھول کر چھت پر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے اس میں سے ایک مڑی ہوئی کیل نکالی جس کے دونوں سروں پر اسکرو لگے ہوئے تھے۔ اس نے وہ کیل چھت کی منڈیر میں پھنسا کر اسکرو کسنے شروع کردیے اور جب کیل منڈیر میں اچھی طرح پھنس گئی تو تھیلے سے ایک مضبوط رسی نکال لی۔ رسی کے پھندے بنا کر اس کیل میں پھنسائے اور پھر اس کا دوسرا سرا اپنی بغلوں اور گردن میں پھنسا لیا۔ اس طرح اب وہ کیل سے بندھا ہوا تھا اور ایک مخصوص حد تک ڈھیل تھی۔ پھر وہ منڈیر پر جھکنے لگا۔ نیچے اور نیچے بالآخر وہ ایک روشندان تک پہنچ گیا۔ روشندان سے اس نے پہلے دونوں ہاتھ اندر گھسیڑے پھر گردن اور پھر وہ شانے بھی اندر داخل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ روشندان چھوٹا ضرور تھا لیکن جسم کو ایک مخصوص انداز میں سکیڑ کر اس میں تھوڑا بہت داخل ہوا جاسکتا تھا۔ اندر روشنی تھی اور اس روشنی میں کمرے کا پُراسرار ماحول صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے ماحول کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر جسم کو واپس نکال لیا۔ ایک بار پھر وہ اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے تھیلے سے ایک مضبوط رسی نکالی۔ اس رسی کے سرے پر ایک وزنی لوہے کا ٹکڑا بندھا ہوا تھا جس کا نچلا حصہ نوکدار تھا۔ اس وزنی لوہے کو سنبھال کر اس نے رسی کے سرے کو کلائی پر باندھ لیا اور اسی انداز میں روشندان میں داخل ہوگیا۔ اب پوزیشن یہ تھی کہ اس کے دونوں پاؤں اوپر بندھے ہوئے تھے۔ آدھا دھڑ روشندان کے اندر تھا اور وہ الٹا لٹکا ہوا تھا۔ کلائی میں رسی بندھی ہوئی تھی۔ اور لوہے کا نوکدار ٹکڑا دوسرے ہاتھ میں تھا۔

اندر کے ماحول پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور ایک دم سنبھل گیا۔ اس نے لوہے کے ٹکڑے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ شوکیس اس سے زیادہ دور نہیں تھا جس میں ناتراشیدہ ہیروں کا ہار رکھا ہوا تھا۔ سیکنڈ کی سوئی آہستہ

آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر خون اترتا جا رہا تھا اور پھر جونہی سوئی بارہ کے ہندسے پر پہنچی اس نے پوری قوت سے لوہے کا ٹکڑا شوکیس پر دے مارا۔ عین اسی وقت باہر ایک دھماکہ سنائی دیا تھا، اور اس دھماکے کی آواز میں شوکیس ٹوٹنے کی آواز دب گئی تھی۔ شوکیس کی چھت کرچی کرچی ہو گئی تھی۔ حالانکہ نشانہ غلط ہونے کا امکان بھی تھا۔ چھت کے مضبوط ہونے کو بھی اس نے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اس لیے ابھی ایسے کئی اور دھماکے ہونے کو تھے لیکن اس کا کام پہلے ہی وار میں بن گیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی رسی کے سرے کو اوپر کھینچا اور لوہے کا ٹکڑا واپس اس کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ اس بار پھر وہ نیچے کھسکا اور روشندان سے نکل آیا۔ کلائی والی رسی کھول کر اس نے لوہے کا ٹکڑا واپس تھیلے میں رکھ دیا اور پھر ایک عجیب سی شے نکال لی۔ یہ ریڈیو انٹینا کی طرح کی کوئی شے تھے جس کے سرے پر بچھو کے ڈنگ کی طرح مڑی ہوئی دو نوکدار کیلیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک بار پھر وہ اسی روشندان میں گھس گیا۔ اسی وقت دوسرا دھماکہ ہوا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ ہاتھ میں دبی ہوئی راڈ کیلوں کے وزن سے نیچے کی طرف کھسک رہی تھی اور ایک کے اندر سے ایک راڈ نکل رہی تھی۔ یہاں تک کہ راڈ پوری کھل گئی اور اب وہ اس شوکیس تک پہنچ رہی تھی۔ شجاع حیدر اب اپنے دونوں ہاتھ استعمال کرنے لگا۔ اس نے راڈ کو مخصوص انداز میں جھٹکے دیے اور پھر اسے ہار پر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے راڈ کو گھمایا اور دونوں مڑی ہوئی کیلیں ایک دوسرے سے چپک کر اس ہار میں پھنس گئی تھیں۔ اس نے کیلوں کے جکڑنے کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور پھر راڈ کو کھینچنے لگا یہاں تک کہ وہ اس کے ہاتھوں تک پہنچ گیا۔ شجاع حیدر نے جلدی سے ہار کو مٹھی میں دبا لیا...... اور نہ جانے کیوں اسے عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ہیرے عجیب تاثر رکھتے تھے۔

بہر حال یہ وقت کسی کیفیت پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے اپنے جسم کو پیچھے کھسکایا اور پھر روشندان سے نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے ہار جیب میں رکھا اور پھر سب سے پہلے اپنے پاؤں آزاد کرائے۔ باہر چار دھماکے ہو چکے تھے اور ایک ہونا باقی تھا۔ اس نے جلدی جلدی تمام سامان بیگ میں رکھ کر بیگ کو حسبِ معمول کندھے سے باندھا اور پھر جھکا جھکا اس چھت کی طرف دوڑنے لگا جہاں رسی بندھی ہوئی تھی۔ پھر جب رسی سے اترنے کے بعد اس کے قدم نیچے ٹکے تو پانچواں اور آخری دھماکہ ہوا۔ اس نے رسی کو مخصوص انداز میں جھٹکے دیے اور آنکڑا منڈیر سے نکل آیا۔ اس نے اسے بھی لپیٹ کر تھیلے میں رکھا اور پھر کمپاؤنڈ کی دیوار کی طرف دوڑنے لگا۔

پارک کے گیٹ کے سامنے میوزیم کے محافظوں کی پوری ٹیم حیران و پریشان کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور پھر سڑک کے نیچے نیچے اپنی ٹیکسی کی طرف دوڑنے لگا۔

لیکن دفعتاً اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے اپنے قریب ہی کسی اور کے دوڑنے کی آواز سنی تھی۔ دوسرے لمحے وہ ایک درخت کی آڑ میں رک کر آنے والے کا انتظار کرنے لگا، لیکن اس کا متعاقب بہت چالاک تھا۔ وہ بھی رک گیا۔ درختوں کے پیچھے ہلکی سی سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ انتظار کرتا رہا، اور جب کافی دیر گزر گئی تو اس نے پھر اپنے قدم آگے بڑھا دیے لیکن اب وہ بے حد محتاط تھا اور کسی بھی حادثے سے نبٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ٹیکسی تک آتے ہوئے اسے احساس رہا کہ اس کا تعاقب کوئی ضرور کر رہا ہے۔ لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ ٹیکسی کے قریب پہنچ کر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اوور کوٹ وغیرہ پہن کر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی لیکن کوئی خاص بات نہ ہوئی۔

''ممکن ہے وہ وہم ہو!'' اس نے سوچا اور گردن جھٹک دی۔

ٹیکسی برق رفتاری سے شہر کی طرف دوڑ رہی تھی۔ ٹیکسی چلاتے چلاتے وہ ایک بار پھر چونک پڑا۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اس کی جیب پر ہاتھ مارا ہو۔ اسٹیئرنگ پر اس کا ہاتھ بہک گیا اور ٹیکسی سڑک سے اتر گئی۔ اس نے بریک لگائی اور خوفزدہ نظروں سے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا تب اس نے ذہن کو جھٹک دیا اور کئی بار خود پر لعنت بھیجی اور دوبارہ ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

راستے میں ایک جگہ اس سڑک پر کچھ سائے سڑک کراس کرتے نظر آئے اور اس نے رفتار سست کر دی۔ لیکن جب وہ قریب پہنچا تو کوئی نہ تھا۔

اس نے ان تمام باتوں کو وہم قرار دیا اور بالآخر ہوٹل پہنچ گیا۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد سب سے پہلے اس نے وہ تھیلا معہ سامان کے ایک گہرے گٹر میں ڈال دیا اور پھر ٹیکسی کھڑی کر کے اندر داخل ہو گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا اور ایک آرام کرسی پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ کئی منٹ تک اسی طرح پڑا رہنے کے بعد اس نے جیب سے ہار نکال کر میز پر رکھ دیا اور پھر اوور کوٹ وغیرہ اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔ پھر اس تنگ لباس سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اس نے سلیپنگ سوٹ پہنا اور ایک سگریٹ سلگا کر آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ سگریٹ کے گہرے گہرے کشوں نے اسے سکون بخشا اور سگریٹ ختم کرنے کے بعد وہ اُٹھ گیا۔ اس نے اس تنگ لباس کا ایک بنڈل بنایا اور اسے ایک مخصوص جگہ چھپا دیا۔ بنڈل اس نے دوسرے دن ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنایا تھا۔ کیونکہ دوبارہ نیچے جانا مناسب نہیں تھا پھر اس نے میز پر پڑا ہوا ہار اٹھایا اور مسرت آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

☆☆

دوسرے دن گیارہ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ بھی اس وقت جب افضال حسین نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور افضال حسین مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور بولا۔

''آج آپ بھی دیر سے اٹھے شجاع حیدر صاحب! میں بھی بس سوتا رہا۔ گھر والی نے جب ایک گلاس پانی سر پر ڈال دیا تب آنکھ کھلی۔''

''ہاں افضال حسین! رات کا پروگرام بہت شاندار تھا، تمہیں چابی چاہیے ہوگی۔''

''دے دیں۔'' افضال حسین نے کہا اور شجاع حیدر نے چابی دے دی۔ پھر کہنے لگا۔

''ناشتا کر لو افضال حسین!''

''نہیں کر لیا ہے۔ بیوی ان دنوں بہت مہربان ہے خدا حافظ۔'' افضال حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد شجاع حیدر نے دروازہ بند کر دیا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ غسل کرنے کے بعد اس نے ویٹر کو بلا کر ناشتا طلب کیا۔ کوئی بھی بات معمول کے خلاف نہیں تھی۔ ناشتے کا انتظار کرتے ہوئے اس نے اخبار اٹھا لیا اور اسے ایک نمایاں جگہ پر رات کے واقعہ کی سرخی نظر آئی۔ اس نے جلدی سے پوری خبر پڑھ ڈالی۔

''گورنمنٹ میوزیم میں چوری......

چالاک چور نے ٹائم بموں کے دھماکے کر کے میوزیم کے چوکیداروں کو اس طرف متوجہ کیا اور خود پُراسرار طریقے سے میوزیم سے ایک نادر ہار چوری کر کے فرار ہو گیا۔'' اس کے آگے تفصیل تھی۔ لیکن میوزیم کے آدمی ابھی تک ہار نکالنے کی ترکیب نہیں سمجھ پائے تھے۔ کیونکہ دروازے اسی طرح بند تھے اور ان میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔

بہرحال خاصی قیاس آرائیاں کی گئی تھیں۔ جن میں سے ایک بھی شجاع حیدر کے لیے تشویشناک نہیں تھی۔ اس نے مسکرا کر اخبار کا صفحہ الٹ دیا اور دوسری خبریں پڑھنے لگا۔ اتنی دیر میں ویٹر ناشتا لے آیا اور وہ ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

حسب معمول دو بجے افضال حسین آ گیا اور روزانہ کے معمول کے مطابق آج بھی وہ گھومنے لگے۔ ایک پُرفضا مقام پر ٹہلتے ٹہلتے شجاع حیدر نے کہا۔

''میرا خیال ہے افضال حسین اب شہر کی اور کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی اس لیے میں اب یہاں سے جانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''جانے والوں کو کون روک سکتا ہے مسٹر شجاع حیدر! اگر میری درخواست پر آپ چند روز اور رک گئے تب بھی کیا ہوگا بہرحال آپ کو جانا ہے۔'' افضال حسین نے اداس لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ بلاشبہ اس شہر میں تم میرے بہترین دوست ثابت ہوئے۔''

''کب جا رہے ہیں؟'' افضال حسین نے پوچھا۔

''ابھی پروگرام نہیں بنایا۔ چار پانچ دن میں چلا جاؤں گا۔''

''ہوں......'' افضال حسین خاموش ہو گیا۔ شجاع حیدر نے اس کے چہرے پر اُداسی دیکھی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ طویل عرصہ یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے بہر حال واپس جانا تھا۔

حسبِ معمول رات گئے تک افضال حسین اس کے ساتھ رہا پھر اس نے اس سے رات کے پروگرام کے بارے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ آج آرام کروں گا۔'' شجاع حیدر نے جواب دیا۔ اور افضال حسین نے گردن ہلا دی۔ تقریباً گیارہ بجے وہ ''الامین'' واپس آ گئے۔ شجاع حیدر نے حسبِ معمول افضال حسین کو رقم دی اور ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

فرعونوں کے دیس کا تحفہ اس کی جیب میں موجود تھا۔ ظاہر ہے اس ہار کو وہ کمرے میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن اپنے کمرے کے سامنے پہنچتے ہی وہ ٹھٹک گیا، اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ کمرے کے دروازوں کے رخنوں سے روشنی جھلک رہی تھی جو نائٹ بلب کی تھی۔

''اندر کون ہے؟ کیا پولیس...... کیا اس کا راز کھل گیا۔'' ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ خاموشی سے یہیں سے واپس ہو جائے لیکن ایسی بزدلی بھی کس کام کی۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر کی ہول سے اندر جھانکا اور پھر چونک پڑا۔

کوئی اس کی مسہری پر سو رہا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر دھکیلا اور دروازہ کھل گیا۔ دوسرے لمحے وہ اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کا ماحول جوں کا توں تھا۔ کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ اس کی مسہری پر کوئی اور براجمان تھا۔ وہ سونے والے کے نزدیک پہنچ گیا اور ایک بار پھر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

ایک نوجوان لڑکی تھی جو بڑی بے باکی سے اس کے بستر پر سو رہی تھی۔ اس کے خدوخال عجیب پُراسرار سے تھے۔ چہرہ زیادہ دلکش نہیں تھا لیکن جسم خوب صورت تھا۔ اس نے ایک خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔

وہ سر کھجانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ لیکن بہر حال اس لڑکی کے بارے میں معلوم کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے اس کا شانہ پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ کئی بار جھنجوڑنے کے بعد لڑکی آنکھیں ملتی ہوئی جاگ اُٹھی۔

''کیا ہے......؟'' اس نے جھلائے ہوئے انداز میں پوچھا اور شجاع حیدر بوکھلاہٹ میں سر کھجانے لگا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کے ماحول کو دیکھا، ممکن ہے وہی کسی غلط کمرے میں گھس آیا ہو۔ لیکن کمرہ اسی کا تھا۔ اس کا سامان موجود تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ لڑکی اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بھی عجیب تھا۔ ویسے وہ اب بھی اُونگھ رہی تھی۔

''آپ کون ہیں محترمہ......؟'' بالآخر شجاع حیدر نے پوچھا۔

''پہلے آپ بتایئے۔ آپ کون ہیں؟''

''خادم کو شجاع حیدر کہتے ہیں۔''

''یہاں کیوں آئے ہیں؟'' لڑکی غصیلے انداز میں بولی۔

''سونا چاہتا ہوں۔''

''لاوارث ہیں......؟'' لڑکی نے چڑچڑے انداز میں پوچھا۔

''لاوارث ہی سمجھ لیجیے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کمرہ میرا ہے۔'' شجاع حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن...... کیا مطلب۔'' لڑکی چونک پڑی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جلدی سے مسہری سے اتر آئی۔

''تت تو۔ کیا یہ روم نمبر ایک سو آٹھ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ ایک سو سات ہے۔ بہر حال ایک نمبر کا فرق ہے۔ کیا آپ روم نمبر ایک سو آٹھ میں مقیم ہیں؟'' شجاع حیدر نے پوچھا۔ لیکن لڑکی کے چہرے پر سراسیمگی تھی۔ اس نے جلدی سے سلیپر پہنے اور تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ شجاع حیدر کو ہنسی آ گئی تھی۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک کھٹک بھی تھی۔ بظاہر لڑکی غلط نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنا سامان چیک کیا سب کچھ جوں کا توں تھا۔ پھر اس نے دروازہ بند کیا اور لباس تبدیل کرنے لگا۔

............☆☆............

دوسرے دن اس نے ویٹر سے روم نمبر ایک سو آٹھ کے بارے میں پوچھا۔

"جی ہاں صاحب! ایک خاتون کل ہی وہاں مقیم ہوئی ہیں۔" اور ویٹر نے اس لڑکی کا حلیہ دہرایا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر شجاع حیدر باہر نکلا تا کہ لڑکی سے رات کی غلط فہمی کے بارے میں معلوم کرے۔ لیکن اس کے کمرے میں تالا لگا ہوا تھا۔ وہ مایوس ہو گیا، بہر حال اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ لڑکی کو کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے تشویش بھی تھی کہ یہاں ایک کمرے کے تالے کی چابی دوسرے کمرے کے تالے میں بھی لگ سکتی ہے۔ اگر ہار کمرے میں ہی ہوتا تو......؟

لیکن اس نے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہار کو جیب میں رکھ لیا تھا۔ دوپہر کو حسب معمول افضال حسین آ گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آج بھی تھی لیکن پژمردہ سی۔

"کیا بات ہے افضال حسین کیا آج پھر جھگڑا ہو گیا۔" شجاع حیدر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں صاحب! بس آپ کے واپس جانے سے دل اُداس ہے۔" افضال حسین نے کہا۔

"ارے افضال حسین تم جتنے دن کہو گے رک جاؤں گا۔ فکر مند کیوں ہو۔" شجاع حیدر نے کہا اور افضال حسین ہنسنے لگا۔

"اس کے بعد تم جاؤ گے ہی۔"

"ہاں یہ دوسری بات ہے۔" شجاع حیدر نے کہا۔ حسب معمول وہ پھر سیر و تفریح کو نکل گئے۔ شام تک آوارہ گردی کرتے رہے اور رات کو گیارہ بجے ہوٹل پہنچے، افضال حسین کو رخصت کرنے کے بعد جب شجاع حیدر اپنے کمرے کے سامنے پہنچا تو اندر روشنی دیکھ کر ٹھٹک گیا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ گویا آج پھر وہی گڑ بڑ ہوئی ہے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔

لڑکی حسب معمول اس کے بستر پر بے خبر سو رہی تھی، شجاع حیدر ایک لمحے کے لیے کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ دبے پاؤں دروازے سے اندر آیا۔ اس کے برابر کے کمرہ نمبر ایک سو آٹھ پر اپنے تالے کی چابی آزمائی اور وہ کمرہ کھل گیا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اور روشنی کر دی۔ کمرے کا وہی ماحول تھا جو اس کے کمرے کا تھا۔ الماری میں لڑکی کے ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے، لیکن ایسی کوئی چیز نہ مل سکی جو اس کی شخصیت پر روشنی ڈالتی۔ کافی دیر تک لڑکی کے کمرے کی تلاشی لینے کے بعد اس نے لائٹ بند کی اور تالا لگا کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

لڑکی اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے لڑکی کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور لباس تبدیل کر کے صوفے پر لیٹ گیا۔ ہار حسب معمول اس کے سینے کے قریب حفاظت سے بندھا ہوا تھا۔ نوجوان اور الھڑ لڑکی، رومانی ماحول، تنہائی...... اس کے ذہن میں ہلچل ہونے لگی۔ لیکن ایک بُرا آدمی ہونے کے باوجود وہ ایک اچھی طبیعت رکھتا تھا اس نے ان جذبات کو تھپک دیا جو بیدار ہو گئے تھے۔ اور نہ جانے کب وہ خود بھی سو گیا۔ بے آرامی کی نیند تھی، اس لیے صبح خلاف توقع جلد آنکھ کھل گئی۔ جاگنے کے بعد اسے بچویشن کا احساس ہوا اور وہ صوفے پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہ مسہری کی طرف اُٹھ گئی، لڑکی کروٹ بدلے لیٹی تھی۔ اس کا حسین جسم پشت کی طرف سے اس کے سامنے تھا۔

شجاع حیدر مسکرانے لگا اور پھر اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور اسی وقت لڑکی نے اس کی طرف کروٹ بدلی۔ شجاع حیدر پر نگاہ پڑتے ہی وہ بُری طرح چونک پڑی اور پھر بجلی کی رفتار سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شجاع حیدر کی طرف دیکھا اور پھر چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دوسرے لمحے خوفزدہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

"تت...... تو کیا...... آج پھر...... آج پھر......؟" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ شجاع حیدر نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتا رہا۔

"مم...... میں معافی چاہتی ہوں۔" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"اگر آپ پسند کریں تو ناشتا میرے ساتھ کر لیں۔ اس میں معافی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسی دلچسپ غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔" شجاع حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں۔"

"عرض کر چکا ہوں محترمہ، شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہے، آخر ہم پڑوسی ہیں۔" شجاع حیدر نے کہا اور لڑکی پھر بستر پر بیٹھ گئی۔

"نہ جانے ایسا کیوں ہوا...... دراصل جب مجھے نیند

آنے لگتی ہے تو میں دیوانی ہو جاتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے جس جگہ ہوں وہیں پڑ کر سو جاؤں۔'' اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''جوانی کی نیند ایسی ہی ہوتی ہے۔'' شجاع حیدر نے کہا پھر بولا۔

''آپ غسل کر لیں تو پھر میں بھی......''

''اوہ میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے۔ کیا آپ رات کو صوفے پر سوئے تھے؟''

''کیا حرج ہے۔''

''آپ نے مجھے جگا کیوں نہیں دیا؟''

''آپ کی آرام دہ نیند میں خلل انداز ہونا مناسب نہ سمجھا۔'' شجاع حیدر نے کہا۔

''میں ایک بار پھر شرمندہ ہوں۔''

''آپ کی مرضی۔ ورنہ اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہے جائیے۔ غسل کر لیں پھر ناشتا کریں گے۔'' شجاع حیدر نے کہا اور پھر لڑکی غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اندر سے پانی گرنے کی آوازیں آتی رہیں اور شجاع حیدر مسکراتا رہا۔

گو لڑکی کے خدوخال زیادہ دلکش نہیں تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں شجاع حیدر اس میں ایک جاذبیت محسوس کر رہا تھا اور ایسی جاذبیت جو اس نے اس سے پہلے کسی لڑکی میں محسوس نہیں کی تھی۔ لڑکی غسل کر کے باہر آ گئی۔ اس کے جسم پر جدید قسم کا گلابی رنگ کا خوب صورت لباس تھا اور بال ایک خاص انداز سے باندھے گئے تھے۔ شجاع حیدر اسے دیکھ کر مسکراتا ہوا خود بھی باتھ روم میں چلا گیا۔ غسل سے فارغ ہو کر باہر آیا تو لڑکی ایک صوفے پر متفکر بیٹھی تھی، شجاع حیدر نے بیل بجا کر ویٹر کو بلایا اور اس کے آنے پر ناشتے کا آرڈر دے دیا۔

''میرا نام شجاع حیدر ہے!'' اس نے لڑکی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔ میرا...... میرا نام...... میرا نام دائمہ ہے۔'' لڑکی نے اس انداز میں کہا جیسے اس نے کوئی فرضی نام سوچا ہو۔

''خوب۔ آپ کے بارے میں مزید کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں یا نہیں؟''

''براہ کرم نہیں۔ خواہ مخواہ مجھے بہت سے جھوٹ بولنا پڑیں گے، جن کی میں عادی نہیں ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا اور شجاع حیدر مسکراتے ہوئے بولا۔

''مجھے آپ کی صاف گوئی پسند آئی ہے۔''

''شکریہ!''

''یہاں کب تک قیام کریں گی؟''

''صرف پانچ روز کی مہلت ملی ہے۔ جن میں دو دن گزر چکے ہیں اور ابھی میں یہاں کچھ بھی نہیں دیکھ سکی۔''

''اوہ...... کہیں باہر سے آئی ہیں؟''

''ہاں......'' اس نے جواب دیا۔

''تب پھر کیوں نہ میں آپ کی مدد کروں اور پورا شہر گھما دوں۔'' شجاع حیدر نے پیشکش کی اور وہ شجاع حیدر کی شکل دیکھنے لگی پھر بولی۔

''آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی؟''

''قطعی نہیں۔ میں بھی ایک سیاح ہوں۔ اور دو ہفتے سے یہاں مقیم ہوں۔ گو میں شہر کے خوبصورت مقامات دیکھ چکا ہوں۔ لیکن آپ کے ساتھ انہیں دوبارہ دیکھنے میں لطف دوبالا ہو جائے گا۔''

''تب میں شکر گزار ہوں۔ آپ ایک اچھے آدمی ہیں۔'' اس نے کہا اور اسی وقت ویٹر ان دونوں کے لیے ناشتا لے آیا۔ دائمہ نے جس کے نام کے بارے میں شجاع حیدر کو یقین تھا کہ درست نہیں ہے، بے تکلفی سے ناشتا شروع کر دیا اور درحقیقت یہ بے تکلفی شجاع حیدر کو بہت پسند آئی تھی۔ ورنہ لڑکی میں اور کوئی خاص بات نہ تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے ساتھ کھایا اور پھر شجاع حیدر نے کہا کہ وہ لباس تبدیل کر لے۔ اس کا ٹیکسی ڈرائیور آنے ہی والا ہوگا......!!

''پھر جب دو بجے افضال حسین آیا تو دائمہ شجاع حیدر ہی کے کمرے میں تھی۔ شجاع حیدر نے مختصر الفاظ میں ان دونوں کا تعارف کرایا اور افضال حسین گہری نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ معمول کے مطابق جب وہ چائے پی کر نکلے تو ایک بار موقع ملتے ہی افضال حسین نے آہستہ سے کہا۔

''لڑکی بری نہیں۔ بلاشبہ دلکش ہے، لیکن صرف محبوبہ کی حیثیت سے۔ کیا تم اسے بیوی بنانے کا ارادہ

رکھتے ہو؟''

''جلد بازی نہ کرو افضال حسین۔ وہ صرف میری پڑوسن ہے، چند دن کا ساتھ ہے، پھر نہ جانے وہ کہاں ہو گی اور میں کہاں۔''

''اکثر ان پڑوسنوں کے جال زندگی بھر کے لیے پھنسا لیتے ہیں۔ بہرحال خدا کرے پڑوسن ہی رہے۔'' افضال حسین نے کہا۔ اور وہ ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

دائمہ کی باتیں درحقیقت بے حد معصوم اور الہڑ تھیں، وقت کی کمی کے باعث انہوں نے ایک ہی دن میں کئی مقامات کی سیر کی ویسے افضال حسین نے انہیں پورا پورا موقع دیا تھا۔ وہ صرف انہیں تفریح گاہوں تک پہنچا دیتا تھا اور خود باہر ٹیکسی میں بیٹھا رہتا۔ اس دوران شجاع حیدر نے ایک بار بھی محسوس نہ کیا کہ لڑکی کسی اور شکل میں بھی اس سے متاثر ہے۔ وہ صرف معصومانہ باتیں کرتی تھی اور شجاع حیدر کو وہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن خود شجاع حیدر...... وہ سوچنے لگا تھا کہ یہ لڑکی جیون ساتھی کی حیثیت سے بھی بری نہ رہے گی۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتانے کو تیار نہ تھی۔ بہرحال شجاع حیدر نے سوچا تھا کہ ابھی تو کئی دن ہیں۔ وہ اسے بہرحال زبان کھولنے پر آمادہ کر لے گا۔ رات کو واپس آ کر لڑکی نے کھانا اس کے ساتھ کھایا اور پھر وہ اس سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور شجاع حیدر اپنے بستر پر جا کر خوابوں میں کھو گیا۔

..........☆☆..........

وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا، ہار اس کے قبضے میں تھا اور اب یہاں کوئی دلکشی باقی نہ رہ گئی تھی۔ لیکن لڑکی...... وہ اب یہاں سے بیزار نہ تھا۔ دوسرے دن بھی انہوں نے مختلف مقامات کی سیر کی۔ اور پھر تیسرے دن شجاع حیدر نے میوزیم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔

افضال حسین کے آنے پر وہ باہر نکل آئے اور شجاع حیدر نے افضال حسین سے میوزیم چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی چل پڑی اور وہ تینوں راستے بھر گفتگو کرتے رہے۔ شجاع حیدر لڑکی کو میوزیم کی خوبصورتی کے بارے میں بتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ میوزیم پہنچ گئے۔ میوزیم بدستور کھلا ہوا تھا، بس وہاں سنتریوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی تھی۔ حسب معمول افضال حسین باہر ٹیکسی میں رک گیا اور شجاع حیدر لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

''دائمہ......'' راستے میں شجاع حیدر نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں یہ تمہارا اصل نام نہیں ہے۔ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ کیا ہم دونوں اسی طرح اجنبی رہیں گے۔ کیا میں زندگی بھر یہ خلش دل میں لیے رہوں گا کہ تم کون تھیں۔''

''کیا تم میرے بارے میں نہ جاننے سے خلش میں مبتلا رہو گے؟''

''ہاں دائمہ...... میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔''

''تب میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دوں گی۔'' وہ بدستور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے بولی۔

وہ میوزیم کے بہت سے حصوں کی سیر کرتے رہے اور پھر اس کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں سے شجاع حیدر نے ہار چرایا تھا۔ نہ جانے کیوں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شجاع حیدر کا دل دھڑک اُٹھا۔ سینے پر بندھا ہوا ہار اس کے سینے میں چبھنے لگا۔

بہرحال اس نے خود کو سنبھالا اور اندر داخل ہو گیا۔ ٹوٹا ہوا شوکیس درست کر لیا گیا تھا۔ وہ لوگ مختلف چیزوں کو دیکھتے رہے، پھر دائمہ راعاش کے مجسمے کے سامنے رک گئی۔

''اسے دیکھو شجاع حیدر! یہ راعاش کا مجسمہ ہے اور یہ اس کی محبوبہ سبایا ہے۔ افسوس ان دونوں کی شکلیں بگڑ گئی ہیں ورنہ تم انہیں پہچان لیتے۔ سبایا، راعاش کی محبوبہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے اور بھی چاہتے ہیں۔ راعاش دنیا کی دولت سبایا کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا تھا لیکن سبایا کو دولت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ صرف راعاش کو چاہتی تھی اور جب راعاش نے بارہ پتھروں والا ہار اپنے ہاتھ سے بنا کر سبایا کے گلے میں ڈالا تو تم سبایا کی بے پایاں مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ اس ہار کو اپنی زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھتی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ صدیاں گزر گئیں۔ حالات بدل گئے۔ لیکن راعاش اب بھی سبایا کو اسی طرح چاہتا ہے۔ سبایا کی بے پناہ چاہت اب بھی اسی کے لیے ہے۔ تم ان کی محبت کا

اندازہ نہیں کرسکتے۔'' دائمہ کا لہجہ خوابناک تھا اور نہ جانے کیوں شجاع حیدر کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

''تم ان...... ان کے بارے میں اتنی تفصیل کیسے جانتی ہو۔'' شجاع حیدر نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''اور کون جانے گا شجاع حیدر۔ تم بُرے آدمی نہیں ہو، لیکن تم نے ایک محبوب کا تحفہ چرا کر بہت بڑی غلطی کی ہے، میں...... میں سبایا ہوں۔ سمجھے میں سبایا ہوں۔ رعاش کی محبوبہ۔ میں ہار کی تلاش میں تمہارے پاس گئی تھی۔ لاؤ...... ہار مجھے دے دو۔ اگر وہ میرے محبوب کا تحفہ نہ ہوتا تو میں اسے تمہارے پاس رہنے دیتی۔''

''کک...... کیا...... کیا......؟'' شجاع حیدر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹ گئیں۔ لیکن اسی وقت اس کے چاروں طرف گہری سبز روشنی پھیل گئی، پھر سبایا یا دائمہ کی آواز ابھری۔

''ضد نہ کرو شجاع حیدر! تم وہ ہار نہیں رکھ سکتے۔ مجھے علم ہے کہ تم نے اس کے حصول کے لیے سخت محنت کی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ پولیس تم سے وہ ہار نہیں حاصل کرسکتی، تم ایک شاطر چور ہو۔ لیکن میں اپنے محبوب کے تحفے کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ ہار مجھے دے دو...... ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔''

دوسرے لمحے شجاع حیدر نے دروازے کی طرف چھلانگ لگادی لیکن اس وقت خوف سے اس کی سانس رک گئی، جب کمرے میں ایستادہ مجسمے اس کی طرف دوڑے اور ایک قوی ہیکل مجسمے نے اس کو گردن سے دبوچ لیا۔ دوسرے تمام مجسمے اس کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ وہ سب خونخوار نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ پھر ایک مجسمے نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار کی نوک شجاع حیدر کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہم اسے قتل کردیں سبایا؟''

''نہیں...... ہار اس کے لباس سے نکال لو۔ وہ اس کے سینے کے قریب موجود ہے، اور اسے چھوڑ دو۔ یہ بُرا آدمی نہیں ہے۔'' دائمہ نے کہا اور ایک مجسمے نے اس کا گریبان پھاڑ دیا پھر اس سے ہار چھین لیا گیا۔

''شکریہ شجاع حیدر...... میں معافی چاہتی ہوں۔'' دائمہ نے کہا اور ہار مجسمے کے ہاتھ سے لے کر اسی جگہ رکھ دیا جہاں وہ پہلے رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ مجسمے اسے پکڑے ہوئے دروازے سے باہر دھکیل گئے۔ دروازے پر موجود سنتری اسے چونک کر دیکھنے لگا تھا لیکن اب شجاع حیدر کو وہاں رکنے کی ہمت کہاں تھی۔ وہ بے تحاشا باہر کی طرف دوڑا۔ اور پھر اس نے افضال حسین کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''افضال حسین جلدی چلو...... جلدی چلو۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ افضال حسین نے بڑی پھرتی سے ٹیکسی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔

شجاع حیدر پچھلی سیٹ پر پڑا اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ آج ہی یہ پُراسرار ملک چھوڑ دے گا۔

مگر اپنے کمرے میں پہنچتے ہی وہ حیران رہ گیا۔

سبایا پھر سے اُس کے بستر پر دراز تھی۔

اُسے دیکھ کر خوف سے اُس کی گھگی بندھ گئی۔ سبایا اٹھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''گھبراؤ مت۔ صرف تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ دھواں ہوگئی۔

............☆☆............

فراعنہ کے اِس پُراسرار ملک کو چھوڑتے ہوئے شجاع حیدر بہت اداس تھا۔

جہاز نے ٹیک آف کیا۔ اُس نے برابر میں دیکھا۔

''اوہ میرے خدا!'' وہ حیرت سے اچھل ہی تو گیا تھا۔ اُس کے برابر میں سبایا بیٹھی تھی۔ اُسے گھبراہٹ کے مارے پسینے پسینے ہوتے دیکھ کر وہ مسکرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے دھواں ہوگئی۔

شجاع حیدر کو اپنی جیب میں اچانک کچھ وزن محسوس ہوا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سبایا کے نیکلس سے ملتے جلتے کچھ پتھر اُس کے ہاتھ میں آگئے تھے۔

اُسے لگا پھر سے سبایا مسکرائی ہے۔ اب وہ بھی مسکرانے لگا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی تک میوزیم کے اُسی حصے میں موجود ہے جس میں سبایا اور رعاش کی محبت کی داستان کی خوشبو پوری رعنائی کے ساتھ آج بھی زندہ ہے۔

☆☆☆



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمائیے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

شاہانہ خان......کراچی

جنگ کے فیصلے میداں میں کہاں ہوتے ہیں
جب تلک حافظے باقی ہیں، علم باقی ہیں
اب تک نہ وہ چھت ہے، نہ وہ زینہ، نہ انگور کی بیل
صرف اک اُس کو بھلانے کی قسم باقی ہے

شاہدہ انور......میر پور خاص

سنا ہے اپنے گاؤں میں رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم

صفیہ رضوان......اسلام آباد

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے، اناج بھی ہو
اگر ہو نہ کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو
حکومتوں کو بدلنا تو کچھ محال نہیں
حکومتیں جو بدلتا ہے، وہ سماج بھی ہو

نصرت زمان......سکھر

میلے ہو جاتے ہیں رشتے بھی لباسوں کی طرح
دوستی ہر دن کی محنت ہے چلو، یوں ہی سہی
جیسی ہونے چاہیے تھی، ویسی تو دنیا نہیں
دنیا داری بھی ضرورت ہے، چلو یوں ہی سہی

نرمین......جہلم

محبت ایک سزائے موت ہے جو سب کو ملتی ہے
اور اس کی آخری خواہش، کبھی پوری نہیں ہوتی

فرح عالم......اسلام آباد

جتنی بری کہی جاتی ہے، اتنی بری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا

روبینہ شاہین......کراچی

گھی، مصری بھی بھیج کبھی اخباروں میں
کئی دنوں سے چائے ہے کڑوی یا اللہ!
تُو ہی پھول، ستارہ، ساون، ہریالی
اور کبھی تُو ناگا ساکی یا اللہ!

ثمینہ راجپوت......حویلیاں

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے
کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

نگہت غفار......کراچی

گرجا میں، مندروں میں، اذانوں میں بٹ گیا
ہوتے ہی صبح آدمی خانوں میں بٹ گیا

رضوانہ کوثر......لاہور

وقت بنجارہ صفت لمحہ بہ لمحہ اپنا
کس کو معلوم، یہاں کون ہے کتنا اپنا
جو بھی چاہے وہ بنا لے اسے اپنے جیسا
کسی آئینے کا ہوتا نہیں چہرہ اپنا

محمد فائق......چکوال

کوشش بھی کر، امید بھی رکھ، راستہ بھی چن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

شازیہ ظہیر......ساہیوال

کبھی کبھی کا یہ مل بیٹھنا غنیمت ہے
نئی لغت کے مطابق یہی محبت ہے

آسیہ...... پسرور
جو ہو اک بار، وہ ہر بار ہو، ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے پیار ہو، ایسا نہیں ہوتا
سکھا دیتی ہیں چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو، ایسا نہیں ہوتا

وصف اللہ...... کوئٹہ
جو ملنا چاہو تو مجھ سے ملو کہیں باہر
وہ کوئی اور ہے جو میرے گھر میں رہتا ہے

جنید آزاد...... لہڑی، بلوچستان
جانے کیا ان کی نگاہوں نے کہا ہے ہم سے
آج کل شہر میں ہر کوئی خفا ہے ہم سے
کاش وہ ایک نہیں ہوتے ، بہت سے ہوتے
جن کو وہ مل نہ سکے، اُن کو گلہ ہے ہم سے

عمادرشید...... کراچی
بات بہت معمولی سی تھی، الجھ گئی تکراروں میں
ایک ذرا سی ضد نے آخر دونوں کو برباد کر دیا

فہد نسیم...... کویت سٹی
ممکن ہے لکھنے والے کو بھی یہ خبر نہ ہو
قصے میں جو نہیں ہے، وہی بات خاص ہے

ناظمہ ارشد...... انڈیا
جیسی جسے دیکھے یہ دنیا، ویسی اسے دکھانے دو
اپنی اپنی نظر ہے سب کی، کیا سچ ہے، یہ جانے دو

حنا لطیف...... کراچی
سبز رتوں کی جھلمل میں جب شاخیں پھول اٹھاتی ہیں
بہکے بہکے سے رہتے ہیں بادل، چاند ہوا اور میں

واصف نبی خان...... کراچی
قربان کر کے اپنی تمنا کی بازگشت
زندہ رکھا ہوا ہے خیالوں میں ایک خواب
کھنچی گئی ہے میری ہتھیلی پہ اک لکیر
لکھا گیا ہے میرے نصیبوں میں ایک خواب

شمیم سلطانہ...... کراچی
رات پڑے تو ساری شکلیں آنکھ میں چھپنے لگتی ہیں
ڈھلتے ڈھلتے دن بھی آخر ہو جاتا ہے رات میں گم

ممتاز اقبال...... لاہور
اتر جائیں گے سینے میں زمیں کے
سکندر جیسی چاہے شان رکھ لیں

عاصم خان نیازی...... میانوالی
سیکھ لے آگ سے تُو آگ بجھانے کا ہنر
کام آئے گا زمانے میں زمانے کا ہنر
عشق کی بات سرِ بزم بتا دی کیسے؟
تم کو آتا ہے بہت اپنا بنانے کا ہنر

صفیہ سلطانہ...... جیکب آباد
میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مرجھا کے آ گرا ہوں مگر سرد گھاس میں
رہتا تھا سامنے ترا چہرا کھلا ہوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں

افضال حسین بابر...... لانڈھی، کراچی
سب کچھ تو میرے پاس ہے اے دردِ دل مگر
اس زندگی میں کچھ نہیں تجھ کو نکال کر

☆☆☆

کوپن برائے
تیرنیم کش
مارچ 2015ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا: